ضروری درخواست

یہ کتاب آپ کو تحفہ کے طور پر پیش کی گئی ہے لیکن آپ چاہیں تو اس کا ہدیہ (1000 روپے) دے کر ڈونر بھی بن سکتے ہیں۔

"Akhuwat Book" کے نام سے کراس چیک مندرجہ ذیل ایڈریس پر ارسال کریں:

ہاؤس نمبر 382، بلاک 15، سیکٹر بی۔ون، ٹاؤن شپ لاہور

ویب سائیٹ:

www.akhuwat.org.pk

ای میل:

amjadsaqib1@gmail.com

اخوت کا سفر

قرضِ حسن کے سب سے بڑے پروگرام کی کہانی

فرخ امجد کے نام

اخوت کا سفر

ڈاکٹر محمد امجد ثاقب

قرضِ حسن کے سب سے بڑے پروگرام کی کہانی

نام	:	اخوت کا سفر
ناشر	:	جبران علی
کتابت	:	وسیم اصغر
تزئین	:	ایاز علی
تصویر سرورق	:	ایاز علی
سنِ اشاعت	:	2013
پرنٹر	:	محمود کمبوہ پرنٹر
قیمت	:	700روپے
بیرونِ ملک	:	20ڈالر
ایڈیشن	:	پہلا:(2013)ایک ہزار' دوسرا:(2013)ایک ہزار' تیسرا:(2013) تین ہزار
ملنے کا پتہ	:	مکان نمبر382، بلاک نمبر15، سیکٹر بی ون، ٹاؤن شپ، لاہور
		فون:042-35122743ای میل:info@akhuwat.org.pk

Sole Distributors for Pakistan

MAVRA BOOKS

60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Lahore

Ph: 92 42 36303390 - 92 42 36304063

Mob: 0300-4020955

فہرست

پہلا قدم

یہ کتاب اخوت کے سفر کی کہانی ہے۔

''اخوت'' کا آغاز بہت پہلے ہوا لیکن اس کتاب کا آغاز ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک سفر سے ہوتا ہے۔ امریکہ کا یہ سفر نامہ اصل میں اخوت کا ہی سفر ہے۔ بارہ برس پہ محیط۔ اخوت کا آغاز' اس کا فلسفہ' اصول' طریقہ کار' اسکی خوبیاں' خامیاں' امکانات کے نئے افق۔ گویا یہ سفر در سفر ہے۔ ایک وہ سفر جو چلتے پھرتے ہوا اور ایک وہ سفر جو خیالوں میں ہوا۔ یوں بھی سفر نامہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کی اب تک کوئی حدود متعین نہیں ہو سکیں۔ سفر کے دوران آپ جو دیکھیں' سنیں' سوچیں اس کا بیان ہی سفر نامہ ہے۔ ضروری تو نہیں کہ جو شے سامنے ہے صرف اسے ہی بیان کرنا ہے۔ جو پس پردہ ہے اس کے ذکر سے کون روکتا ہے۔ اگر واقعات کو ایک ترتیب سے ہی پیش کرنا ہے تو پھر سفر نامہ کی بجائے ناول یا افسانہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی ہر کتاب کے لیے لازم نہیں کہ اسے ناول یا افسانہ ہی کہا جائے۔ کتاب محض ایک کتاب بھی تو ہو سکتی ہے جسے آپ اپنی پسند کا کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔

اخوت کے دلگداز سفر پر مبنی یہ بھی ایک کتاب ہے............ منتشر' متنوع۔ جا بجا خود کلامی۔ جا بجا خوش گمانی۔ اس کتاب میں غربت اور افلاس کا ذکر بھی ہے اور اس سے نجات کی امید بھی۔ تاریخ' فلسفہ' مذہب' جذبے' امیدیں' خواب اور پھر ان کی تعبیر۔ یہ کتاب صرف اخوت کی کہانی نہیں۔ اس میں کچھ اور لوگوں کا تذکرہ بھی ہے۔ وہ لوگ جو اخوت کی طرح کے خواب دیکھتے ہیں۔ زندگی میں تبدیلی کے خواب۔ انسانیت کی بھلائی کے خواب اور پھر اپنی محنت سے ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ کسی اور کا سچ بھی تو سچ ہو سکتا ہے۔ کیا انسان دنیا میں آزاد پیدا نہیں ہوا۔ کیا اسے تدبر کا پیغام نہیں دیا گیا۔ کیا اسے آزادی نہیں کہ اپنے لیئے جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔ پوری دنیا خدا کا کنبہ ہے۔ ایثار' قربانی اور اخوت اجتماعی خوبیاں ہیں۔ جس نے بھی انسان کے آنسو پونچھے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اس کو دل میں جگہ دی جائے یا سر کا تاج بنایا جائے۔ یہی افراد' تاریخ کا حسن اور کاروانِ حیات کا حاصل ہیں۔

یہ کتاب اِن افراد کی تلاش کا نام بھی ہے۔ایک بڑا خواب کیونکر القا ہوتا ہے اور پھر اس کی تعبیر کیسے ملتی ہے۔نالۂ نیم شب‘ آہِ سحر گاہی۔ ہر شخص کا ایک خواب ہونا چاہیے۔سرسید کا ایک خواب تھا۔اقبال کا ایک خواب تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ کا بھی ایک خواب تھا۔ہم خواب نہیں دیکھتے اسی لیے ہمیں تعبیر نہیں ملتی۔خوابوں کا یہ سفر مشکل نہیں‘ ہاں پہلا قدم مشکل ہوتا ہے:

میں حیرت وحسرت کا مارا حیران کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے‘ آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

اخوت اور اخوت کا سفر‘ کچھ بھی نہیں بس پہلا قدم ہیں۔

محمد امجد ثاقب

''بابا'' امجد ثاقب

جب گذشتہ دنوں ڈاکٹر امجد ثاقب نے اپنے امریکہ کے سفرنامے کا مسودہ ''اخوت کا سفر'' مجھے ارسال کیا اور کہا کہ اس پر چند لائنیں لکھ دیں تا کہ کتاب میں شامل کی جا سکیں تو بہت سے خوف میرے اردگرد دھمالیں ڈالنے لگے۔ پہلا خوف یہ تھا کہ لو جی! اب ایک اور کتاب کا مسودہ ڈھیروں کتابوں کے مسودے تلے اللہ جانے کب تک دبا رہے گا اور برادرم امجد ثاقب کا دل میری طرف سے میلا ہو جائے گا۔ دوسرا خوف یہ کہ امجد ثاقب نہایت شریف النفس انسان ہیں، انہوں نے تو کبھی کسی مقامی حسینہ کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور اگر دیکھا بھی ہے تو کبھی ذکر نہیں کیا تو ایسے شخص نے سفر نامہ کیا لکھنا ہے جو دوران سفر ہزار بارہ سو معاشقوں کے ذکر کے بغیر ان دنوں مکمل ہی نہیں سمجھا جاتا...... تیسرا اور اصلی خوف یہ تھا کہ بلاشبہ امجد ثاقب مائیکروفنانس کے حوالے سے ایک بہت بڑا نام ہیں، بلکہ دنیا بھر میں بلاسود قرض متعارف کرانے والے وہ واحد شخص ہیں لیکن سفر نامہ لکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے میں فزکس پر کوئی کتاب لکھنے بیٹھ جاؤں۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے دل میں جو تین خوف تھے ان میں سے صرف دو صحیح نکلے۔ ایک یہ کہ میں نے لکھنے میں واقعی بہت دیر لگا دی تاہم میرا یہ اندیشہ جزوی طور پر صحیح نکلا کیونکہ اس دیری کی وجہ سے امجد ثاقب کے دل میں میرے لیے کوئی ملال پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ یہی کہتے رہے کہ جب چاہے لکھیں لیکن کتاب پڑھ کر لکھیں حالانکہ انہیں علم نہیں تھا کہ میں بغیر کتاب پڑھے زیادہ اچھا لکھتا ہوں اور جلد ہی لکھ لیتا ہوں۔ میرا دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ حسینوں کے ذکر کے بغیر کیسے لکھا جا سکتا ہے اور میرا یہ اندیشہ درست نکلا، کیسے درست نکلا، اس کا تذکرہ آگے چل کر ہو گا، البتہ میرا تیسرا خوف تو بالکل ہی بے بنیاد ثابت ہوا اور وہ خوف یہ تھا کہ مائیکروفنانس میں نام کمانے والے شخص کی شہرت اور مقام اپنی جگہ لیکن کتاب لکھنا ایک الگ شعبہ ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ شخص جس کا نام امجد ثاقب ہے، اس شعبے کا بھی چھپا رستم نکلے گا اور میرے سمیت بہت سوں کو حیران کر دے گا۔

تو صورتحال یہ ہے کہ ڈاکٹر امجد ثاقب امریکی یونیورسٹیوں میں مائیکروفنانس کے حوالے سے لیکچر دینے کیلئے

مدعو کئے گئے تھے۔سوانہوں نے رخت سفر باندھااورامریکہ پہنچ گئے۔امریکہ پہنچے تو انہیں اِدھراُدھر سے ممتاز پاکستانیوں کے پیغامات موصول ہونا شروع ہو گئے کہ ہماری طرف بھی تشریف لائیے۔ چنانچہ وہ مختلف شہروں میں تشریف لے گئے اور اپنی تنظیم ''اخوت'' کے اغراض و مقاصد کا مقام ہزاروں دلوں میں بناتے چلے گئے۔ یہ تو تھا ان کے سفر نامے کا ایک حصہ جو ایک روٹین کا سفر نامہ تھا مگر اصل ''سفر نامہ'' اس سفر نامے کے اندر تھا جو خیال در خیال پھیلتا چلا گیا۔ یہ ایک حد درجہ حساس اور ملک وقوم سے عشق کی حد تک محبت رکھنے والے شخص کا سفر نامہ تھا جو قدم قدم پر اپنے ملک کے کسی ایک پرابلم کے حوالے سے سوچتا اور اس کی مختلف شکلیں بیان کرتا اور اس کے حل کے لئے راستہ تلاش کرتا نظر آتا۔ وہ مسلسل سفر میں تھا اور اس کے خیالات بھی اس کے ہم سفر تھے۔ کہیں کہیں زمینی سفر پیچھے رہ جاتا اور خیالات کا سفر آگے نکلتا محسوس ہوتا اور یہ امجد ثاقب کے بیان کا کمال ہے کہ وہ قاری کو اس کے باوجود بور نہیں ہونے دیتا، حالانکہ ایک چرچ میں یہ نوٹس آویزاں تھا کہ ''پادری کے وعظ کے دوران خراٹے لینا از روئے شریعت سخت گناہ ہے'' مگر ہمارا ''پادری'' بات کرنے کا ہنر جانتا ہے چنانچہ اس کا قاری ایک بچے کی طرح اس کی انگلی پکڑے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ امریکہ کے مختلف مقامات کی سیر بھی کرتا ہے اور اس کے خیالات بھی اتنی دلچسپی اور انہماک سے سنتا ہے جیسے وہ بچپن میں نانی اماں سے کہانیاں سنا کرتا تھا، سو وہ جو میں نے کہا تھا کہ حسینوں کے تذکرے کے بغیر سفر نامہ کیسے لکھا جا سکتا ہے تو امجد ثاقب نے یہ ''معجزہ'' کر دکھایا، تاہم میں چونکہ بنیادی طور پر ایک بدگمان شخص ہوں لہٰذا میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ امریکہ میں حسینوں سے ان کا ٹاکرہ ضرور ہوا تاہم وہ ان کا ذکر گول کر گئے، بس ان سے انسپریشن حاصل کرتے رہے، میری اس بدگمانی کی مضبوط ترین دلیل یہ ہے کہ اتنا خوبصورت اور جامع سفر نامہ اس نوع کی انسپریشن کے بغیر لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

اب رہ گیا مائیکرو فنانس میں نیک نام کمانے والے شخص کا کتاب لکھنا تو خبروی طور پر یہ کوئی بڑی بات نہیں، آپ براہِ کرم میرے اس بیان کو میرے پچھلے بیان سے متضاد قرار دینے سے پہلے تیسری بات سن لیں تو بات یہ ہے کہ میں نے کاشتکاروں، صنعتکاروں، سفارتکاروں اور کئی بے کاروں کی کتابیں بھی پڑھی ہیں لیکن ان کے مطالعہ کے دوران یہ احساس مسلسل دامن گیر رہتا ہے کہ ان بھائی صاحب نے آخر یہ پنگا کیوں لیا؟ اپنے شعبے میں انہوں نے جو عزت کمائی تھی ''دخل در معقولات'' کی وجہ سے یہ عزت بیٹھے بٹھائے گنوا بیٹھے لیکن

امجد ثاقب کی نثر پڑھتے ہوئے مجھے کئی مقامات پر یہ احساس ہوا کہ میں شاید کوئی خوبصورت انشائیہ پڑھ رہا ہوں، سادہ سلیس۔ پرمغز اور دل میں اتر جانے والی تحریر! ہم میں سے کتنے ہیں جو بظاہر ادب سے متعلق نہ ہوں لیکن اتنی خوبصورت تخلیقی نثر لکھنے پر قادر ہوں۔ یہ اللہ کی دین ہے اور اللہ کی دین بلاوجہ نہیں ہوتی، اس کے پیچھے ان لاکھوں غریبوں کی ''سفارش'' موجود ہے جن کے گھروں میں چولہا جلنے کا وسیلہ امجد ثاقب کی تنظیم بنی ہے!

اور اب آخر میں چند الفاظ ''اخوت'' کے بارے میں۔ اس کی تفصیل تو آپ ان کی کتاب میں پڑھ لیں گے۔ مختصر یہ کہ امجد ثاقب نے صرف دس ہزار روپے سے اس تنظیم کی بنیاد رکھی تھی، مقصد یہ تھا کہ بے روزگاروں یا کم وسیلہ لوگوں میں کلو دو کلو مچھلی تقسیم کرنے کی بجائے انہیں مچھلی پکڑنے کا سامان مہیا کیا جائے تا کہ ان کی انا مجروح کئے بغیر انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ سو اس تنظیم نے انہیں چھوٹے موٹے کاروبار کیلئے قرضِ حسن دینا شروع کیا اور اب تک یہ تنظیم پانچ ارب روپے مستحق افراد میں تقسیم کر چکی ہے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف کبھی کسی نااہل شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ ہی دیں تو وہ بیٹھ جاتا ہے بلکہ بیٹھ ہی جاتا ہے اور جب وہ کسی اہل شخص کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہیں تو وہ اس سے قوت حاصل کر کے پہلے سے زیادہ تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ امجد ثاقب کی اہلیت اور دیانت کے میاں صاحب بہت قائل ہیں چنانچہ اب وہ بھی اسی تنظیم کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ جن غریب لوگوں کو بلاسود قرض دیئے گئے، ان کی واپسی کی شرح نہ صرف یہ کہ 99 اعشاریہ 88 فیصد ہے بلکہ جب یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو تنظیم کے ڈونر بھی بن جاتے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ ہم پاکستانی عظیم قوم نہیں ہیں؟ بنگلہ دیش میں یہ تجربہ کیا گیا لیکن وہاں سود کی شرح تقریباً 40 فیصد اور اخوت میں سود کی شرح زیرو ہے۔ بنگلہ دیش کے جینئس کو نوبل پرائز مل گیا اور امجد ثاقب کو صرف میری اور آپ کی دعائیں۔ اللہ جانے ان دونوں میں سے کون زیادہ فائدے میں رہا؟ اگر آج کل کے ''بابے'' مجھے معاف فرمائیں تو یہ ''بابا'' امجد ثاقب ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے۔ لوگ انہیں دعائیں دیتے ہیں اور مجھے جب دعاؤں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے میں ان کے پاس جاتا ہوں ان کے سامنے دوزانو بیٹھ جاتا ہوں اور کہتا ہوں ''بابا جی! میرے لیے دعا کریں''۔

عطاالحق قاسمی

یہ معاشرہ ابھی مرا نہیں

''ہارورڈ یونیورسٹی شاید دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے' یہ یونیورسٹی 1636 میں بنی اور اسے پروان چڑھانے میں پادریوں نے مرکزی کردار ادا کیا' دنیا کی 50 نوبل انعام یافتہ شخصیات ہارورڈ یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ ہیں' اس یونیورسٹی کا بجٹ دنیا کے 22 ممالک کے بجٹ کے برابر ہوتا ہے اور یہ یونیورسٹی اکیلی پاکستان کا پورا قرضہ ادا کر سکتی ہے' ہم پوری قوم مل کر ہر سال برآمدات کے ذریعے جتنے ڈالر کماتے ہیں' یہ یونیورسٹی اتنا سرمایہ صرف اپنی ریسرچ اور اپنی ایجادات کے حقوق سے حاصل کرتی ہے' اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا ایک اعزاز ہے' اس یونیورسٹی میں کسی ملک کی شخصیت یا کسی ادارے کے بارے میں ریسرچ ہو یا پھر یہ یونیورسٹی آپ کو لیکچر کیلئے بلوائے یہ بھی اعزاز کی بات ہوتی ہے۔

اس یونیورسٹی نے ڈاکٹر امجد ثاقب کو خصوصی خطاب کیلئے ہارورڈ بلوایا ہے' ڈاکٹر امجد ثاقب نے آج سے دس سال قبل اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ''اخوت'' کے نام سے ایک فلاحی ادارے کی بنیاد رکھی تھی' یہ ادارہ نادار اور غریب لوگوں کو کاروبار کیلئے قرض حسن دیتا ہے' یہ قرض بلاسود ہوتا ہے اور قرض دار کو یہ رقم دس سے بارہ اقساط میں واپس کرنا ہوتی ہے' اخوت ایک بابرکت ادارہ ثابت ہوا' یہ اب تک لاکھوں خاندانوں کو اربوں روپے قرض دے چکا ہے اور یہ خاندان اپنے قدموں پر کھڑے ہیں' اخوت ایک طلسماتی تنظیم ہے' ملک میں تنظیم کے ایک سو پچاس سے زائد دفاتر ہیں' ایک ہزار کے قریب ملازم ہیں' تنظیم کے دفاتر مساجد میں قائم ہیں' تنظیم کسی قسم کی ضمانت کے بغیر قرضے دیتی ہے' قرض دار اس رقم سے کاروبار کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈالتا ہے اور یہ شخص نہ صرف قرضہ واپس کر دیتا ہے بلکہ یہ اپنے قدموں پر بھی کھڑا ہو جاتا ہے' دنیا پاکستانی قوم کو بے ایمان اور نالائق سمجھتی ہے لیکن پاکستانی قوم کے بارے میں اخوت کا تجربہ بالکل مختلف ہے' اخوت کے قرضوں کی واپسی کی شرح 99.85 فیصد ہے اور یہ شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے' اخوت بلاسود قرضوں کی دنیا کی سب سے بڑی آرگنائزیشن بھی ہے' اس نے پوری دنیا کی مائیکروفنانسنگ کو ہلا کر رکھ دیا' اس سے قبل گرامین بنک نے دنیا کو حیران کیا لیکن گرامین بینک چالیس فیصد تک سود وصول کرتا ہے جبکہ اخوت بلاسود

قرضے دیتی ہے، جس میں قرضے کے حصول کیلئے ضمانت کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس کا ریٹرن تقریباً سو فیصد ہے اور یہ اس کے باوجود ترقی کر رہی ہے اخوت کی اس گروتھ نے دنیا کو حیران کر دیا چنانچہ ہارورڈ یونیورسٹی نے ڈاکٹر امجد ثاقب کو خطاب کی دعوت دے دی، ڈاکٹر امجد ثاقب آج 23 مارچ کو ہارورڈ یونیورسٹی کے سکالرز کو بتائیں گے اخوت عام آدمی کی زندگی میں کیا کیا انقلاب لائی، پاکستانی معاشرے نے بلاسود قرضوں کو کس طرح امانت سمجھا، دنیا کی پہلی اور اتنی بڑی آرگنائزیشن کیسے چل رہی ہے، یہ آرگنائزیشن کیسے پھل پھول رہی ہے اور اس آرگنائزیشن نے صرف دس برسوں میں اتنا فاصلہ کیسے طے کر لیا وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر امجد ثاقب ہارورڈ یونیورسٹی کے سکالرز کو کیا جواب دیتے ہیں، یہ ڈاکٹر امجد جانتے ہیں یا ہارورڈ یونیورسٹی لیکن جہاں تک اخوت کی بات ہے، اخوت بہرحال پاکستان اور پاکستانیوں کیلئے اعزاز ہے، پاکستان تاریخ کے بدترین فیز سے گزر رہا ہے، دنیا ہم پر اعتبار کرنے کیلئے تیار نہیں، پاکستان کی کرپشن کی کہانیاں بھی پوری دنیا میں ہماری بدنامی کا باعث بن رہی ہیں لیکن ان تمام بری خبروں اور برے حالات میں اخوت جیسی اچھی خبریں بھی ہیں، ملک میں ایسے ایسے مخیرّ حضرات موجود ہیں کہ ان کی کہانیاں سن کر حیرت ہوتی ہے۔ اس نوعیت کی کہانیاں پورے ملک میں بکھری ہوئی ہیں یہ کہانیاں اور ان کہانیوں سے متعلقہ شخصیات اصل پاکستان ہیں، ہمارا اصل پاکستان وہ نہیں جو ہم روزانہ ٹیلی ویژن چینلز پر دیکھتے ہیں۔ ہمارا اصل پاکستان یہ شخصیات اور اخوت جیسے ادارے ہیں اور ہم ان اداروں پر جتنا فخر کریں کم ہوگا۔

میں ڈاکٹر امجد ثاقب اور اخوت دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان لاکھوں خاندانوں کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں جنہوں نے قرض حسن واپس کر کے ثابت کر دیا کہ پاکستان میں ایمانداری مری نہیں، یہ معاشرہ ابھی پوری طرح بنجر نہیں ہوا اور مجھے یقین ہے ڈاکٹر امجد ثاقب جیسے لوگ جب تک زندہ ہیں اس وقت تک یہ معاشرہ نہیں مرے گا، ہماری امید اس وقت تک قائم رہے گی۔"

جاوید چوہدری

1

مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہٰ الا اللہ

لاہور۔بوسٹن۔ہارورڈ۔واشنگٹن

باب اول

1.1۔ عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

''اخوت آنے والے زمانے کا خواب ہے''۔

ایک نئی رسم' ایک نئی وضع۔ خاک ہو جانے کی آرزو' مر مٹنے کا سودا۔ ضد' دیوانگی' جنون یا پاگل پن۔ اس روز میں دیر تک یہ سوچتا رہا۔ اس روز مجھے ایک اور سفر پہ جانا تھا۔

سفر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' سفر سے قبل کی کشمکش سفر سے زیادہ طویل ہوتی ہے۔ میں اس احساس سے کئی بار گذر چکا ہوں۔ چند گھنٹوں کا سفر کبھی کبھی زمانوں کے سفر سے طویل ہوتا ہے۔ امریکہ جانا کوئی نئی بات نہیں۔ ہزاروں لوگ' ہر روز جاتے ہیں۔ مجھے خود کئی بار امریکہ جانے کا موقع ملا۔ لیکن اس بار یہ سفر بہت منفرد تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے لاء سکول میں خطاب' ہارورڈ بزنس سکول میں ایک کانفرنس میں شمولیت اور ہارورڈ کینیڈی سکول میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت۔ اول اول یہ سفر بہت مشکل نظر آیا لیکن شوق کے روبرو کوئی شے مشکل نہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی' لاء سکول کی جانب سے یہ دعوت کئی ماہ قبل مل چکی تھی۔ ڈاکٹر ناظم علی دس سال سے ہارورڈ یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ خوش وضع' خوش مزاج۔ حیدرآباد دکن کی تہذیب کے پروردہ۔ ہارورڈ کے لاء سکول میں ہر دو سال بعد ایک تقریب منعقد کرتے ہیں۔ اس بار اس تقریب کا نام تھا: "Tenth Harvard University Forum on Islamic Finance and Development"۔ تقریب کے اختتامی اجلاس میں مجھے بھی خطاب کی دعوت دی گئی۔ شاید انہیں کہیں سے پتہ چل گیا کہ کچھ لوگ اخوت کے نام سے الٹی گنگا بہا رہے ہیں' یا پھر یہ کہ ''عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے''۔ میری گفتگو کا موضوع تھا "Faith Based Investment and Social Responsibilty"۔ آج کل یہ بے حد دلچسپ موضوع ہے۔ امریکہ میں ہونے والے فنانشل کرائسس نے اس موضوع کو اور بھی اہم بنا دیا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی اور مجھے اسی حوالے سے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنا تھا۔ اس سفر کا دوسرا سنگِ میل ہارورڈ یونیورسٹی کے بزنس سکول میں مائیکروفنانس کی ایک پانچ روزہ کانفرنس میں شمولیت تھی۔

اس کانفرنس میں دنیا بھر کے مائیکروفنانس اداروں کے افراد مدعو تھے۔انہیں مائیکروفنانس کے مسائل اور نئے امکانات پہ گفتگو کیلئے بلایا گیا تھا۔ ہر سال منعقد ہونے والی اس تقریب میں بہترین اداروں کے افراد شریک ہوتے ہیں۔ باہمی گفت وشنید اور بحث ومباحثہ۔کئی سوالوں کے جواب ملتے ہیں اور کئی نئے سوال جنم لیتے ہیں کہ تحقیق اور جستجو ہی زندگی کا خاصہ ہے۔تیسری سرگرمی کینیڈی سکول میں ہونے والی انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ کانفرنس میں بطور سپیکر شرکت کرنا تھی۔ دنیا کی اس مشہور درس گاہ کے تین ہی سکول اہم ہیں۔ ہارورڈ لاء سکول' ہارورڈ بزنس سکول اور ہارورڈ کینیڈی سکول۔ان تینوں سکولوں کی طرف سے ملنے والی دعوتوں نے اس سفر کو بہت یادگار بنا دیا۔ہارورڈ لاء فورم (23 تا25 مارچ) اور دوسری دونوں سرگرمیوں (9 تا14 اپریل) کے درمیان دو ہفتوں کا وقفہ حائل تھا۔سوال پیدا ہوا کہ اس' وقفہ میں کیا کیا جائے۔ واپس وطن آ کر دوبارہ لوٹنا تو دانشمندی نہ تھا۔ فیصلہ ہوا کہ ان پندرہ ایام کو اخوت کی رابطہ مہم کے طور پر استعمال کیا جائے۔اس مہم کا عنوان Reaching One Thousand Americans رکھا گیا اور طے پایا کہ اس مہم کے دوران واشنگٹن ڈی سی' لاس اینجلس' شکاگو' ڈیلس' نارتھ کیرولینا' ورجینیا' میری لینڈ اور نیویارک میں رہنے والے پاکستانیوں سے مل کر ان کے دل پہ دستک دی جائے کہ یہ آفاقی پیغام ان تک بھی پہنچنا چاہئے۔ بقول حفیظ جالندھری:

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
صرف میرا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

لاء سکول' بزنس سکول' کینیڈی سکول اور ان کے درمیانی وقفہ میں اہلِ وطن سے ملاقات اور اخوت کے اس خواب کا پرچار...... یہ تھی اس سارے سفر کی غرض وغایت۔سفر نامہ لکھنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہ تھا لیکن کچھ چیزیں بن مانگے بھی تو مل جاتی ہیں۔ جب سفر مکمل ہوا تو یوں لگا جیسے سفر کی روداد بھی مکمل ہو چکی ہے اور اسی روداد میں اخوت کی کہانی بھی شامل ہے۔

1.2۔آغازِ سفر: نیویارک براستہ مانچسٹر

22 مارچ 2012۔ روانگی کا دن۔وہ کونسا سفر ہے جس سے پہلے کوئی مشکل مقام نہ آئے۔ہمیں بھی کئی

رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ویزا' ٹکٹ' پروگرام کی تفصیل' رہائش' سامان' پیکنگ۔ امریکہ کے اندر مختلف شہروں کے درمیان سفر ایک اور مرحلہ تھا۔ اور پھر ان تمام افراد سے مسلسل رابطہ جنہوں نے اس سفر کی دعوت دی اور دیدہ و دل فرشِ راہ کئے۔ لیکن قدرت ہمیشہ کی طرح مہربان تھی۔ رکاوٹیں ہٹتی گئیں' راستے آسان ہوتے گئے اور مقررہ تاریخ آن پہنچی۔ علی الصبح تین بجے۔ لاہور ایئرپورٹ کے صبر آزما مراحل بھی ذہن میں تھے لیکن یہ مرحلے ذوالفقار چوہدری نے حل کر دیئے۔ پی آئی اے کا مانوس ماحول۔ چہل پہل' گہما گہمی۔ اگلے بائیس گھنٹے سفر کے تھے۔ سات سمندر کا سفر صرف بائیس گھنٹوں میں۔ یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا۔ پہلا پڑاؤ مانچسٹر اور اگلا نیویارک تھا۔ جہاز میں موجود تقریباً سب مسافر پاکستانی تھے۔ بچے' جوان' بوڑھے اور خواتین۔ ان میں سے اکثر کا وطن یا تو اب برطانیہ ہے یا امریکہ۔ پاکستان اب ان کا وطن نہیں رہا۔ کچھ پانے کے لئے کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ کولمبس اگر پرانی دنیا چھوڑنے پہ آمادہ نہ ہوتا تو نئی دنیا کیسے دریافت کرتا۔ فضائی عملے کی مستعدی قابل تعریف تھی جوان سب کی آواز پہ لبیک کہہ رہا تھا۔ جونہی جہاز ہوا کے دوش پہ سوار ہوا میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور ماضی میں گم ہونے لگا۔ ماضی جو ماں کی گود کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ اخوت کی یادوں نے میلہ سا لگا دیا۔ وقت ہمیں آگے لے کے جا رہا تھا اور یادیں پیچھے۔ اتنے سارے لوگوں کو بھول کر خود میں گم ہونا بھی ایک سرشاری ہے۔ اس سرشاری کا نام اخوت ہے۔

1.3۔ اس نظام زر کو اب برباد ہونا چاہیے

یہ 2000 کی بات ہے۔ میں ان دنوں پنجاب رورل سپورٹ پروگرام لاہور میں کام کرتا تھا۔ رورل سپورٹ پروگرام' دیہی ترقی کا ایسا تصور ہے جسے کئی دہائیوں کی محنت کے بعد عملی شکل ملی۔ اس کارنامے کا سہرا جن لوگوں کے سر ہے ان میں دو نام سرِ فہرست ہیں۔ اختر حمید خان اور شعیب سلطان۔ ان کی کاوشیں اور ان سے قبل دنیا بھر میں امدادِ باہمی کی ایک طویل جدوجہد اس تصور کی صورت میں منتج ہوئیں۔ پی آر ایس پی کا ایک اہم کام چھوٹے قرضوں کی فراہمی تھی تاکہ لوگ ان کی مدد سے کوئی کاروبار کریں اور غربت سے نکل سکیں۔ یہ ایک غیر معمولی کام تھا۔ لوگوں کو سرمایہ دینا اور کہنا کہ جاؤ جا کر کاروبار کرو۔ غربت کی زنجیر اتنی مضبوط نہیں کہ ٹوٹ نہ سکے۔ لیکن اس نظام میں ایک قباحت بھی تھی۔ ان قرضوں پر بیس فیصد سے زائد سروس چارجز وصول کئے جاتے تھے۔ ان سے ملتے' جلتے بعض پروگراموں میں تو سروس چارج کی شرح تیس'

چالیس یا پچاس فیصد سے بھی زائد ہوتی ہے۔ چھوٹے قرضے کامیابی کا بہت بڑا راستہ ہیں۔لیکن سروس چارجز کی اس بھاری شرح پر بہت سے لوگوں کو اعتراض تھا۔ دنیا کے ہر اخلاقی نظام اور مذہب میں سود کی جس شدت سے ممانعت کی گئی ہے اس سے ہم سب بخوبی آشنا ہیں۔غریبوں کو قرضہ ضرور ملنا چاہیے تا کہ وہ کاروبار کریں اور غربت کے شکنجے سے نکل سکیں۔لیکن یہ قرضہ قرضِ حسن ہو۔اس میں مالی مفاد کی جگہ ایثار اور قربانی کا عنصر ہو۔ پی آر ایس پی میں رہ کر یہ احساس ہوا کہ دنیا ایک ظالمانہ معاشی نظام کے تابع ہے۔ ایک امیر آدمی قرض لیتا ہے تو دس یا بارہ فیصد شرح سود پر اور ایک غریب آدمی قرض لیتا ہے تو تیس یا چالیس فیصد پر حالانکہ امیر آدمی کا قرضہ اس کو مزید دولت مند بناتا ہے اور غریب آدمی کا قرضہ اسے دو نوالے فراہم کرتا ہے۔اس کا بچہ سکول جائے گا۔سر پہ چھت کی تعمیر ہو گی۔بوڑھے والدین کو دوا ملے گی۔کیا کوئی ایسا نظام نہیں بن سکتا جس میں غریب کی محنت کا پھل اسی کی جھولی میں گرے۔ ہمارے خوابوں کی تعبیر کسی اور کے مقدر میں کیوں لکھ دی جاتی ہے۔اخوت اسی کشمکش کا حاصل تھی۔ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جہاں محرومی اور استحصال نہ ہو۔حرص، لالچ اور طمع کی جگہ ایثار اور قربانی کا علم لہرائے۔انہی دنوں گرامین بنک کے بانی ڈاکٹر محمد یونس سے گفتگو کا موقع ملا۔ڈاکٹر یونس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو تاریخ کا دھارا بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔میں نے ان کی خدمات کے اعتراف کے بعد ان کی توجہ چھوٹے قرضوں پہ لئے جانے والے سروس چارجز کی طرف دلائی تو انہیں یہ بات ناگوار گذری۔ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ مائیکروفنانس پہ سروس چارجز کا اعتراض کرتے ہیں، وہ مائیکروفنانس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔اگر وہ غریبوں کے اتنے ہی ہمدرد ہیں تو خود سے کوئی ایسا نظام بنا کے دکھا دیں جو سود سے مبرا ہو۔میں ادب کے تقاضوں سے آشنا تھا۔مسکرا کے خاموش ہو رہا۔البتہ اس گفتگو سے ایسا نظام وضع کرنے کی تحریک میں اور اضافہ ہوا جو سود کی آلائش سے پاک ہو۔تلاش اور جستجو بند کواڑ کھولتی ہے۔سوچ بچار شروع ہوئی۔راستے کھلنے لگے۔منزل آسان ہوتی گئی۔شرط تو صرف سفر کی ہے۔

1.4۔ہم نئے عزم سے آغازِ سحر کرتے ہیں

اخوت کا آغاز مارچ 2001 میں ہوا۔نہایت عجز و انکسار، نہایت خاموشی کے ساتھ۔قرضے اور وہ بھی بلاسود اور پھر مسجد میں بیٹھ کر۔خدمت کو کاروبار نہیں بنانا۔خودنمائی سے دور رہنا ہے۔غیروں سے کچھ نہیں لینا۔ہر

اصول مختلف، ہر بات اُلٹ:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

مائیکروفنانس کا مشہور ایکسپرٹ میلکم ہار پر لندن سے خصوصی طور پر یہ دیکھنے آیا کہ ہم مائیکروفنانس کے نام پر کیا کر رہے ہیں۔ جب وہ مسجد میں پہنچا اور اس نے اس نظام کو دیکھا تو کہنے لگا کہ مجھے حیرت اس بات پر نہیں کہ اخوت نے مائیکروفنانس کے مروجہ اصولوں کو توڑا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس کے باوجود یہ کامیابی کی طرف گامزن ہے۔ اس بات کو گیارہ برس بیت گئے آج اخوت اس مقام پر ہے کہ اس کی بازگشت ہارورڈ یونیورسٹی میں سنائی دیتی ہے۔ ایثار و قربانی، جذب و شوق اور روایت کا خوبصورت استعارہ۔ لیکن یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہوا۔

میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو بہت کچھ یاد آتا ہے۔ دوست، حریف، ساتھی اور ہم نوا۔ کچھ عجیب واقعات۔ چنیوٹ کی وہ بیوہ عورت جس کے لاکھوں روپے سود کی نذر ہو گئے اور اس کا آخری سہارا اس کا مکان بھی سودخور کے نام ہونے والا تھا۔ لنک ماڈل ٹاؤن روڈ پر غبارے بیچنے والا جس کا تعلق حافظ آباد سے تھا اور جو قرضہ لے کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ کوٹھا پنڈ کے پاس ملواری پراٹھہ ہاؤس کا کیپٹن جو بہن کی شادی کا جھانسہ دے کر قرضہ لے گیا اور کبھی واپس نہ لوٹا۔ پرنٹنگ پریس کے نابینا حافظ صاحب جنھوں نے گھر کا کرایہ دینے کے بہانے ایک خطیر رقم لی اور واپس نہ کی۔ شاد باغ کی رہائشی عورت جس نے کاروبار کے نام پر مدد مانگی اور پھر ان روپوں سے ٹکٹ خرید کر جرمنی پہنچ گئی۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے اور واقعات۔ یہ سب کچھ سیکھنے کا طویل عمل تھا:

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

1.5۔اولین دن

وہ اولین دن! جب اخوت کا کوئی دفتر ہی نہ تھا۔ لاہور جنرل ہسپتال کے عقب میں واقع ایک کچی بستی، رسول

پارک کے شکستہ اور کیچڑ سے آلودہ گلی کوچے ہی ہمارا دفتر تھے۔ پی آر ایس پی کے دفتر میں لکڑی کا وہ چھوٹا سا کیبن بھی نہیں بھولتا جس میں ڈیڑھ سال تک اخوت کا سٹاف کام کرتا رہا اور پھر وہ دن بھی یاد ہے جب ہم سورج کی تمازت سے بچنے کے لیے ایک مسجد میں داخل ہوئے اور مسجد نے اس طرح آغوش میں لیا کہ واپسی کا ہر راستہ بند ہو گیا۔ امام صاحب نے محبت سے کہا کہ ہاں! خدمت کا یہ کام تو مسجد میں ہونا چاہیے۔ یوں، مسجد اخوت کے نظام اور کردار کا اہم حصہ بن گئی۔

فضائی میزبان نے چائے پیش کی۔ خیالات کا سلسلہ چند لمحوں کے لئے ٹوٹا۔ لگتا ہے پی آئی اے اپنی تمام تر خستہ حالی کے باوجود خدمت کی روایت سے دور نہیں ہوئی۔ شائستگی کا اپنا جادو ہے۔ ادھر چائے ختم ہوئی ادھر یادوں کا سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔ اخوت کے اولین دنوں کا ایک ساتھی رسول پارک کا رہائشی باغ مسیح یاد آنے لگا۔ باغ مسیح اور اس کا پورا گھرانہ اخوت کی یادوں کا اہم موڑ ہے۔ اس کے گھر میں بیری کا ایک بڑا سا درخت تھا جس کے سائے میں ہم نے کئی بار پناہ لی۔ دوپہر کی دھوپ اور لو کے تھپیڑے۔ یہیں بیٹھ کر غربت کے بہت سے پہلوؤں کا انکشاف ہوا۔ آنسو، آہیں، درد اور غم۔ سارے ہی درخت گیان دیتے ہیں خواہ وہ برگد کے ہوں یا کوئی اور۔ بیری کا وہ درخت ہمیشہ یاد رہے گا۔ باغ مسیح ایک بہترین سماجی کارکن تھا۔ اس نے بہت سے غریب گھرانوں سے ہمارا تعارف کروایا۔ جب غربت کی بات عام ہوئی تو مدد کرنے والے بھی پہنچنے لگے۔ دو، دو لاکھ روپے کے دو اولین عطیات ملے تو خوشی کا حساب نہ رہا۔ ایسے لگا جیسے دنیا بھر کے خزانے مل گئے ہوں۔ 2001 اور 2002۔ یہ تاریخ ساز سال تھے۔ ان دو برسوں میں اخوت کے صرف دو ملازم تھے۔ سب سے پہلے ریحانہ اور پھر تبسم۔ اب یہ دونوں ہمارے ساتھ نہیں۔ اسی دوران شہزاد، طیب، آفتاب، شاہد اور سجاد آئے۔ ان کو کام سمجھانے میں بہت وقت لگا۔ سہیل اعوان اور سعید پی آر ایس پی کے تجربہ کار ملازم تھے۔ وہ بھی اخوت کے رضا کار بن گئے۔ کومیلا، اورنگی، آر ایس پی، گرامین، براک، آسا، فِنکا، پراشیکا۔ دنیا بھر کے اداروں کو پڑھا اور پھر مقامی ضروریات کو سمجھ کر نئے نئے تجربے کیے۔ لوگوں کے ساتھ کام کرنا ہو تو کتابوں سے نہیں خود ان سے سیکھنا پڑتا ہے۔

کام بڑھنے لگا تو لکڑی کا کیبن چھوٹا پڑ گیا۔ ٹاؤن شپ میں واقع ایک مسجد کے پاس چار مرلہ گھر کا نچلا حصہ کرائے پر لیا گیا۔ اسی زمانے میں میں نے پی آر ایس پی سے استعفیٰ دیا اور اس گھر کے دو کمروں میں سے

ایک کمرہ میرا دفتر بن گیا۔اس دفتر میں نہ کوئی شان وشوکت تھی نہ کوئی رعب اور دبدبہ۔شور شرابا، مٹی اور گردوغبار۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ ''بڑے بڑے'' لوگ مجھے وہاں ملنے آتے تو رحم کی نگاہوں سے دیکھتے۔کبھی میری عقل پہ ماتم اور کبھی میری حالت زار پہ افسوس کا اظہار کرتے۔ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ کے ایک سابق افسر کو آٹھ فٹ چوڑے، دس فٹ لمبے سیلن زدہ کمرے میں ٹوٹی ہوئی کرسی پہ بیٹھا دیکھ کر انہیں کفِ افسوس ہی ملنا چاہیے تھا۔لیکن اللہ کا شکر ہے کہ یہی لوگ اب میرے اس فیصلے کو تاریخ ساز کہتے ہیں۔

1.6۔زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے

یادوں کا دریچہ کھل جائے تو پھر بند نہیں ہوتا۔ مجھے یاد آیا کہ اخوت کے پہلے دفتر میں جو فرنیچر رکھا گیا وہ کم از کم بیس سال پرانا تھا۔جب میں گھر سے ایک پرانی کرسی، صوفہ اور میز اُٹھار ہا تھا تو میری والدہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سوال تھا۔''نوکری تو چھوڑ دی ہے کیا اب اس کرسی پر بیٹھو گے''۔آہستہ آہستہ محسوس ہوا کہ یہ کرسی بھی بہت جگہ گھیرتی ہے۔لوگوں کو بیٹھنے میں مشکل ہوتی ہے اور پھر کرسی میں تمکنت بھی ہے جب کہ اخوت تو سادگی کا تقاضا کرتی ہے۔کسی نے کہا کہ کرسی کے بغیر بھی تو کام ہوسکتا ہے۔یوں فرشی نشست کا اصول اپنالیا گیا۔ چٹائی، دری، گدیاں اور گاؤ تکیے۔دیوار سے چونا گرتا تھا اس لیے وہاں سرکی لگا دی گئی۔اس ٹوٹے پھوٹے شکستہ حال دفتر میں کئی نامور لوگ آئے۔مشہور سماجی کارکن حاجی انعام الٰہی اثر، جسٹس نسیم حسن شاہ، کالم نگار توفیق بٹ اور جاوید چوہدری، شاعر منیر نیازی، دانشور مجیب الرحمٰن شامی ......یہی ہیڈ آفس تھا۔یہی برانچ آفس۔پشاور سے آنے والا محمد سعید ایک طویل عرصہ تک مالی معاملات دیکھتا رہا۔آغاز میں سارا کام خواتین کو گروہوں کی صورت میں منظّم کرکے ہوتا تھا۔ہر گروہ میں دس خواتین ہوتیں اور ہر ماہ ان میں سے دو خواتین کو قرض پیش کیا جاتا۔انہی گروہوں میں وہ خاتون بھی شامل تھی جسے پہلا یا دوسرا قرضہ ملا اور وہ ایک استعارہ بن گئی۔خواتین کے ان گروپوں کے نام بے حد خوبصورت ہوتے تھے۔یہ نام عام طور پر خواتین کے جذبوں اور شوق کی عکاسی کرتے۔کئی نام مجھے اب تک یاد ہیں۔ہمت، نفیس، عوامی، سدرہ، گلشن، انمول، خوشبو، اقراء، باغ، توحید، ستارہ، بسم اللہ، مریم اور مقدس۔ہر نام خواتین کے اپنے اپنے جذبوں کا مظہر تھا۔بہت جلد پندرہ گروہ بن گئے اور ہر ماہ تیس قرضے جاری ہونے لگے۔دس، دس ہزار کے تیس قرضے۔مہینہ کے آخری دنوں میں یہ خدشہ لاحق ہوتا کہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے ہوگا لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ قرضوں کا انتظام نہ ہوا ہو۔ہر چیز عین

وقت پہ ہوتی۔ ہمیں جلد ہی علم ہونے لگا کہ ہم تو صرف بانٹنے کا ایک ذریعہ تھے۔ دینے والا تو کوئی اور تھا۔

پہلے سو قرضوں کے بعد پانچ عورتیں پانچ کہانیوں کے نام سے ایک کتابچہ لکھا گیا۔ اس میں ایک کہانی حاکم بی بی کی تھی۔ حاکم بی بی نے جو کچھ بتایا اس نے بہت سے لوگوں کو رلا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میری عمر ستر برس سے زیادہ ہے۔ میں شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں۔ میرے شوہر کی ماہانہ پنشن چھ سو روپے ہے۔ اس رقم میں زندہ رہنا کس قدر مشکل ہے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم کبھی کبھار گاؤں سے ''چنگیریں'' اور ''وان'' منگوا کے بیچ دیا کرتے۔ یوں کچھ اضافی رقم ہاتھ لگ جاتی۔ زندگی کے دن بمشکل تمام ہو رہے تھے کہ ایک دن کسی نے مجھے بتایا کہ کچھ لوگ خواتین کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ سود سے پاک قرضہ فراہم کریں گے جو ایک سال کے اندر قابلِ واپسی ہوگا۔ میں خواتین کے ایک گروہ جس کا نام اقراء تھا' میں شامل ہو گئی اور مجھے اگلے ہی ماہ دس ہزار روپے دے دیئے گئے۔ میں نے چنگیروں اور وان کے علاوہ گاؤں سے مرچیں منگوا کر پسوانا شروع کر دیں۔ چنگیریں' وان اور مرچیں بکنے لگیں اور میرے گھر کے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ محلے کے دوکاندار اور ضرورت مند خود آ کر چیزیں لے جاتے۔ اس کاروبار سے میں اب نہ صرف قرض کی قسط ادا کر رہی ہوں بلکہ گھر کے اخراجات میں بھی مدد دے رہی ہوں۔ صحت بہت زیادہ محنت کی اجازت نہیں دیتی مگر میں سمجھتی ہوں کہ آگے بڑھتے رہنا ہی زندگی ہے۔ دو' وقت کی روٹی کمانے کے لیے محنت تو کرنا ہی پڑے گی۔ میری عمر ستر برس ہے۔ میرا میاں اسّی سال کا ہے۔ بھیک مانگنے کو جی نہیں کرتا......اس ادارے کے لوگ کتنے اچھے ہیں جنہوں نے بتایا کہ اپنا بوجھ اٹھانا ہی زندگی کی معراج ہے۔ اللہ ان لوگوں کو خوش رکھے۔'' یہ کہانی تھی یا دعا۔ نیویارک کی طرف گامزن کئی ہزار فٹ کی بلندی پر مجھے اس ضعیف عورت کا جھریوں بھرا چہرہ یاد آنے لگا جس کے گرد نور کا ایک ہالہ سا پھیلا ہوا تھا۔ میں کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ نیلگوں آسمان' جھومتے ہوئے بادل۔ یا خدا! تیری دنیا میں کچھ لوگوں پر زندگی اتنی مشکل کیوں ہے۔

1.7۔ مواخات کا درس اور پہلا قرضہ

جہاز کی کھڑکیوں پہ پردے تن گئے۔ ہم سفر سونے لگے۔ کچھ موسیقی میں گم' کچھ خوابوں میں۔ یادوں کا ایک اور دریچہ کھلا۔ اخوت کے ابتدائی سفر کا ایک ایک قدم' ایک ایک موڑ سامنے تھا۔ پہلے سات سال کے دوران

چھوٹے چھوٹے عطیات اکٹھے کر کے اخوت نے کل سات کروڑ روپے کے قرضے دیئے تھے اور آج اس سے دوگنا رقم ہر ماہ پیش کی جاتی ہے۔ چند ہزار سے کئی ارب۔ کیا یہ اللہ کی رحمت کی دلیل نہیں۔

اخوت کا سارا فلسفہ، اصول اور طریقہ کار۔ یہ سب ایک تدریجی عمل تھا۔ اس پودے کی طرح جس پہ ہر روز نئی کونپلیں، نئے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ اس تصور کا اصل سرچشمہ مواخاتِ مدینہ کی وہ عظیم روایت ہے جس کا آغاز چودہ سو برس پہلے اس وقت ہوا جب مسلمانوں کو مکہ سے وطن بدر ہونا پڑا۔ ہجرت کا سفر اور صعوبتیں۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو تہی دامن تھے۔ مدینہ کے رہائشی انہیں اپنے گھر لے گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے، آج سے آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ مؤاخات کا یہ رشتہ ایک عظیم الشان روایت کا آغاز تھا لیکن ہم نے اسے ایک واقعہ سمجھ کر تاریخ کی کتابوں تک محدود کر دیا۔ آج ہم اخوت کے ذریعے مؤاخات کا وہی اصول دہرانا چاہتے ہیں۔ ہماری دسترس میں اگر دو چپاتیاں ہیں، تو ایک یا آدھی چپاتی اس شخص کو دے دیں جو ایک سے بھی محروم ہے۔ یہی احساس اخوت کے قیام کی بنیاد بنا۔ مذہب سے مستعار لیا گیا یہ اصول ان لوگوں کیلئے بھی ہے جو مذہب سے دور ہیں۔ ہم مذہبی آزادی اور رواداری کے اصول پہ مکمل یقین رکھتے ہیں۔

اخوت کے عالمگیر فلسفہ کو سمجھنے کے بعد یہ سوال اٹھا کہ اخوت کی عملی صورت کیا ہوگی۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک صاحبِ حیثیت گھرانہ، کسی کمزور خاندان کی دو طرح سے مدد کر سکتا ہے۔ یا تو یہ مدد خیرات کی صورت میں ہو سکتی ہے یا پھر قرض کی صورت میں۔ خیرات کے نتائج سے ہم سب بخوبی آگاہ تھے۔ بے توقیری اور بے بسی۔ اس لئے نگاہِ انتخاب قرض کی طرف گئی۔ وہیں سے ہم قرضِ حسن کی طرف راغب ہوئے جس سے مراد ایسا قرض ہے جس پر کسی طرح کے سود یا منافع کی شرط عائد نہ ہو۔ اخوت کے ابتدائی قرضوں میں سے ایک قرضہ رسول پارک نامی کچی بستی کی رہائشی ایک بیوہ خاتون کو ملا۔ اس خاتون کا کہنا تھا کہ خاوند کی وفات کے بعد گھر کی تمام تر ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر ہیں۔ وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہتی تھی لیکن اسے بھیک کا راستہ منظور نہیں تھا۔ اس کے حالات کی تصدیق کے بعد اسے دس ہزار روپے بطور قرضِ حسن پیش کر دیئے گئے۔ جن سے اس نے کپڑا سینے کی دو جدید مشینیں خریدیں۔ اس خاتون اور اس کی بیٹیوں نے نہ کشکول اٹھایا، نہ بھیک مانگی بس دن رات محنت کی۔

اگلے چھ ماہ کے دوران اس بہادر خاتون نے ان مشینوں کی آمدنی سے اپنے گھر کے اخراجات پورے کیے، ایک بچی کی شادی کی، اور قرضہ بھی واپس کر دیا۔ یہ قرضہ غربت کی بنجر سرزمین پر بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ اس قرضے نے اس احساس کو اور گہرا کر دیا کہ ہزاروں باعزت گھرانوں کی اس طرح سے مدد کی جا سکتی ہے۔ جہاز پُرسکون انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک جھٹکا سا لگا۔ شاید کوئی ایئر پاکٹ تھی۔ کئی لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔ کئی لوگ بے چین ہونے لگے۔ غریبوں کو ایسے دھچکے ہر روز لگتے ہیں۔ نہ وہ بے چین ہوتے ہیں نہ ان کی آنکھ کھلتی ہے۔ اخوت کا ایک کام غفلت سے بیدار کرنا بھی ہے۔

1.8۔ مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اخوت آتشِ رفتہ کا سراغ ہے۔ مؤاخات کے فلسفہ پہ قائم اس ادارے کے پانچ اصول ہیں۔ پہلا اصول سود سے پرہیز، دوسرا اصول مسجد میں بیٹھ کر کام، تیسرا اصول رضا کاریت اور چوتھا اصول یہ پیغام ہے کہ آج کے لینے والوں کو کل کا دینے والا بننا ہے۔ پانچواں اصول مذہبی آزادی اور رواداری کے متعلق ہے۔ اخوت کی کچھ سرگرمیاں مساجد یا چرچ کے اندر تکمیل پاتی ہیں اور کچھ باہر۔ اسلامی معاشرے میں مسجد سرچشمۂ فیض بھی ہے اور مرکزِ رشد و ہدایت بھی۔ خود احتسابی، سادگی، کفایت شعاری، وقت کی پابندی، مساوات۔ مسجد میں یہی کچھ نہیں بہت کچھ اور بھی ہے۔ یوں بھی ترقی کا عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں معاشرہ کے تمام لوگ شامل نہ ہوں۔ تعاون، شفافیت اور احتساب...... مسجد ہمیں گڈ گورننس کے سارے اصول سکھاتی ہے لیکن افسوس ہم اس ادارے کو ترقی یا غربت کے خاتمہ کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ مسلک یا فقہ کی ہمارے ہاں قید نہیں۔ ہمارے نزدیک مسجد اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے گھر کو کوئی بھی تعصب کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اخوت کے دفاتر ہر فقہ کی مساجد میں قائم ہیں۔ جس طرح مدینہ میں مؤاخات کا مظاہرہ ہر طرح کے امتیاز سے ہٹ کر ہوا تھا، اسی طرح ہم بھی کسی طرح کے امتیاز کو روا نہیں سمجھتے۔ ہم مساجد کے علاوہ چرچ اور گردواروں کو بھی خدمتِ خلق کے اس کام کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لاہور کے ایک مشہور چرچ میں ہم نے یہ کام کر کے دکھایا بھی ہے۔ ایک سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ کیا عورتیں اور دیگر مذاہب کے ماننے والے مساجد میں آ سکتے ہیں۔ ہماری تحقیق یہ تھی کہ شرعی تقاضوں کے احترام کے بعد عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت ہے۔ سب سے متبرک مسجد، مسجدِ نبویؐ ہے۔ اگر عورتیں وہاں نماز پڑھ سکتی ہیں تو دیگر مساجد میں

کیا امر مانع ہے۔ نبی پاک ﷺ نے مخصوص حالات میں عیسائیوں کو بھی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی تھی۔ اپنے دل کے دروازے بند کر کے کیا ہم کسی کے دل کے دروازے کھول سکتے ہیں۔ اخوت کا فلسفہ اسلامی اصولوں سے مستعار لیا گیا لیکن اس کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔

1.9۔ کس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے باوصف

خیالات کا یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب کھانے کی دعوت ملی۔ آزمودہ کار میزبان اور وطن کی خوشبو لیے لذیذ کھانا۔ ایک بار ایک دوست نے کہا میں تو پی آئی اے میں سفر ہی اس لیے کرتا ہوں کہ یہاں کی بریانی بہترین ہوتی ہے۔ مجھے وہ پرانے سفر یاد آنے لگے جو میں نے پی آئی اے میں کیے۔ 1993 میں بیرونِ ملک کا وہ سفر جب میں پہلی بار امریکہ پہنچا۔ اس روز میری منزل واشنگٹن تھی جہاں مجھے امیریکن یونیورسٹی میں ایک سال گذارنا تھا۔ یہ عرصہ بعد میں دو سال تک پھیل گیا۔ امیریکن یونیورسٹی میں میرا پہلا سال ہیوبرٹ ہمفری فیلوشپ کی جانب سے سپانسر تھا۔ امریکہ کے ایک مشہور سینیٹر کے نام پر شروع کی گئی اس فیلوشپ کے تحت دنیا بھر سے منتخب لوگ ایک سال کیلئے امریکہ بلائے جاتے ہیں اور ان کی بہترین اداروں میں تربیت ہوتی ہے۔ میرے ساتھ اس سال پاکستان سے عارفہ صبوحی، جو پاکستان کی پہلی خاتون ڈپٹی کمشنر بنیں، اور اظہر عباس منتخب ہوئے۔ ایک سال کی فیلوشپ کے بعد ہمیں واپس پلٹنا تھا لیکن مجھے ہال آف نیشنز سکالرشپ کی پیشکش ہوئی اور میں مزید ایک سال کیلئے رک گیا۔ ہال آف نیشنز سکالرشپ بھی ایک اعزاز تھا۔ گذشتہ چھیالیس سال کے دوران میں پہلا پاکستانی تھا جسے یہ اعزاز ملا۔ یوں مجھے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری مکمل کرنے کا موقعہ بھی ملا۔ امیریکن یونیورسٹی کی میری پہلی یاد اپریل April تھی۔ حسن و جمال کا پیکر۔ نام ہی کی طرح خوبصورت۔ کچھ لوگ واقعتاً ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کے دل دھڑکنا بھول جاتے ہیں۔ مصطفیٰ زیدی نے یوں ہی تو نہیں کہا:

کس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے باوصف
ایک لمحے کیلئے رک گئی دل کی دھڑکن

اپریل کا ذکر، بہاروں کا ذکر ہے۔ کچھ لوگ خوبصورت ہوتے ہیں۔ کچھ بہت خوبصورت۔ جو اس سے بھی ماوراء

ہوں انہیں کیا کہتے ہیں۔ اپیرل کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن کیلئے شاعری کی جاتی ہے۔ شفق، دھنک، ماہتاب، گھٹائیں، تارے، نغمے، بجلی، پھول۔ یہ سب ایک پیکر میں ڈھل جائیں تو شاید اس کے کچھ قریب پہنچ سکیں۔ لیکن پھر بھی نہیں۔ وہ کچھ اور ہی شے تھی۔ صبح کی پہلی کرن، جس کے بعد اجالا ہوتا ہے۔ رات کا پہلا ستارا، جس کے بعد چاندنی بکھرتی ہے۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا تو کہیں سے یہ شعر بلند ہوا:

پہلے اک شخص میری ذات بنا
اور پھر پوری کائنات بنا

اپیرل ایک شخص نہیں، پوری کائنات تھی۔ پہلے سمسٹر کے دوران میں اسے لائبریری، کیفے ٹیریا اور سیڑھیوں پر دوستوں میں بیٹھا دیکھتا رہا۔ دوسرا سمسٹر شروع ہوا تو میں نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ کون سے کورسز لے رہی ہے اور یوں ہم دونوں ایک ہی کلاس میں پہنچ گئے۔ میں اس کلاس میں کبھی لیٹ نہ ہوا۔ میں نے اس کلاس میں سب سے زیادہ نمبر لیے۔ یہ تو معمولی باتیں ہیں۔ اسے متاثر کرنے کیلئے انسان کچھ بھی کرسکتا تھا۔ وہ سمسٹر بہت تیزی سے گذرا۔ پھول کھلتے، بکھرتے، مرجھاتے رہے۔ کچھ پتہ ہی نہ چلا اور پھر ایک دن ان خوبصورت لمحوں کے سارے تیر اپنی کمان سے نکل گئے۔ سمسٹر کا آخری دن آن پہنچا۔ مجھے لگا وہ بہار کا آخری دن تھا۔ اپیرل اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی...... مجھے حیرت ہے کہ ایک پاکستانی طالب علم امریکی تاریخ کے کورس میں سب کو پیچھے چھوڑ گیا۔ اس کی یہ حیرت ہی میرا انعام تھی۔ لوگ شاید اسی ایک لمحے کے لیے منزلیں سر کرتے ہیں۔ اپیرل کا وہ آخری سمسٹر تھا۔ اس کی ڈگری مکمل ہو چکی تھی۔ وہ فلوریڈا واپس چلی گئی اور سارے پھول بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ فلوریڈا کو چمکتے ہوئے سورج کی ریاست Sun Shine State کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ سورج اسی کیلئے چمکتا ہوگا۔ اپیرل کچھ ایسی ہی تھی۔

1.10۔ ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

امریکہ کی میری دوسری اہم یاد روزا پارکس تھی۔ دوسری امریکی خاتون جس نے میرے دل پہ نقش چھوڑا۔ یہ نقش کچھ اور طرح کا تھا۔ مظلوم مگر بہادر، روزا پارکس نے مجھے بتایا کہ احتجاج کیسے کیا جاتا ہے اور ظلم کے سامنے صف آرا ہونے کے کیا معنی ہیں۔ یہ نقش کہیں گہرا اور دائمی ہے۔ روزا پارکس امریکہ کی مشہور شخصیات کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ جرأت اور بہادری کا ایک مظہر۔ روزا پارکس نے جب ظلم کے سامنے جھکنے

سے انکار کیا تو اسے کیا خبر تھی کہ یہ انکار انسانی حقوق کی تاریخ بدل دے گا۔ اس بات کو زیادہ طویل عرصہ نہیں گذرا۔ یہ دسمبر 1955 کا واقعہ ہے۔ امریکی ریاست جارجیا کی رہنے والی اس سیاہ فام عورت کو رنگ اور نسل کی بنیاد پر ہر روز توہین آمیز رویے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس روز بھی وہ دفتر سے فارغ ہو کر گھر جانے کے لئے ایک بس میں سوار ہوئی تو راستے میں خشمگیں نگاہیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ شکست اور ٹھوکریں۔ کیا یہی اس کا مقدر تھا۔ اس بس کے دو حصے تھے۔ ایک سفید فام افراد کے لئے اور ایک سیاہ فاموں کے لئے۔ ان دونوں کے درمیان ایک لکیر حائل تھی۔ روزا پارکس چپ چاپ اپنے حصے میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت کے قانون کے مطابق مسافروں کی تعداد بڑھ جانے کی صورت میں سیاہ فاموں کو اپنی نشست چھوڑ کر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ جب بس میں سفید فام افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا تو کنڈیکٹر کے حکم پر تین سیاہ فاموں کو اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا اور ان کی نشستوں پر سفید فام بیٹھ گئے۔ اگلی باری روزا پارکس کی تھی۔ کنڈیکٹر نے اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے یہ حکم ملنے کے باوجود اپنی نشست چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ روز روز کے توہین آمیز سلوک نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس نے اسی غصے سے پوچھا ''کیا میں اپنی نشست کسی اور کو اس لیے دے دوں کہ اس کی رنگت سفید ہے''۔ کنڈیکٹر نے روزا کو بتایا کہ یہ انکار قانون کی نظر میں جرم ہے۔ اس جرم پر وہ گرفتار ہو سکتی ہے۔ ''میں جیل جانے کے لئے تیار ہوں لیکن ظلم کے روبرو جھکنے سے انکار کرتی ہوں''۔ پولیس کو بلایا گیا' روزا گرفتار ہوئی۔ چند دنوں کی جیل اور چودہ ڈالر جرمانہ۔ اس سزا کے بعد امریکہ میں ہر طرف ایک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ اسی سناٹے کی کوکھ سے ایک مزاحمت نے جنم لیا جو انسانی برابری کی تحریک کا اہم سنگِ میل بن گئی۔ مارٹن لوتھر کنگ اس تحریک کا روحِ رواں تھا۔ یہ مزاحمت تین سو بیاسی دنوں پہ محیط رہی۔ اس دوران اس شہر کا ایک سیاہ فام بھی بس پہ سوار نہ ہوا۔ یہ لوگ نسلی امتیاز کے خاتمہ کی تحریک کا ہراول دستہ بن چکے تھے۔ ایک طویل آئینی جنگ۔ مظاہرے' مزاحمت' ہنگامے۔ کئی صبر آزما مراحل سے گذرنے کے بعد بالآخر یہ جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ بس کے اندر کھینچی ہوئی لکیر مٹ گئی۔ اب ایک سیاہ فام اپنی سیٹ چھوڑنے کا پابند نہ تھا۔ ظالمانہ قانون ایک کمزور عورت کی مزاحمت کا سامنا نہ کر سکے۔ ''ظلم اسی وقت تک ظلم ہے جب تک اسے للکارا نہ جائے''۔ روزا پارکس نے یہ کہہ کر ظلم کی ساری نفسیات کو آشکار کر دیا۔

روزا پارکس کو امریکہ کے بلند ترین سول ایوارڈز سے نوازا گیا۔ دو درجن سے زیادہ یونیورسٹیوں نے

ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔اس کی مزاحمت اوراس کے انکار نے کمزوروں کوایک نیا عزم دے دیا۔انکار کا وہ لمحہ اس کی زندگی کا روشن ترین لمحہ تھا۔''یہ لمحہ صرف روزا کی زندگی کانہیں امریکی تاریخ کا بھی روشن لمحہ ہے''۔مارٹن لوتھر کنگ نے بہت فخر سے یہ بات کہی۔ایسا ہی ایک انکار ایک بار پاکستان میں بھی ہوا۔اس روز جب ملک کی سب سے بڑی عدالت کے ایک جج نے پرویز مشرف نامی آمر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔اس کے نتیجے میں بھی ایک تحریک چلی۔اس کے نتیجے میں بھی کچھ لوگوں کو جھکنا پڑا۔جس انکار میں اخلاص ہو وہ انکار کسی بڑی سچائی کا نقیب ہوتا ہے۔ہماری تاریخ کے صحرا میں بھی جرأت کے پھول موجود ہیں۔

میں نے روزا پارکس سے ملنے کی دو بار کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوسکی......اب وہ اس دنیا سے رخصت ہوچکی ہے۔اس کا جسدِ خاکی منوں مٹی تلے پڑا ہے۔لیکن مٹی میں مل کر بھی وہ مٹی نہیں ہوئی۔وہ احتجاج کی ایک لازوال صدا ہے جو نسلی امتیاز کے ایوانوں میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

1.11۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

کھانا ختم ہوا۔برتن سمٹ گئے۔سیٹیں پھر سے دراز ہونے لگیں۔اپریل' روزا پارکس۔میں ان کی قید سے آزاد ہوکر ایک بار پھر اخوت کی طرف پلٹنے لگا۔سود سے انکار اور مسجد سے لگاؤ۔اخوت کا اگلا اصول رضا کاریت ہے۔رضا کار کسی بھی معاشرے کا اصل حسن ہیں۔وہ لوگ جو من وتو کی قید سے نکل کر پوری انسانیت کو اپنا بنا لیں۔رضا کاریت صوفیانہ وصف ہے۔درویشوں کا وطیرہ۔یہ پیغمبروں کی سنت بھی ہے۔خدمت کے کام میں رضا کاریت نہ ہوتو وہ کام کاروبار بن جاتا ہے۔اخوت کے ملازم بھی رضا کار ہیں کہ وہ تنخواہ آٹھ گھنٹے کی لیتے ہیں مگر کام بارہ گھنٹے کرتے ہیں۔صبح شام' رات دن' گرمی سردی۔گردشِ لیل ونہار سے مکمل ماوراء۔ان کے علاوہ سیکڑوں طالب علم' استاد اور سماجی کارکن۔اخوت کا لفظ رضا کاریت کا ہم معنی بن چکا ہے اور ہمارے Volunteers خود کو Akhuwateers کے نام سے متعارف کرواتے ہیں۔اخوت سے وابستہ لوگ یہ کام کسی لالچ میں نہیں کرتے۔وہ انسانیت کی بھلائی کو سیاست یا ذاتی مفاد کی عینک سے نہیں دیکھتے۔رضا کار یہ نہیں پوچھتا کہ وہ جس کی خدمت کیلئے نکلا ہے اس کا تعلق کس قبیلہ یا مذہب سے ہے۔وہ تو ہر طرح کے امتیاز سے بلند رہتا ہے۔ہم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جہاں ہر شخص کو سماجی اور معاشی انصاف حاصل ہو۔ہر شخص کو زندگی کی بنیادی سہولتیں مل سکیں۔ہم باہمی تعاون اور اشتراک کا ایک ایسا ماحول

بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر شخص اپنے لئے بھی سوچے اور دوسروں کے لئے بھی۔ اخوت کا فلسفہ سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے ''مؤاخاتِ مدینہ'' سے مستعار لیا گیا ہے۔ اخوت کے قرضے افراد کیلئے نہیں خاندان کے لئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ معاشرے میں خاندان ہی ایک بنیادی اکائی ہے۔ خاندان کو بحیثیت کل مضبوط کرنا چاہیے۔ مرد اور عورت کی تقسیم اس اکائی میں دراڑ ڈالتی ہے۔ ان تمام کاموں کی بنیاد میں رضا کاریت کارفرما ہے۔ اپنی ذات کے حصار سے بلند ہوکر دوسروں کی مدد اور رہنمائی۔

1.12۔ لینے والے یا دینے والے

میں اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ ایک خوبصورت آواز بلند ہوئی۔ سفر کی پہلی منزل آنے کو ہے۔ یعنی ہم مانچسٹر پہنچ چکے تھے۔ دو گھنٹے یہاں پڑاؤ اور پھر آگے روانگی۔ مسافر اٹھے اور سامان سمیٹنے لگے۔ حکم صادر ہوا کہ سارا جہاز خالی کرنا ہے۔ مسافروں کی از سرِ نو تلاشی ہوگی اور جہاز کا بھی معائنہ ہوگا۔ پاکستان سے چلتے ہوئے تو احتیاط سمجھ میں آتی ہے لیکن آدھے سفر کے بعد تلاشی کا جواز سمجھ میں نہ آیا۔ کئی ایک ضعیف اور معذور لوگ مشکل کا شکار ہونے لگے لیکن دیارِ غیر میں کون تھا جو ان کی بات سنتا۔ دو گھنٹے اسی تگ و دو میں گذرے اور جہاز کو دوبارہ اذنِ پرواز ملا۔ نئے مسافر بہت جلد ماحول کا حصہ بن گئے۔ خاطر تواضع کا اختتام ہوا اور خاموشی کی دبیز چادر لوگوں کو آغوش میں لینے لگی۔ خیالات کا سلسلہ جہاں رکا تھا وہیں سے شروع ہونے لگا۔
اخوت کا چوتھا اصول لینے والے کو دینے والا بنانا ہے۔ قرض لینے والے قرض دینے والے کس طرح بن سکتے ہیں؟ اس حقیقت تک ہم اس وقت پہنچے جب ہمارے پاس ایسے لوگ آئے جنہوں نے اخوت سے قرضہ لے کر کوئی کاروبار شروع کیا اور اچھی خاصی رقم کمانے لگے۔ انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ اب ان کے بچے کھانا کھا سکتے تھے، سکول جا سکتے تھے۔ جب وہ ہمیں یہ بات سناتے تو ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیرتے ہوئے نظر آتے۔ ان کا لہجہ احسان مندی کے بوجھ سے پرنم ہو جاتا۔ وہ یہ کہہ کر ہمیں اور بھی حیران کر دیتے کہ وہ اخوت کا ڈونر بننا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اخوت نے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع دیا ہے اس لئے وہ اخوت کے لئے کچھ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یوں ان میں سے اکثر لوگ دو، دو روپے دے کر ڈونر بن گئے۔ انہوں نے اپنی دکان یا ریڑھی پر اخوت کا ڈونیشن بکس رکھ لیا۔ ہر روز شام کے وقت وہ اس میں دو، چار یا پانچ روپے ڈال دیتے۔ انہیں دیکھ کر کچھ گاہک بھی اس میں اپنا حصہ ڈالنے لگے۔ یوں ہر ماہ اس ڈبے

سے سوٗ دوسو روپے نکلتے اور یہ عطیہ اخوت کے قرضِ حسن فنڈ کا حصہ بن جاتا۔ یہ ایک نا قابلِ یقین بات تھی۔ نیکی کا جواب صرف نیکی نہیں بلکہ بڑی نیکی۔ ہم نے اس اصول کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہم ہر Borrower کو یہ پیغام بھی دینے لگے کہ وہ اگر چاہے تو صرف ایک روپیہ دے کر ڈونر بن سکتا ہے۔ لیکن عطیہ دینا شرط نہیں۔ یہ اس شخص کا اپنا فیصلہ ہے۔ ہمارا کام تو صرف ترغیب دینا ہے۔ یہ بتانا کہ دینے والے کا مقام لینے والے سے کہیں افضل ہے۔ ایک اچھے معاشرہ میں دینے والوں کی تعداد لینے والوں سے زیادہ ہونی چاہیے۔ یوں بھی اخوت کی منزل ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہے، جہاں لوگ دینے کی لذت سے بھی آشنا ہوں۔ وہ صرف اپنے بھلے کیلئے نہیں بلکہ اوروں کے بھلے کیلئے بھی سوچیں۔

1.13۔ کارواں

اخوت خوشبوؤں کا ایک نگر ہے۔ یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی بھی شخص اگر مواٗخات کے تصور سے متفق ہو تو وہ اخوت میں شامل ہو سکتا ہے۔ اخوت کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں لوگ اسی جذبہ سے شامل ہوئے۔ فیصلہ طلب اور جستجو پہ ہوتا ہے۔ شوق اور جراتِ رندانہ۔ عزم اور دیوانگی۔ اخوت اس کی ہے جو اس کا بننے کو تیار ہو۔ ہماری خوش قسمتی کہ اخوت کو روزِ اول سے بے مثال ساتھی مل گئے۔ ڈاکٹر کامران شمس، اظہارالحق ہاشمی، ہمایوں احسان اور سلیم احمد رانجھا۔ ہم سخن، ہم خیال، دردمند۔ یہ سب کمال کے لوگ ہیں۔ پھر ان میں خاور رفیق، زاہد کھوکھر، فضل یزدانی، ڈاکٹر محمد سعید اور علی ارشد حکیم بھی شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انور صادق اور زبیر نواز نے بھی ہامی بھر لی۔ اخوت انہی کے اخلاص کا حاصل ہے۔ اگر ان کی مدد میسر نہ ہوتی تو شاید اخوت، اخوت نہ بن پاتی۔ یہ لوگ اخوت سے وابستہ کیسے ہوئے۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ پی آر ایس پی سے منسلک ہونے کے بعد مائیکروفنانس سر پہ سوار ہو چکا تھا۔ میں اکثر و بیشتر دوستوں کو لے کر دور دراز دیہاتوں کی طرف نکل جاتا۔ میری خواہش تھی کہ ایسا ہی ایک ادارہ بنایا جائے لیکن اس میں سود نہ ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کچھ دوست میرے ہمراہ جیابگا نامی گاؤں میں پی آر ایس پی کا کام دیکھنے پہنچے۔ ڈاکٹر کامران شمس نے وہاں ایک عورت سے پوچھا کہ دس ہزار روپے کا قرض لے کر اس کی زندگی میں کیا فرق آیا۔ اس عورت کا جواب تھا کہ پہلے اس کے بچے رات کو ایک روٹی کھاتے تھے اب دوٗ روٹیاں کھانے لگے ہیں۔ اس ایک فقرہ میں غربت کی ساری کہانی پوشیدہ ہے۔ اس روز جیابگا سے ہم سیدھے لاہور جمخانہ

آئے۔ دنیا بھر کے موضوعات لیکن غربت سرفہرست۔ پی آر ایس پی کے کام کو سراہا گیا لیکن سود پہ سب کو اعتراض تھا۔ میں نے کہا چھوٹے قرضے اگر سود کے بغیر دیئے جائیں تو کون کون ساتھ دے گا۔ کوئی ایسا ہاتھ نہ تھا جو بلند نہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے انہیں اور کچھ اور لوگوں کو دوبارہ دعوت دی اور ایک ادارے کے خدوخال پیش کیے۔ بھائی چارے کی بنیاد پر بلاسود قرضے۔ میں نے اس ادارے کا نام بھی اخوت ہی تجویز کیا۔ اس نشست میں موجود تمام افراد کا تعلق سول سروس سے تھا۔ مائیکروفنانس ان کا شعبہ نہ تھا۔ لہٰذا اس تصور کو ایک باقاعدہ ادارے میں ڈھالنے کی ذمہ داری بھی مجھے ہی سونپی گئی۔ یہ میری زندگی کا سب سے اہم دن تھا۔

1.14۔ ایک اور یاد

امریکن یونیورسٹی میں میرا پہلا دن بھی میرے لیے بہت اہم تھا۔ یونیورسٹی کی سیر کے وقت ہمیں سب سے پہلے لائبریری لے جایا گیا۔ اس لائبریری میں داخل ہو کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ میں نے اس لائبریری میں بہت سی اچھی اچھی کتابیں پڑھیں۔ سب سے پہلی کتاب رچرڈ نکسن کی مشہور تصنیف ''لیڈرز'' تھی۔ رچرڈ نکسن، امریکہ کا سابق صدر اور مشہور سیاستدان تھا۔ واٹر گیٹ سکینڈل نے اس کی شہرت کو داغدار کردیا لیکن بطور مصنف اس کی اہمیت سے بہت کم لوگوں کو انکار ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے دنیا بھر کی سیر کی۔ اسّی سے زیادہ ممالک کے دورے کیے۔ ان دوروں میں اسے ان ممالک کی سیاسی قیادت سے طویل ملاقاتوں کا موقعہ ملا۔ لیڈرز کن خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں اور انہیں کیا چیز متحرک رکھتی ہے۔ ان کے نقش اتنے گہرے کیوں ہوتے ہیں اور تاریخ ان کے پیچھے پیچھے کیوں چلتی ہے......ان ساری باتوں کا تجزیہ اس کتاب میں موجود ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ لیڈرز تو بے شمار ہیں لیکن ان لیڈرز کی عظمت کا تعین تین عناصر سے ہوتا ہے۔ بڑا انسان، بڑا ملک اور اس ملک کو درپیش مشکل ترین حالات......ان عناصر کی روشنی میں اس نے بیسویں صدی کے ان عظیم لیڈرز کا مطالعہ کیا جن سے وہ ملا اور پھر اس نے ان کے انتہائی پراثر اور جاندار خاکے لکھے۔ ان لیڈرز کی سوچ، فکر، عمل اور عادات کا دلنشین تذکرہ۔ وہ کیا چیز ہے جو انہیں عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ طلسم، وہ شعلہ، وہ دیوانہ پن جسے لیڈرشپ کہتے ہیں۔ اس فہرست میں ونسٹن چرچل، چارلس ڈیگال، ڈگلس میکارتھر، کونارڈ ایڈینار، خروشچیف اور چواین لائی جیسے لوگ شامل ہیں۔ یہ کتاب بیسویں صدی کی سیاسی قیادت کو سمجھنے کی ایک بہترین کوشش ہے۔

......لیڈر شپ یقین کا نام ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ عمل ہے۔ کچھ کا خیال ہے یہ اخلاص اور ایثار ہے۔ سچ کی تلاش ہے۔ کردار کی بلندی ہے۔ امانت ہے۔ دیوانگی اور جنون ہے یا پھر اقبال کے الفاظ میں یہ اپنے لہو کی آگ میں جل کر راکھ ہونے کا نام ہے۔ پاکستان کوئی چھوٹا ملک نہیں۔ آبادی، رقبہ اور وسائل۔ ہر اعتبار سے یہ ایک بڑا ملک ہے۔ اسے اپنی تاریخ کے انتہائی مشکل حالات درپیش ہیں لیکن کوئی لیڈر سامنے نہیں آ رہا۔ کوئی چرچل، کوئی ڈیگال، کوئی میکارتھر............کوئی سرسید، کوئی اقبال، کوئی جناح............کوئی میر کارواں، کوئی دیدہ ور۔ بے نام سی یہ خلش اور دکھ کا یہ احساس اس سفر کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے۔ میری نشست کے ساتھ بیٹھے ہوئے صاحب نے بٹن دبایا۔ انہیں شاید پیاس ستا رہی تھی۔ فضائی میزبان نے انہیں پانی کا ایک گلاس پیش کیا۔ پیاس تو مجھے بھی ستا رہی تھی لیکن اس کی نوعیت کچھ اور تھی۔ سوچ نے پہلو بدلا اور میں پھر اخوت کی طرف لوٹنے لگا۔

1.15۔ رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے

اخوت میں ہم نے وہ بہت سے کام کئے جو مائیکروفنانس میں پہلے نہیں ہوتے تھے۔ تحقیق، تجربہ اور جستجو۔ ہم ایک ایسا نظام چاہتے تھے جو سادہ بھی ہو، سہل بھی۔ صاف بھی ہو، شفاف بھی۔ اس میں کاروبار کی جگہ ایثار اور رضا کاریت ہو۔ ہم سب سود کو برا کہتے ہیں لیکن ہمارے درمیان کوئی ایسا گروہ نہیں جو سود کے خلاف عملی جہاد کرے۔ کوئی حل اور کوئی نظام دے۔ ہم چاہتے تھے کہ وعظ و نصیحت کے اس پار، عمل کی خارزار میں اترا جائے۔ عشق اگر کدال نہیں اٹھاتا تو محض دعویٰ ہے۔ جنوں اگر سر نہیں پھوڑتا تو خام ہے۔ پہلے دو سال یہ کام بہت خاموشی سے کیا گیا۔ ہمیں خود بھی علم نہ تھا کہ ہم کہاں پہنچیں گے۔ کامیابی کا یقین تھا لیکن راستے کی خبر نہ تھی۔ پہلا قرضہ مارچ 2001 میں دیا گیا لیکن اخوت کی رجسٹریشن دو سال بعد 2003 میں ہوئی۔ یہ دو سال بہت محنت اور تگ و دو کے سال تھے۔ انہی دو برسوں میں اس تصور کو حقیقت کا رنگ ملا۔ ہماری ان گنت مشکلات تھیں۔ مالی وسائل، انسانی وسائل۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ لوگ تنقید کرتے رہے۔ کچھ تمسخر اڑاتے رہے۔ کچھ بے سروسامانی کا طعنہ دیتے رہے۔ ہماری برانچز میں ڈکیتی کی وارداتیں ہوئیں۔ ہمارے کارکنوں کو زدوکوب کیا گیا۔ اسلحہ دکھا کر دفاتر کو لوٹا گیا۔ قرضہ نہ ملنے پر دھمکیاں دی گئیں۔ ایک بار ایک پولیس کانسٹیبل ناراض ہو گیا اور اخوت کے چار ملازم کئی گھنٹے کسی قانونی کارروائی کے بغیر محبوس رہے۔ ایک ستم ظریف نے قتل اور اغوا کی

دھمکیاں بھی دیں۔لیکن آتشِ شوق سرد نہ ہوئی۔ ہمارے لوگ بنک گئے تو انہیں کئی کئی گھنٹے انتظار میں کھڑا رکھا گیا۔ظاہر ہے بنکوں میں ایک غریب کی کیا توقیر ہوسکتی ہے۔ یہ سب مشکلیں اور مصائب اپنی جگہ لیکن جب کوئی ضعیف شخص یا کوئی بیوہ عورت ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتی تو یہ ساری شکائتیں مٹ جاتیں:

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ نا خدا کہیے

جو محبت کرتے ہیں وہ شکایت نہیں کرتے۔بس انتظار کرتے ہیں۔اس دن کا جس دن انسان کو اس کے ہر اس کام کا بدلہ ملے گا جو وہ دنیا میں کرتا رہا۔ہمیں تو صرف اس کی رضا درکار ہے جو دلوں کی ہر بات سنتا ہے اور پھر سب کچھ ایک لوحِ محفوظ پہ لکھتا چلا جاتا ہے۔گاہ زندگی، گاہ اجل۔اخوت کے تصور کو عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔وہ جو کسی نے کہا:

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

ہماری راہ میں دو چار نہیں ہر مقام ہی سخت تھا۔

1.16۔دور تک پھیلا ہوا ہے سلسلہ زنجیر کا

جہاز ایک جھٹکے سے رکا اور اعلان ہوا کہ ہم نیو یارک پہنچ چکے ہیں۔ جان ایف کینیڈی، ایئر پورٹ پر اترنا اور تلاشی کے مرحلوں سے گذرنا بھی ایک سخت مقام تھا۔ہم جہاز سے نکل کر امیگریشن کی طرف چل پڑے۔ نہ کوئی سختی کی نظر، نہ کوئی خشمگیں نگاہ۔ ہم بہت آرام سے ان مراحل سے گذرے۔کنویئر بیلٹ سے سامان اٹھایا اور دوسرے ٹرمینل کا رخ کیا۔نیو یارک تو محض عارضی پڑاؤ تھا۔ہمیں بائیس مارچ کی شام کو ہی ہارورڈ پہنچنا تھا اس لیے ہماری پہلی منزل بوسٹن تھی۔اگلے جہاز پر سوار ہونے کیلئے ایک بار پھر تلاشی کے عمل سے گذرنا پڑا۔سارا سامان کھولو۔جوتے اتارو۔مگر یہ سلوک صرف ہم سے نہیں تھا۔''ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے''۔یہ سلوک ہر خاص و عام سے کیا گیا۔ جہاز اڑا تو نیو یارک کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ پورا شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔رنگ و نور کی ایک بارات سی تھی۔ گویا جگنو جگمگ جگمگ کرر ہے ہوں۔لیکن ان جگنوؤں کی روشنی افغانستان اور بغداد کے اندھیروں تک کیوں لے جاتی ہے۔

میں خود سے پوچھتا رہا۔ بوسٹن پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ کی تھکاوٹ۔ ائیر پورٹ سے ٹیکسی لے کر بالآخر ہم شہر میں واقع ہوٹل پہنچ گئے۔ اخوت کا پرانا ساتھی عمران سرور وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ وہ کینیڈی سکول میں پڑھتا ہے۔ اس نے پاکستان کے ایک مشہور تعلیمی ادارے سے بی اے کیا اور پھر ہارورڈ آن پہنچا۔ اخوت سے اس کی وابستگی انیق چیمہ کے توسط سے شروع ہوئی۔ انیق بھی اس کی طرح LUMS کا فارغ التحصیل ہے۔ 2011 کے دوران اخوت کی دس سالہ تقریبات کی مہم کو منظّم کرنے کی ذمہ داری انہی دونوں کے کندھوں پر تھی۔ یہ تقریبات کئی دنوں پہ پھیلی ہوئی تھیں۔ اخوت ماڈل پر ایک بین الاقوامی کانفرنس اور تین ہزار خاندانوں کو ایک ہی نشست میں قرضوں کی تقسیم۔ یہ دونوں تقریبات اس سالگرہ کا حاصل تھیں۔ عمران اور انیق نے تقریبات کی اس ذمہ داری کو حسین حیدر کی قیادت میں بہت خوبصورتی سے انجام دیا۔ انیق بھی فل برائیٹ کے لئے منتخب ہونے کے بعد کارنیگی کے علمی ماحول کا حصہ بن گیا۔ فاطمہ رشید، عمران سرور، انیق چیمہ اور ان کے بہت سے اور ساتھی آج بھی اخوت کے افق پر ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔

1.17۔ کیا اخوت کے پاس کوئی حل ہے

عمران نے بوسٹن میں ہمارے تین روزہ قیام کی تمام تیاری مکمل کر رکھی تھی۔ فون کی نئی سم، کمپیوٹر کا کنکشن، کہاں جانا ہے، کس سے ملنا ہے، یونیورسٹی کے نقشے اور آمدورفت کی تفصیلات۔ یہ سارے کام اسی کی مدد سے ہوئے۔ اگلے روز ہارورڈ بزنس سکول میں ایک مختصر نشست کا اہتمام تھا۔ اس کا عنوان ہی بہت دلچسپ تھا.............

"Microfinance: Does Pakistan's Akhuwat have the Answer"

یہ ہارورڈ میں اخوت کی کہانی پیش کرنے کا پہلا موقعہ تھا۔ اس گفتگو میں پروفیسر عاصم خواجہ اور پروفیسر ترن کھنہ کے علاوہ بہت سے طالبِ علم مدعو تھے۔ ڈاکٹر ترن کھنہ ہارورڈ بزنس سکول میں پروفیسر اور ساؤتھ ایشیا Initiative کے ڈائریکٹر ہیں۔ بھارت میں مائیکروفنانس کے سب سے بڑے ادارے ایس کے ایس مائیکروفنانس سے وابستگی کے علاوہ پروفیسر کھنہ بین الاقوامی سطح پر کئی ایک اداروں سے منسلک ہیں۔ عاصم خواجہ ہارورڈ کینیڈی سکول میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے ایم آئی ٹی MIT سے ریاضی اور کمپیوٹر میں ماسٹرز اور ہارورڈ یونیورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور کم عمری میں ہی بڑا نام کمایا۔ بزنس سکول میں

ہونے والی یہ نشست' عمران سرور کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ اس نے ہی ڈاکٹر عاصم خواجہ اور ڈاکٹر ترن کھنہ کو مدعو کیا۔ ڈاکٹر عاصم خواجہ نے مائیکروفنانس کے موضوع اور پس منظر پہ بات کی' اخوت کا مختصر سا تعارف کروایا اور پھر عمران سرور کی باری آئی۔ عمران کا کہنا تھا کہ مائیکروفنانس کا مروجہ ماڈل دنیا بھر میں تنقیدی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔ بھاری سروس چارجز کی وجہ سے ان قرضوں کی واپسی مشکل ہونے لگی ہے۔ جنوبی ایشیاء اور خصوصی طور پر بھارت میں کچھ اداروں پر الزامات عائد کئے گئے ہیں کہ ان کے ملازمین نے قرض داروں کو بے جا پریشان اور ہراساں کیا ہے۔ بعض خواتین پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ انہیں خودکشی کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ چھوٹے قرضے اتنا بڑا بوجھ بن گئے کہ واپس نہ ہو سکے اور وہ بے چاری اپنی جان سے گذر گئیں۔ ان واقعات کی بدولت مائیکروفنانس کی تحریک کو بہت نقصان پہنچا اور کئی طرح کے شکوک وشبہات سر اٹھانے لگے۔ ''کیا مائیکروفنانس صرف کاروبار ہے''۔ ''کیا غریبوں کی مدد کے لئے بھاری شرح سود کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں''۔ ''کیا مالی مفاد ہی معاشی نظام کی قوتِ محرکہ ہے''۔ یہ وہ سوال ہیں جو آج ہر سمت پوچھے جاتے ہیں۔ بھارت میں جب اس کرائسس کا آغاز ہوا تو لوگوں نے مالی مشکلات کے پیش نظر قرضوں کی اقساط واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی ایک مائیکروفنانس بنک ڈوبنے لگے اور سرمایہ دارانہ نظام کی کشتی بھنور میں جا پھنسی۔ سیاستدان' سماجی ورکرز' صحافی' دانشور۔ یہ سب لوگ میدان میں کود پڑے اور احتساب کی آواز بلند ہونے لگی۔ کیا مائیکروفنانس کا کنونشنل (Conventional) ماڈل موجودہ چیلنجز کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں رہا۔ اس صورت حال نے جن سوالوں کو جنم دیا' کیا اخوت کے پاس ان سوالوں کا جواب ہے۔ عمران نے بہت خوبصورتی سے یہ سارے سوال اٹھائے اور مجھے گفتگو کی دعوت دی۔ میں نے شکریہ ادا کرنے کے بعد اخوت کے فلسفہ اور اصولوں کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ بلاسود قرضے' تعاون اور اشتراک۔ اخوت کا معمولی آغاز اور پھر غیر معمولی جدوجہد۔ ان تمام نشیب وفراز کا مختصر تذکرہ جن کے بعد ہم ایک ممتاز مقام تک پہنچ پائے۔

میری گفتگو کا لبِ لباب یہ تھا کہ جو لوگ مائیکروفنانس کو کاروبار سمجھتے ہیں انہیں کچھ اور دردمندی سے کام لینا ہوگا۔ غربت کاروبار سے ختم نہ ہوگی ایثار سے ختم ہوگی۔ سوال جواب کا سلسلہ بھی خاصا دلچسپ تھا۔ پاکستانی طالب علموں نے اخوت کے بارے میں بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔ پروفیسر ترن کھنہ نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا

کہ ''غربت ایک گورکھ دھندا ہے۔ اس کا کوئی ایک حل نہیں اور نہ ہی ہم کسی حل کو حرفِ آخر سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کنونشنل مائیکروفنانس میں تیزی سے پھیلنے کی گنجائش ہے تو اخوت جیسے ادارے کام کے معیار کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ حتمی منزل کے حوالے سے ان میں کوئی تضاد نہیں۔ بس ایک دوسرے سے سیکھنے کی ضرورت ہے''۔ بنگلہ دیش، بھارت، سری لنکا اور پاکستان۔ کئی ملکوں کے طالب علم وہاں موجود تھے۔ ان میں سے اکثر نے ملے جلے خیالات کا اظہار کیا۔ لیکن اس بات پہ سب متفق تھے کہ اس کام کو کاروبار نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی کیپٹل ازم کو یہ اجازت ملنی چاہیے کہ وہ مائیکروفنانس کو اپنا مہرہ بنا کر غریبوں کو شہ مات دے دے۔ مجھے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ایک سابق پروفیسر میلکم ہارپر کی بات یاد آنے لگی۔ اس کا کہنا تھا:

Microfinance has come of age and has lost its innocence. It is now coming to be seen as just another business which makes its profits as and where it can………………It is also moving away from government and NGO into the hands of real businesses; it has been 'wal-martised'. Akhuwat reminds us of what we set out to do and why we did it. It takes us back to the early days of innocence when poverty alleviation was what microfinance was for. Akhuwat is breaking the mould, and is one of the most important innovations in microfinance anywhere…………. Akhuwat demonstrate that there is another way, that generosity and brotherhood can be equally powerful motivation as profit maximization. This conclusion goes far beyond microfinance.

میں جب بھی میلکم کی اس تحریر کو پڑھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ برطانیہ میں رہنے والا ایک پروفیسر، رسول پارک نامی کچی بستی سے اٹھنے والی ایک تحریک کی روح تک کیسے پہنچ پاتا ہے۔

اخوت کے پاس ان سوالوں کے جواب ہیں یا نہیں جو عمران سرور نے اٹھائے یا جن پر میلکم ہارپر نے بات کی لیکن ایک بات حتمی تھی کہ اخوت نے مائیکروفنانس کے اس پیغام کو ضرور زندہ رکھا جو اس کی اصل روح تھی۔ رورل سپورٹ پروگراموں کے بانی اور دیہی ترقی کے بین الاقوامی ماہر شعیب سلطان کا یہ کہنا بھی بے محل نہیں کہ:
The journey of Akhuwat is a testament of the ability of volunteerism and self-reliance to transform the lives of thousands. It is a story that seeks

to inspire…but most importantly it serves as a reminder of the spirit and objectives which initiated the birth of the microfinance movement.

تقریب ختم ہوئی تو ایک پاکستانی طالبہ ردا قاضی نے یاد دلایا کہ آج 23 مارچ ہے۔ یومِ پاکستان۔ اس دن ہمیں اخوت کا ہی پرچار کرنا چاہیے۔ جس شخص نے ایک آزاد وطن کا تصور پیش کیا اس نے یہ بھی تو کہا تھا:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
محبت کی زباں ہو جا اخوت کا بیاں ہو جا

1.18۔ مجھے ہے حکمِ اذاں لاالہٰ الااللہ

ہارورڈ یونیورسٹی فورم۔

اگلے دو روز یعنی 24 اور 25 مارچ ہارورڈ یونیورسٹی فورم کیلئے مخصوص تھے۔ ہارورڈ آنے کی اصل وجہ۔ ہر دو سال بعد منعقد ہونے والا یہ فورم اسلامک فنانس کے علاوہ سماجی اور معاشی ترقی جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس بار فورم کے تین اہم موضوعات تھے اسلامی مالیاتی نظام' چھوٹے کاروباروں کی ترقی میں اسلامی مالیاتی نظام کا کردار اور مذہب کی بنیاد پر سرمایہ کاری اور ہماری سماجی ذمہ داری۔ تیس ممالک' تین سو سے زیادہ شرکاء اور پچاس مقررین۔ کتنے ہی کہنہ مشق' زیرک اور دانا افراد۔ اس سال کا فورم انتظامات اور شرکت کے حوالے سے بھی بھرپور تھا۔ لاء سکول کی باوقار عمارت اور دلکش آڈیٹوریم۔ کوئی دن نہیں گذرتا کہ اس آڈیٹوریم میں دانش کی خوشبو نہ پھیلتی ہو۔ دنیا بھر کے لوگ حکمت کی گتھیاں سلجھانے یہاں پہنچتے ہیں۔

فورم میں زیادہ تر تقاریر کا موضوع غربت ہی تھا۔ دوارب لوگ محرومیوں کا شکار کیوں ہیں؟ ان کی زندگی میں خوشیوں کے چراغ کب روشن ہوں گے۔ سرمایہ داری کی کوکھ سے جس استحصال نے جنم لیا اس کا کیا حل ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اسلام کا مالیاتی نظام امید کی ایک کرن سے کم نہیں۔ معاشی ہمواری اور برابری کا اب اس کے سوا اور کونسا راستہ بچا ہے۔ سوچ کی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ پاکستان سے میرے علاوہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے نمائندے کے طور پر نثار احمد موجود تھے۔ انہوں نے اسلامک مائیکروفنانس کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں بات کی اور پاکستان کے اہم اسلامی اداروں کا تذکرہ کیا۔ کانفرنس کی آخری نشست کا عنوان تھا "Faith based investment and social

"responsibility"۔اس دلچسپ موضوع پر سب سے پہلے ڈاکٹر عمر اوسینی نے اپنی تحقیق کا خلاصہ پیش کیا۔ان کا کہنا تھا کہ عالمی معیشت کو استحصال کے چنگل سے نکالنے کیلئے مذہب کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔موجودہ فنانشل کرائسس پر محض تنقید کافی نہیں اور نہ ہی اس کے مضر نتائج پر بحث مباحثے سے بات بنے گی۔ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی متبادل حل پیش کیا جائے۔ایسا حل جو دنیا کی معیشت کو مکمل تباہی سے بچا سکے۔تہی دامن، شکستہ پا، روشنی کے منتظر۔کروڑوں، اربوں لوگ کب سے نجات کی راہ تک رہے ہیں۔ڈاکٹر عمر نے بے حد مدلل اور دلنشیں پیرائے میں بات کی۔ہر بات دل میں اترتی رہی۔ان کے بعد مختلف مقررین کو اظہارِ خیال کے لئے کہا گیا۔مجھے اخوت کے بارے میں گفتگو کرنا تھی۔مائیکروفنانس کے اس عظیم تجربے کا ذکر جس کی بنیاد مواخات کے جذبہ پہ رکھی گئی اور جو سودی معیشت سے انکار کا علم بلند کرتا ہے۔

جنابِ صدر

خواتین و حضرات

سماجی شعور یا اخلاقی اقدار پر مبنی سرمایہ کاری، ایک منفرد تصور ہے۔یہ تصور منافع کے حوالے سے ہمارے سامنے کچھ نئی جہتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔عام طور پر ''منافع'' کا تعین مادی فوائد کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔مگر منافع کی ایسی محدود تعریف انسان کو ملنے والے انعامات کی مکمل تصویر کشی نہیں کر سکتی۔سماجی اور اخلاقی اقدار پر مبنی سرمایہ کاری کا منشا محض مادی فوائد کا حصول نہیں۔دونوں نظریات اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ منافع کے تصور کو وسیع تر بنیادوں پر استوار کیا جائے اور اس میں کچھ اور امکانات بھی شامل ہوں۔
کچھ لوگوں نے منافع کے تصور کو زمان و مکان کے دائرے میں مقیّد کر کے رکھ دیا ہے۔ان کے نزدیک ذاتی مفاد کا حصول ہی اصل منافع ہے۔یہ تصور تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں۔''منافع'' کا مفہوم کسی فرد کی ذاتی زندگی تک محدود ہو کر رہ جائے تو اس کی وضاحت اس کے مادی وجود کی بنیاد پر ہی ہو سکے گی ،یعنی منافع اس شے کو ہی کہیں گے جو اس شخص کو اپنی زندگی کے دوران ملتا رہے یا اس کی تقسیم اس کے ''عرصہ حیات'' تک محدود ہو۔مگر اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کا تقاضا یہ ہے کہ ''منافع'' اس شے کو کہا جائے جس کا فائدہ اس دنیا میں بسنے والے تمام لوگوں کو ہو اور اس کی بدولت انسان اور فطرت کے مابین توازن و ہم آہنگی بھی برقرار رہے۔ایسا کرتے ہوئے نہ تو کسی فرد کی ذات کو اور نہ ہی اس کی اپنی مدّت حیات کو حوالہ بنایا جاتا ہے۔منافع یہ تو نہیں کہ

انسان کی سانسوں کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی اس کی ادائیگی بھی ختم ہونے لگے۔اس مفہوم کے تحت منافع کی تعریف میں نہ صرف اس دور بلکہ آنے والے تمام ادوار کے انسانوں کے مفاد کا احاطہ کیا جانا ضروری ہے۔

سماجی اور اخلاقی اقدار پر مبنی سرمایہ کاری کے تصور کے پس پردہ ایسے وسیع آفاقی محرکات و مقاصد کارفرما ہیں جن کے تحت فرد سے بلند ہو کر ''عوام، ماحول اور کائنات'' کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے۔تاہم اخلاقی سرمایہ کاری کا ایک اور اضافی پہلو ''ارفع و اعلیٰ یا بلند درجے کا اجر'' بھی ہے جو نہ تو اس زمین پر اور نہ ہی اس زندگی میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ہم اسے دنیاوی یا مادی زندگی سے ماورا بھی کہہ سکتے ہیں۔کوئی بھی ایسا اقتصادی اصول یا ضابطہ جو منافع اور وقت کے مروجہ تصور کا پابند ہو اس اضافی پہلو کی تشریح کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اقتصادی نظریات کی مدد سے اگرچہ اخلاقی سرمایہ کاری کی خصوصیات کو سمجھا جا سکتا ہے' تاہم اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان کی روشنی میں حقائق کا صرف جزوی احاطہ ہی ممکن ہے۔مبنی بر عقیدہ اقدار یعنی قربانی، سخاوت، سالمیت، ہمدردی اور انصاف' ترقی کے حوالے سے ایک ضروری متبادل حکمت عملی کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس حکمت عملی کا زیادہ گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔یہاں میں اخوت کی مثال پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جو منافع کے وسیع تر تصور کو سامنے رکھتے ہوئے عالمگیر بھائی چارے کا علم بلند کرتا ہے۔اخوت بلاسود مائیکروفنانس کا ایک ایسا وسیع اور جامع پروگرام ہے جس کے تحت اب تک ایک لاکھ تیس ہزار غریب خاندانوں میں ایک ارب ستر کروڑ روپے قرض حسن یا سود سے پاک قرض کے طور پر تقسیم کیے جا چکے ہیں۔وہ کونسی خصوصیات ہیں جو اخوت کو سماجی اور اخلاقی سرمایہ کاری کے تناظر میں ایک امتیازی اور برمحل مقام عطا کرتی ہیں۔

1۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اخوت کا تصور' بہت ہی برتر اور جاندار ہے۔غربت میں کمی کیلئے اخوت کے تصور کی بنیاد سماجی انصاف، خود انحصاری اور باہمی تعاون کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔اخوت مائیکروفنانس کے روایتی تصور سے بہت آگے نکل گیا ہے۔اخوت ایک استعارہ ہے۔یہ لفظ بذات خود بہت گہرے تاریخی اور مذہبی مفہوم کا حامل ہے۔یہ بھائی چارے، محبت، تعلق خاطر اور قربانی کے جذبے کا عکّاس ہے۔یہ بھی یاد رہے کہ یہ بھائی چارہ محض ایک ہی عقیدے یا مذہب تک محدود نہیں۔یہ تصور عالمگیر اور آفاقی خصوصیت کا حامل اور پوری انسانیت کا احاطہ کرتا ہے۔جہاں مائیکروفنانس کے دیگر ادارے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد محض کاروباری

سرگرمیاں کرنا ہے، وہاں اخوت کا دعویٰ ہے کہ وہ بھائی چارے پر یقین رکھتا ہے۔غریب اور انتہائی محروم طبقات کے ساتھ بھائی چارہ۔اخوت کو اس بات پر بھی یقین ہے کہ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی روحانی نجات کیلئے جو راستہ چاہے اختیار کرلے۔

2۔اخوت اپنے قرضہ جات پر کسی قسم کا سود وصول نہیں کرتا۔اخوت کی یہ اختراع اسے روایتی مائیکروفنانس سے جداگانہ حیثیت عطا کرنے والی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں غریبوں کے ساتھ لین دین کاروباری اصولوں کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہیے۔ہمیں ان پر تیس فی صد یا زائد شرح سود کا ناروا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ہمیں ان کے دینی عقائد کی نفی نہیں کرنی چاہیے۔سود سے پاک یہ قرضہ جات سماجی انصاف اور کارخیر کے انہی اصولوں کی عکاسی کرتے ہیں جو سماجی اور اخلاقی سرمایہ کاری کا اہم خاصہ ہیں۔جو لوگ صاحبِ ثروت اور وسائل سے مالا مال ہیں ان کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنے ان وسائل میں اپنے غریب اور ضرورت مند بھائیوں کو بھی شریک رکھیں کہ یہی انسانیت کا بلند ترین مقام ہے۔

3۔تیسرا نمایاں اصول یہ ہے کہ ہم اپنی سرگرمیوں کے لیے مذہبی مقامات کا انتخاب کرتے ہیں۔مذہبی مقامات کا انتخاب کیوں کیا جاتا ہے۔اس لیے کہ سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے دینی اداروں کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کیا جاسکے اور یوں درج ذیل مقاصد بھی پورے کیے جاسکیں:

- مصارف میں کمی اور شفاف نظم ونسق
- روابط وہم آہنگی اور تعارف میں آسانی۔
- باہمی اعتماد، ذمہ داری اور ایک پاکیزہ ماحول کا فروغ۔
- غربت کے اخلاقی پہلو کا احاطہ اور علاج۔

اس حکمتِ عملی کی بناء پر مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کو بھی فروغ حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ اخوت کی ان تقاریب میں تمام مذاہب کے لوگ یا تو مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں یا گرجا گھر میں۔

4۔چوتھا اصول انسان دوستی وفلاح کے جذبے کا فروغ ہے۔روایتی اقتصادی دانش کے مطابق سخاوت و فراخدلی کا جذبہ وسائل یکجا کرنے اور سرمایہ کاری کرنے کے حوالے سے ایک گریزپا اور ناقابل اعتبار عنصر کی

حیثیت رکھتا ہے جبکہ اخوت کا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ اخوت کے قرض دار جب ایک مرتبہ مناسب مالی خود مختاری واستحکام حاصل کر لیتے ہیں تو پھر وہ خود بھی کارِ خیر کے اس کام میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ خیرات وسخاوت کا جذبہ صرف طبقہ امراء تک محدود نہیں۔ جو لوگ کبھی خود امداد اور اعانت کے طلبگار ہوتے ہیں ایک روز عطیات دینے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں بشرطیکہ ان کی عزت اور آبرو کا خیال رکھا جائے اور انہیں بھکاری نہیں دوست سمجھا جائے۔ لینے والوں کا دینے والوں کی صف میں کھڑا ہونا ایک ناقابلِ یقین تبدیلی کا مظہر ہے۔

5۔ پانچواں اصول رضا کارانہ جذبے سے متعلق ہے۔ ایک حقیقی سماجی اور عوامی تنظیم کے طور پر اخوت معاشرے کے مثبت پہلوؤں پر انحصار کرتی ہے۔ یہ رضا کارانہ جذبے کو فروغ دیتی ہے یہ رضا کار اس تحریک کے لیے اپنا علم، مہارتیں، توانائی اور وقت' سب کچھ وقف کر دیتے ہیں۔ رضا کارانہ جذبات بھی مبنی بر عقیدہ اور سماجی سرمایہ کاری کے ایک اور پہلو یا جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اخوت کی حقیقی کامیابی کا تعین اعداد وشمار سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ افزائش یا گروتھ بذات خود نہ تو کامیابی کی واحد علامت ہے نہ ہی یہ سماجی واقتصادی ترقی کا مطلق پیمانہ کہلا سکتی ہے۔ حقیقی معنوں میں کامیابی کا تعلق تبدیلی یعنی ایک بہت ہی مثبت، بامعنی اور دائمی تغیر سے ہوتا ہے۔ اس دائمی تغیر کیلئے برسرِ پیکار، بہت سی دیگر تنظیموں کی طرح' اخوت بھی ترقی کے عمل کو تحریک دینے کے لیے مبنی بر عقیدہ اقدار کی طاقت اور حیات آفرینی پر یقین رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ایک ایسا مرکز بھی فراہم کرتی ہے جہاں مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والے سماجی گروہ ایک ہی جھنڈے تلے اکٹھے ہو کر انسانی فلاح و بہبود کیلئے کام کر سکتے ہیں۔

یہ منفرد خصوصیات اخوت کی اپنی اختراع نہیں۔ ہمدردی، بھائی چارہ اور باہمی تعاون یہ ایسی اقدار ہیں جو مختلف عقائد کے حامل تمام سماجی طبقات میں پائی جاتی ہیں اور ترقی کی بنیاد رکھنے اور تبدیلی کے عمل کو فروغ دینے کے لیے رہنما کردار ادا کرتی ہیں۔

''منافع کے حصول'' کا روایتی نظریہ جو کہ عالمی اقتصادی نظام کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے اور محض ایک فرد کے ذاتی مفاد کے گرد گھومتا ہے' مسائل کا حل نہیں۔ جدید معاشی نظام کے تحت منافع کے تصور کی عقلی توجیہہ تو یہی ہے لیکن عقیدے اور یقین کی دولت کے ذریعے اس میں احساس ذمہ داری اور فرض شناسی جیسے

عوامل کی روح پھونک کر اسے نہ صرف ایک نئی جہت دی جاسکتی ہے بلکہ اسے مزید جاندار بنایا جاسکتا ہے۔

خواتین وحضرات

اخلاقی قوانین اور اقدار پر کسی ایک مذہب یا عقیدے کی اجارہ داری نہیں۔ یہ سب عالمگیر اقدار ہیں۔ ان کا تعلق انسانی فطرت سے ہے۔ اخوت یا بھائی چارہ اس حوالے سے صرف ایک مثال ہے۔ اس تصور پر اسلام کا استحقاق بھی اسی قدر ہے جتنا کہ عیسائیت، یہودیت یا بدھ مت کا۔ ترقی کی جو مثالی شکل اس تصور کی بنیاد پر اجاگر کی گئی ہے وہ کسی مخصوص عقیدے کے حامل افراد کی خدمت تک محدود نہیں اور نہ ہی کوئی مخصوص سماجی گروہ اس پر بلاشرکت غیرے اپنا حق ملکیت جتا سکتا ہے۔ اخوت کی ایک کامیابی یہ بھی ہے کہ اس نے مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والے بہت سے اور افراد اور تنظیموں حتیٰ کہ ریاست کو بھی اس تحریک میں شمولیت کی جانب راغب کیا ہے۔

ہمیں یہ نکتہ لازماً ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اگر عالمی سطح پر پائے جانے والے معاشی بحران کے خاتمے کے لیے کوئی متبادل مثالی حل دریافت کرنا ہے تو پھر مذہب اور اخلاقی اقدار کو اس مثالی حل کا جزولاینفک بنانا ہوگا۔ اس وقت مسئلہ یہ نہیں کہ عقیدے کی بنیاد پر کی جانے والی سرمایہ کاری کے ذریعے عالمی اقتصادی نظام میں پایا جانے والا خلاء کس طرح پر کیا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس امر کو کیسے یقینی بنایا جائے کہ مبنی برعقیدہ اقدار کم سے کم وقت میں اقتصادی نظام کی نئی شکل متعین کرسکیں اور پھر اسے مکمل طور پر تبدیل کرنے کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

آخر میں میں اس دلچسپ اور فہم افروز بحث کو منظر عام پر لانے پر آپ سب حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دکھ، درد اور استحصال سے بھری دنیا کے اس پار ایک روشن افق ہمارا منتظر ہے۔ بہت بہت شکریہ''

یہ آواز کچھ الگ سی آواز تھی۔ بعض لوگوں کے نزدیک دقیانوسی اور بعض کے نزدیک مختلف اور منفرد! تاہم لوگوں نے یہ باتیں مکمل خاموشی اور انہماک سے سنیں۔ گویا یہ انہی کے دل سے نکل رہی ہوں۔ اخوت کا عالمگیر تصور، ایثار اور قربانی۔ جو بھی شے روایت سے ہٹ کر ہو، وہ ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ اسلامی ممالک کے مختلف مندوب، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پاکستانی طالبِ علموں کے چہرے خوشی سے تمتمار ہے تھے۔ ہال

میں کچھ دیر تالیاں گونجتی رہیں۔ یہ اس عظیم فلسفہ کی حقانیت کا اعتراف تھا جس کا نام مؤاخات ہے اور جسے بھائی چارہ یا Brotherhood بھی کہتے ہیں۔ جس کی بدولت غریب اور تہی دامن بھی کامیاب زندگی سے ہمکنار ہونے لگے اور صد ہا برس پہلے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد پڑی جو قربانی کے جوہر سے متصف تھا۔ سوال و جواب کی نشست شروع ہوئی۔ جو سب سے پہلا سوال پوچھا گیا وہ اخوت کی Sustainability کے بارے میں تھا۔ ''کیا یہ ادارہ لمبے عرصے کے لئے قائم رہے گا۔ کل اگر عطیات نہ ملے تو کیا ہوگا۔ ادارے کے اخراجات کیسے چلیں گے۔ اس کام میں وسعت کیسے آئے گی''۔ ''کیا ایثار اور قربانی ذاتی مفاد سے بڑے جذبے ہیں''۔ یہ سوال میرے لئے نئے نہیں تھے۔ گذشتہ دس سال سے ہم یہی سوال سن رہے ہیں۔ میرا جواب یہ تھا کہ اخوت کا وجود دو بنیادی مفروضوں Assumptions پر تعمیر ہے۔ پہلے مفروضے کے مطابق ہر معاشرے میں ''دینے والے'' موجود ہیں۔ ایسے لوگ جو انفاق کی اہمیت سمجھتے ہیں اور اپنی دولت میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حکم پہ یقین رکھتے ہیں کہ تم نیکی کا راستہ پا ہی نہیں سکتے جب تک کہ اللہ کی راہ میں وہ شے قربان نہ کرو جو تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے اور دوسرا مفروضہ یہ کہ ''لینے والے'' مدد لینا چاہتے ہیں بھیک نہیں۔ وہ لے کر واپس کرنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ وہ غریب ضرور ہیں مگر بھکاری نہیں۔ جب تک یہ دونوں مفروضے سچ ثابت ہوتے رہیں گے اخوت کا کام بڑھتا رہے گا اور اس کی Sustainability پہ حرف نہیں آئے گا۔ دوسری دلیل یہ کہ جو ادارہ چند ہزار روپوں سے شروع ہو کر 25 ملین ڈالر تک جا پہنچا ہو......اس کی Sustainability کیلئے اور کیا ثبوت درکار ہے اور پھر وہ بات جو بہت عرصہ پہلے میلکم ہارپر نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کہی:

Why a programme which depends on brotherhood, generosity and goodwill should be any "less sustainable", than one which depends on purely financial incentives"?

یہ ادارہ قائم بھی رہے گا، اسے عطیات بھی ملیں گے اور اس کے کام میں وسعت بھی آئے گی۔ میرے جواب میں موجود دلیل اور لہجے میں موجود عزم نے بہت سے لوگوں کو خاموش کر دیا۔

1.19۔ اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

یہ کانفرنس کی آخری نشست تھی۔

جونہی کانفرنس کے اختتام کا اعلان ہوا لوگ میرے گرد جمع ہو نے لگے۔ ان میں چند ایک پاکستانی تھے۔ کینیڈا سے آئی ہوئی ایک طالبہ شہرین کہنے لگیں۔ '' آج میں سر اٹھا کے چل سکتی ہوں''۔ فیصل نے اتنی گرمجوشی سے معانقہ کیا کہ ایک عجیب سی محبت دل میں سرایت کر گئی۔ '' آپ واشنگٹن آئیں''۔ '' آپ نیو یارک کیوں نہیں آتے''۔ '' آپ نے پاکستان کی ایک نئی تصویر پیش کی ہے''۔ '' آپ ہماری یونیورسٹی میں خطاب کریں''۔ '' ہماری سٹوڈنٹس کونسل آپ کوخوش آمدید کہے گی''۔ کئی اطراف سے دعوتیں ملنے لگیں۔ مجھے لگا پہلا کنکر پھینکنا ہی مشکل تھا۔ لہریں تو خود ہی جنم لیتی ہیں۔ اخوت کے تصور نے لوگوں کے ذہن میں ایک نئی تصویر اجاگر کر دی۔ ایثار' قربانی اور بھائی چارہ۔ میرے وطن اور میرے وطن کے لوگوں کی اصل تصویر بھی یہی ہے۔ غربت' افلاس' دہشت گردی' دھماکے' اغوا' تاوان' ڈرون............ یہ سب بین الاقوامی حالات کا شاخسانہ ہے۔ دس بیس برس پہلے یہ سب کہاں تھا۔ لیکن میں نے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ تکرار ابلاغ کے منافی ہے۔ جسے سچ کی تلاش ہے وہ خود ہمارے پاس آئے اور دیکھے کہ کیا لینے والے واقعی دینے والے بن رہے ہیں۔ کیا ایثار کی فصل استحصال کے کانٹوں کو مٹا رہی ہے۔ تاہم اس پذیرائی پر کانوں میں مجید امجد کی ایک مشہور نظم کے چند الفاظ گونجنے لگے............ میں اجنبی' میں بے نشاں' میں پا بہ گل...... یہ لوحِ دل' یہ لوحِ دل...... مؤاخات سے محبت نے اتنی عزت سے ہمکنار کر دیا۔ بڑوں کی محبت بھی بڑا بنا دیتی ہے:

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پہ اپنی
اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

1.20۔ ہارورڈ سکوائر

کانفرنس ختم ہوئی۔

میں اور عمران لاء سکول سے نکلے اور ہارورڈ اسکوائر کی طرف چل پڑے۔ مجھے آج شام کی فلائیٹ سے واشنگٹن جانا تھا۔ ابھی تین' چار گھنٹے باقی تھے۔ وقت گذارنے کے لئے ہارورڈ اسکوائر سے اچھی جگہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہلکی' ہلکی بوندا باندی اور تیز ہوا۔ ہم کافی کی ایک مشہور دکان '' سٹار بکس'' پہنچے تو بھیگ چکے تھے۔ اندر

داخل ہوئے تو لوگ باتوں میں مگن نظر آئے۔ ہلکا سا شور‘ جو گراں نہیں گزرتا۔ کچھ طالب علم کیفے کے اندر کمپیوٹرز پہ کام کر رہے تھے۔ تفریح اور تعلیم ایک ساتھ۔ ہم دونوں بھی ایک کونے میں جا بیٹھے اور کافی پینے کا ارادہ کیا۔ ہارورڈ سکوائر کی علمی فضا‘ کیفے کا دھیما ماحول۔ باہر ہونے والی ہلکی‘ ہلکی بارش۔ عین وہی کیفیت تھی جس کی تمنا کبھی غالب نے کی ہوگی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہء صہبا میرے آگے

ہارورڈ یونیورسٹی بوسٹن شہر کے اندر واقع ایک چھوٹے سے قصبے کیمبرج میں تعمیر کی گئی ہے۔ یونیورسٹی اور کیمبرج کا مرکزی مقام ہارورڈ اسکوائر کہلاتا ہے۔ اس اسکوائر کے اردگرد کئی ایک پارک اور امریکہ کی جنگِ آزادی کی بہت سی یادگاریں تعمیر ہیں۔ سب سے دلچسپ کردار وہ گلوکار ہیں جو زمین پر چادر پھیلائے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ راہ چلتے ہوئے مسافر چند سکے دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں کامیاب زندگی کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ نامور کس طرح ہونا ہے۔ امیر کیسے بننا ہے۔ کیپیٹل ازم کے فروغ کا کیا راستہ ہے۔ اس ماحول میں خود سے ہارے ہوئے یہ لوگ۔ میں اور عمران سوچ رہے تھے کہ ان کی محنت کا جوہر کس نے چرا لیا۔ ان فنکاروں کی یہ پرفارمنس رات گئے تک جاری رہتی ہے۔ طالب علموں کیلئے یہ سب تفریح بھی ہے اور گوشہء سکون بھی۔ جان ایف کینیڈی سٹریٹ‘ جان ایف کینیڈی پارک اور قریب بہتا ہوا دریائے چارلس اس ماحول کو اور دلکش بناتے ہیں۔ مجھے جو چیز سب سے دلچسپ لگی وہ ایک ہوٹل کے سامنے پڑے شطرنج کے بیسیوں میز تھے۔ کچھ لوگ سارا سارا دن یہاں بیٹھ کر شطرنج کھیلتے اور کافی سے جی بہلاتے ہیں...... تیز بھاگتی ہوئی زندگی میں‘ شطرنج جیسا کھیل وہی کھیل سکتے ہیں جو خواہشوں کے حصار سے آگے نکل چکے ہوں لیکن بعض لوگ دو ڈالر کے اس انعام کیلئے بھی کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں جو یہاں بازی جیتنے پہ مل سکتا ہے۔ ہارورڈ اسکوائر اور یونیورسٹی لازم وملزوم ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی‘ امریکہ کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہے جو 1636 میں تعمیر ہوئی۔ ہارورڈ کو دنیا کی سب سے امیر یونیورسٹی کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کے انڈومنٹ فنڈ میں تیس ارب ڈالر سے زائد رقم محفوظ ہے۔ یہ رقم پاکستان کے دو سال کے بجٹ کے برابر ہے۔

کئی سو ایکڑ پر مشتمل یہ درسگاہ علم و ادب کا لامحدود خزینہ ہے۔ اس یونیورسٹی کی لائبریری دنیا کی تمام یونیورسٹیوں سے بڑی ہے۔ امریکہ کے آٹھ صدر اس یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ یہاں کے پچھتر طلباء اور اساتذہ نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں اور ہمارے نوبل پرائز ونر............وہ بدنصیب تو کسی یونیورسٹی میں پہنچنے سے پہلے ہی اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ امریکہ کے باسٹھ کھرب پتی (جو ابھی زندہ ہیں) اس یونیورسٹی سے پڑھ کر نکلے ہیں۔ جب اس درسگاہ کا آغاز ہوا تو یہ ایک کالج تھی جس کا نام ''نیو کالج'' رکھا گیا تھا۔ جان ہارورڈ نامی ایک شخص بوسٹن پہنچا تو اس نے اپنی آدھی جائیداد اور ذاتی لائبریری اس کالج کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں نیو کالج کا نام بدل کر ہارورڈ کالج رکھ دیا گیا۔ آج ہارورڈ کے دو کیمپس ہیں۔ ان دونوں کے درمیان دریائے چارلس حدِ فاصل ہے۔ اس دریا کی ایک خوبصورتی وہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہیں جو سطح آب پر کنول کے پھولوں کی طرح کھلی رہتی ہیں۔ طالب علم جب تھکتے ہیں تو کشتی رانی کیلئے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی دوشیزائیں۔ انٹرنیشنل رینکنگ میں ہارورڈ اور برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی باہم مقابل ہیں۔ کبھی ہارورڈ اول اور کبھی کیمبرج اول......لیکن کیمبرج کا یہ اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا کہ وہیں سے پڑھے ہوئے افراد نے ہارورڈ کی بنیاد رکھی۔ سولہویں اور سترہویں صدی اہل یورپ کے عروج اور ہمارے زوال کی صدی تھی۔ ذہنی، فکری اور سماجی زوال جو معاشی اور فوجی زوال کا زینہ بنا۔ ان دو صدیوں نے مغرب اور مشرق میں فاصلے اتنے بڑھا دیئے کہ اب یہ کم ہونے میں نہیں آتے......مغل، ترک، عرب، بربر، ایرانی، خراسانی۔ یہ تمام مسلم حکمران، دانشور، سپہ سالار اور علماء جن کے کندھوں پہ اس عہد نے ایک عظیم ذمہ داری رکھی تھی، ایک روز تاریخ کے کٹہرے میں سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ ہماری اس تباہ حالی میں ان کی کم نگاہی بھی تو شامل ہے۔

ہم دونوں نے اپنی کرسیاں سنبھالیں اور کافی کا ایک ایک گھونٹ لیا۔ گفتگو کا رخ پہلے کانفرنس اور پھر اخوت کی طرف مڑا۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ میں عمران کو بتانے لگا کہ اخوت کا ابتدائی سفر بہت مشکل تھا۔ خواب کو جستجو اور جستجو کو جذبہ بنتے بنتے بہت وقت بیت گیا۔ اخوت کو ایک نمایاں کامیابی اس وقت ملی جب نامور صحافی مجیب الرحمٰن شامی نے میرا تعارف پنجاب کے سابق گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول سے کروایا۔ ہم جنرل خالد مقبول سے ملنے گورنر ہاؤس گئے تو انہوں نے قرضوں کے اس تصور کو بہت سراہا اور اپنے تعاون کی

پیشکش کی۔ ہمارے اس جواب پر کہ ہم یہ کام حکومت کی بجائے صرف مخیّر حضرات کے تعاون سے کرنا چاہتے ہیں، وہ بے حد متاثر ہوئے۔ میں نے انہیں دعوت دی کہ وہ ہمارے دفتر آئیں اور لوگوں سے ہمارے کام کے بارے میں خود پوچھیں۔ اگر انہیں اطمینان حاصل ہو کہ ہمارا کام اچھا ہے تو پھر تعاون کا فیصلہ کریں۔ سابق گورنر نے یہ دونوں کام کر دیئے۔ وہ مارچ 2003 میں رسول پارک نامی اس کچی بستی میں آئے جہاں اخوت کا آغاز ہوا تھا۔ بیسیوں خواتین اور مردوں نے انہیں اخوت کی داستان سنائی۔ ان الفاظ میں نجانے کیا اثر تھا کہ کچھ ہی عرصہ بعد جنرل خالد مقبول نے اس محلّہ کی پانچ سو خواتین کو گورنر ہاؤس میں چائے پر مدعو کر لیا۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد تقریب تھی۔ غریب خواتین گورنر ہاؤس کے وسیع لان میں نہایت اعتماد کے ساتھ چائے پی رہی تھیں۔ اس موقعہ پر کئی ایک مخیّر افراد بھی مدعو تھے۔ ایک طرف وہ لوگ جو سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے اور دوسری طرف مفلس اور نادار جن کے دامن میں کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ غریب عورتوں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ایک بار پھر اپنی کہانی سنائی۔ جدوجہد اور امید کی لازوال کہانی جو دلوں کو موم کر دیتی ہے۔ یوں بیٹھے بیٹھے عطیات کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ تقریب میں کچھ دانشور اور کالم نگار بھی موجود تھے۔ وہ جو اقبال نے کہا تھا: بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے...... ۔ ان خواتین کے لہجے میں وہ گداز تھا کہ ان کالم نگاروں میں سے کئی ایک کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اس تقریب پر کئی کالم لکھے گئے جس کی بدولت اخوت کا نام پھیلنے لگا۔ سب سے پہلا کالم عبدالقادر حسن کا تھا جو 15 جنوری 2004 کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔

1.21۔ عبدالقادر حسن

عبدالقادر حسن نے اپنے اس کالم میں اخوت کا نہایت دلکش تعارف پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا:

''کافی دن ہوئے لاہور کے گورنر ہاؤس میں خدمت خلق میں مصروف ایک تنظیم نے تقریب منعقد کی۔ گورنر پنجاب نے بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ اس تقریب کی میزبانی کی اور اس انتہائی متاثر کن تقریب میں وہ صحافی بھی شریک ہوئے جن کی جیبوں میں سوائے تنخواہ کے اور کچھ نہ تھا۔ وہ یہاں آئے تو تقریب کی رپورٹ کرنے کے لیے تھے لیکن اس دوران اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے قلیل رزقِ حلال میں سے اس کارِ خیر میں حصہ لینا واجب سمجھا۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ یہ تقریب کس قدر کامیاب اور ولولہ انگیز تھی۔ جس ادارے کی یہ تقریب تھی وہ ''اخوت'' کے نام سے معروف ہے۔

گورنر ہاؤس کے سبزہ زار میں منعقدہ اس تقریب سے اپنے ادارے کا تعارف کراتے ہوئے ایگزیکٹوڈائریکٹرڈاکٹرامجد ثاقب نے بتایا کہ ہم ان لوگوں کے لیے کام کرتے ہیں جن کی رسائی بنکوں تک نہیں ہوتی۔ہم بلاسودقرضے دے کران غریبوں کواپنے قدموں پر کھڑا کرتے ہیں اوروہ غربت کی لکیر سے اوپراٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ہم مستحق لوگوں کے قرضوں کے لیے حکومت سے کوئی امدادنہیں لیتے اور نہ ہی ڈونرایجنسیوں اورعالمی اداروں سے بھیک مانگتے ہیں۔ہمارے خیال میں غربت کا خاتمہ حکومت سے پہلے معاشرے کی ذمہ داری ہے۔اس اخوت کا پہلا مظاہرہ مدینہ شریف میں ہوا جہاں مسلمانوں نے اپنے مال واسباب میں مکہ کے مہاجرین کوشریک کرلیا۔پاکستان میں پانچ کروڑانسان غریب ہیں اورہم ان کی غربت کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ہماراپروگرام ایک مسجد سے شروع ہوااور یہی مسجد اب ہمارادفتر ہے۔یہیں ہم مستحق افرادکو چیک تقسیم کرتے ہیں اوریہیں مسجد میں ہماری ماہانہ میٹنگ ہوتی ہے۔اس طرح ہم نے مسجد سے ایک رشتہ استوار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔مسجد محض ایک عبادت گاہ ہی نہیں اسے غربت کے خاتمہ اورسماجی ترقی کا مرکز بنایا جاسکتا ہے۔گزشتہ دوبرسوں میں ہم نے آٹھ سوگھرانوں کو 80 لاکھ سے زیادہ رقم فراہم کی۔ ہمارے پاس چالیس لاکھ روپے کی رقم جمع ہےاور چونکہ سوفیصد ریکوری ہوتی ہےاس لیے یہ رقم مسلسل گردش کرتی رہتی ہے۔ہر ماہ تیس چالیس افرادکوچارلاکھ روپے قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ہماری خواہش تو یہ ہے کہ کوئی بھی غریب سرمائے کی فراہمی کے لیے ہم سے رجوع کرے تو ہم یہ سرمایہ اس کی دہلیز تک پہنچانے جائیں۔ہم اس ادارے سے مستفید ہونے والوں کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک لے جانا چاہتے ہیں۔ بظاہر یہ مشکل کام ہےاوراسی لیے ہمیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ باہر کے مالیاتی اداروں سے رجوع کریں لیکن ہم بحیثیت مسلمان توکل اوراعانت خداوندی کے قائل ہیں۔ہمارایقین ہے کہ یہ جس کا کام ہے وہی وسائل کا بندوبست بھی کرے گا۔اگرایدھی فاؤنڈیشن کو ہرسال کروڑوں روپے کے عطیے مل سکتے ہیں تو اہلِ دل ''اخوت'' سے وابستگی کا مظاہرہ کیوں نہیں کر سکتے؟

گورنر ہاؤس کی اس تقریب میں وہ لوگ بھی موجود تھے جواس ادارے سے مستفید ہوئے۔کسی نے کھوکھا لگا لیا،کسی نے ریڑھی لگالی،کسی نے کوئی چھوٹا موٹا کام کرلیااورمحتاجی وغربت سے نکل کراپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ان میں خاصی تعدادخواتین کی تھی۔گورنر صاحب نے اس تقریب میں شہر کے دولت مندلوگوں کو

شرکت کی دعوت بھی دی تھی جنہوں نے ''اخوت'' کی اچھی خاصی خدمت کی۔ اور تو اور ہم صحافیوں نے بھی پانچ سو ہزار تک حصہ لیا جبکہ دوسرے لوگ لاکھوں کی صورت میں اس کارِ خیر میں شریک تھے۔

خواتین و حضرات! ملک میں غربت اتنی نہیں جتنی دولت کی تقسیم غلط ہے۔ ایک طرف خودکشیاں ہیں دوسری طرف کروڑوں میں کھیلنے والے ہیں اور ہمارے حکمران بھی ان بڑے لوگوں میں شامل ہیں جو سرکاری اخراجات کی صورت میں غربت میں مسلسل اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اخوت والے اگر کسی مسجد کو مرکز بنا کر یہ کام کر رہے ہیں تو دوسرے لوگ ایسا کیوں نہیں کر سکتے اور لاہور سے باہر دوسرے شہروں میں یہ کام کیوں نہیں شروع ہو سکتا۔ یہ غریب لوگ جو چند ہزار روپے کی مدد لیتے ہیں اس کو سو فیصد واپس بھی کرتے ہیں اور ان کی جگہ ایک اور گھرانہ غربت سے نکل آتا ہے۔ یہ غریب لوگ بنک خور نہیں ہیں۔ یہ صرف عزت کی زندگی اور رزقِ حلال کے طلب گار ہیں۔ یہ کون حساب لگا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا ان کے حصے میں کتنی نیکیاں جمع ہو رہی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے یہ معاشرہ زندہ ہے اور اس کی شرم باقی ہے۔ ان لوگوں اور ان لوگوں کے کام کی تعریف کے لیے کوئی موزوں الفاظ کہاں سے لائے۔ اصل اسلام یہی ہے اور دراصل مسلمان یہی لوگ ہیں جو ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنے کی طرف گامزن ہیں۔ وہ معاشرہ جو انسانی تاریخ میں پہلی بار مدینہ کی مسلمان ریاست نے شروع کیا تھا۔''

عبدالقادر حسن نے جو کچھ کہا یہ ابتدائی تین سال کی روداد تھی۔ اس وقت تک صرف اسی لاکھ کے قرضے دیئے گئے اور آٹھ سو گھرانوں سے اخوت کا رشتہ قائم ہوا تھا۔ آج اتنی رقم ہر روز دی جاتی ہے۔ ہم اس وقت بھی شکرگذار تھے۔ ہم آج بھی سجدہ ریز ہیں۔ کامیابی تعداد میں نہیں اخلاص میں ہے۔ کیا اخوت کی ترقی اس امر کا بین ثبوت نہیں کہ اللہ صدقے کو بڑھاتا ہے اور سود کو گھٹاتا ہے۔

1.22۔ ایک تصور ایک تحریک

سیکڑوں ملازمین، ہزاروں خاندان، لاکھوں قرضے۔

اخوت اب ایک تصور نہیں تحریک بن چکی ہے۔ اب یہ چند لوگوں کی دیوانگی نہیں۔ ایک ادارہ ہے۔ معاشرے کو سرمایہ دارانہ نظام کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس نظام کی بنیاد استحصال پر رکھی گئی ہے۔ جو

لوگ دولت مند ہیں بنک ان کو اور دولت دیتا ہے۔ جو لوگ غریب' نادار اور مفلس ہیں ان سے شودروں کا سا سلوک ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ تقسیم' معاشی امتیاز Financial Aparthied کی بدترین شکل ہے۔ کائنات کے خزانوں کو کچھ لوگوں نے اپنے تصرف میں کرلیا۔ ان کا بس چلے تو وہ سورج کی تمازت اور ستاروں کی روشنی کے بھی دام لگا دیں۔ انہوں نے شاید تخلیق کے مقاصد کو سمجھا ہی نہیں۔ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کا اصول انسان پہ لاگو نہیں ہوسکتا۔ جو رب کا ہے وہ سب کا ہے۔ وسائل کی مساوی تقسیم' محنت اور صلاحیت کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر ریاست ہی غریب اور نادار طبقوں سے چشم پوشی کرنے لگے تو اس کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اللہ کے رسولؐ نے کہا اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ فقر سے' کمی سے' ذلت سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم ہو۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ غریبی سے' کفر سے' فسق سے' دشمنی سے اور نفاق سے۔ غریب بھیک کے نہیں تعاون کے طلبگار ہیں۔ ہم انہیں بھیک دے کر بھیک کا عادی بناتے ہیں۔ وہ مال و دولت سے محروم تو ہیں لیکن عزت نفس سے نہیں اور ہم خیرات بانٹ کر انہیں عزتِ نفس سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے پھر فرمایا کہ غربت' بھیک اور سود سے بچو۔ غربت کفر تک لے جاتی ہے۔ بھیک تذلیل ہے اور سود اللہ سے کی جانے والی جنگ۔ ہمیں نہ تو یہ کفر اور تذلیل گوارا ہے اور نہ ہی ہم اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے روادار ہو سکتے ہیں۔ اخوت نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ اسلام کے قرضِ حسن کے انفرادی نظام کو Institutionalize کیا ہے تاکہ مادیت پرستی کے اس دور میں بھائی چارے اور امدادِ باہمی کے اصول کو عام کیا جائے۔

مجھے دو افراد کی آراء یاد آتی ہیں ایک مائیکرو فنانس کی ماہر امریکی خاتون اور دوسرے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ بنگلور کے ایک پروفیسر...... یہ دونوں مجھے مراکش کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں ملے۔ ان میں سے ایک کا کہنا تھا کہ ''اخوت نے بلاسودی چھوٹے قرضوں کا ایک اچھوتا اور بے مثال نظام متعارف کروا کے دنیا میں اپنے لئے ایک انفرادی مقام حاصل کرلیا ہے۔ آپ نے کمیونیٹی کے اشتراک سے ہر مکتبۂ فکر، عقیدے اور کلچر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو یکساں احترام کے ساتھ مالی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک بہترین کارنامہ ہے۔ اخوت سوسائٹی کی بہترین اقدار کی ایک عمدہ مثال ہے''۔ دوسرے نے کہا ''اخوت نے اپنی کاوشوں کو اپنی درخشاں کلچرل اقدار کے ساتھ جوڑ رکھا ہے۔ اسی چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہ

اقدار ضرورت مند بھائیوں کی امداد کی ہمت افزائی کرتی ہیں ۔ میری خواہش ہے کہ ایک دن مجھے بھی اخوت کے دفتر آنے کا موقع ملے اور میں آپ کے اس طریقۂ کار کا مطالعہ کرسکوں ۔ مجھے یقین ہے کہ انڈیا میں بے شمار ادارے اخوت سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں''۔ سیکڑوں ملازمین' ہزاروں خاندان' لاکھوں قرضے ۔ کیا یہ سب اس امر کا ثبوت نہیں کہ اخوت اب محض ایک تصور نہیں ایک تحریک بن چکی ہے ۔ وہ جو فیض نے کہا:

انہی کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

1.23 ۔ دردمندی پہ اختیار نہیں

ہم سٹاربکس میں بیٹھے بہت دیر تک بھولی بسری یادیں دہراتے رہے ۔

عمران سرور LUMS سے فارغ ہونے کے بعد کئی ماہ تک اخوت سے منسلک رہا ۔ دس سالہ تقریبات اور بہت سے اور کام ۔ اسی دوران اخوت پر ایک کافی ٹیبل بک لکھنے کا منصوبہ سامنے آیا ۔ عمران نے اپنے دوست علی محسن گردیزی سے بات کی ۔ علی نے اپنا کیمرہ اٹھایا اور وہ دونوں ان شہروں اور قصبوں کی طرف نکل پڑے جہاں اخوت کے دفاتر قائم تھے ۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ان لوگوں کے انٹرویو لیں جنہیں اخوت سے قرضے ملے ۔ ان سے پوچھیں کہ ان قرضوں کی بدولت ان کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی ۔ قرضِ حسن محض ایک دعویٰ ہے یا اس کا کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے ۔ کوچہ گردی کا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا ۔ راولپنڈی' مانسہرہ' کراچی' لاہور اور ملتان سے لے کر راجن پور تک بیسیوں شہر ۔ قرض لینے والے افراد کے انٹرویو اور ان کی تصویریں ۔ تصویریں اس لیے کہ جو کہانی چہرے پہ درج ہوتی ہے وہ کتاب سے زیادہ متاثر کرتی ہے ۔ سفر کے کچھ حصہ میں آمنہ سید بھی ان کے ساتھ تھیں ۔ آمنہ آج کل Stanford میں پڑھتی ہے لیکن اخوت سے اب بھی دور نہیں ۔ ان لوگوں نے سخت گرمی کے دنوں میں یہ کام بے حد شوق سے کیا ۔ سفر کی ساری مشکلیں ان کے لیے بے معنی ہو گئیں ۔ اچھا کام خود انعام ہوتا ہے ۔ مسلم کمرشل بنک نے کہا یہ کتاب ہم شائع کریں گے ۔ اخوت کے اولین دوست میاں محمد منشاء نے یہ ذمہ داری بنک کے سینئر آفیسر مبشر بشیر کو دی اور یوں پاکستان کی بہترین کافی ٹیبل بک مرتب ہوئی ۔ میاں منشاء کا کہنا تھا کہ میرا بس چلے تو اخوت کی کہانی ساری دنیا میں پھیلا دوں ۔ بہت عرصہ بعد ان سب لوگوں اور ان کی محنت کو یاد کرنا کتنا اچھا لگا ۔ میں نے عمران کو بتایا کہ ایک زمانہ تھا جب اخوت کا ذکر

کرتے ہوئے بھی جھجک ہوتی تھی اور آج دنیا کی بہترین یونیورسٹی میں تیس ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں کے روبرو یہ کہانی سنائی جارہی ہے۔ دلگداز، دلنشین، پراثر۔ دردمندی پہ کسی کا اختیار تو نہیں۔ یہ تو عطا ہے۔ خدا جسے چاہے دے دے اور جسے چاہے اس سے محروم کردے۔ دلی میں انشاء نامی ایک شاعر بستے تھے۔ ان کا ایک شعر کانوں میں گونجنے لگا:

سنا یا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

ہارورڈ اسکوائر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دنیا بھر کے طالب علموں کے درمیان چند پاکستانی طالبِ علم دیکھ کے کچھ ڈھارس بندھی............کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد۔

1.24۔ بوسٹن سے واشنگٹن

عمران نے یہیں سے مجھے الوداع کہا۔ ٹیکسی مجھے واپس ہوٹل لے آئی۔ سامان پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ ہوٹل کی لابی میں رفیع الدین شکوہ کو دیکھ کے حیرت ہوئی۔ وہ بھی ہارورڈ فورم میں شرکت کیلئے تشریف لائے تھے۔ فورم کے دوران ہر روز ان سے ملاقات اور گفتگو ہوتی رہی۔ وطن کی محبت میں سرشار رفیع الدین نیویارک میں رہتے ہیں اور بڑی بڑی کاروباری کمپنیوں کو انتظامی امور میں مشاورت دیتے ہیں۔ ''میں آج سے اخوت کا ہم سفر ہوں''۔ یہ کہہ کے انہوں نے اخوت کی کتابِ رفاقت پہ دستخط ثبت کئے اور نیویارک میں ملنے کا وعدہ کر کے روانہ ہونے لگے۔ میں کچھ دیر اور لابی میں بیٹھا رہا۔ سفر کا پہلا مرحلہ ختم ہو چکا تھا اور اگلا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ ہمیں اب اس پاکستان سے ملنا تھا جو اپنا وطن چھوڑ کے امریکہ میں آباد ہے۔ ان کو بتانا تھا کہ اخوت کیا ہے۔ تصور، ادارہ، تحریک یا کارواں۔ اس کے مقاصد کیا ہیں۔ یہ خواب ہم نے کیوں دیکھا۔ فلائیٹ کا وقت قریب آنے لگا۔ ہم نے سامان اٹھایا، ٹیکسی پکڑی اور بوسٹن کے لوگن ایئرپورٹ کا راستہ اختیار کیا۔ ایئرپورٹ پر وہی تلاشی، وہی بےزاری۔ نائن الیون کے بعد دنیا پہلے جیسی نہیں رہی۔ مغرب اور اسلام کے درمیان خلیج اور گہری ہونے لگی ہے۔ جہاز ڈیڑھ گھنٹے میں نیشنل ائیرپورٹ واشنگٹن پہنچ گیا۔ اس ائیرپورٹ کا نام بدل کے اب رونالڈ ریگن ائیرپورٹ رکھ دیا گیا ہے۔ ایئرپورٹ پر ڈاکٹر قدیر ہمارا منتظر تھا۔ جب میں 1993 میں پہلی بار اس ائیرپورٹ پر اترا تو بھی اسی نے استقبال کیا تھا۔ اس نے

اپنے گھر کے دروازے ہم پر اس طرح کھولے کہ وہ اپنا ہی گھر لگا اور پھر ہمیں ہی نہیں امریکہ آنے والے ہمارے تمام دوستوں کو بھی وہیں جگہ ملتی رہی۔

قدیر نے سامان گاڑی میں رکھنے میں مدد کی اور ایئر پورٹ سے نکل کر ہم جارج واشنگٹن پارک وے پہ جا پہنچے۔ رات نے اس خوبصورت سڑک پہ اندھیرے کی چادر ڈال رکھی تھی۔ وسیع وعریض، پھولوں اور درختوں سے آراستہ، سبزے میں لپٹی یہ سڑک واشنگٹن میں دو سالہ قیام کے دنوں میں میری پسندیدہ گذرگاہ تھی۔ جانا کہیں بھی ہوتا میں اکثر و بیشتر اسی سڑک پہ نکل آتا۔ ان دنوں میں ایک خستہ حال اور پرانی فورڈ گاڑی کا مالک بھی تھا جسے میں نے دو سو پچھتر ڈالر میں خریدا اور واپسی پر تین سو ڈالر میں فروخت کر دیا۔ اس خوبصورت سڑک سے ایک راستہ ''ماؤنٹ ورنن'' کو جاتا تھا۔ ماؤنٹ ورنن امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔ ایک خوبصورت پہاڑی کی چوٹی پر واقع یہ رہائش گاہ امریکہ کی آزادی کے بعد بہت شہرت اختیار کر گئی۔ ماضی کے کواڑ کھلنے لگے۔ ماؤنٹ ورنن اور بہت سے اور تاریخی مقام میں بہت عرصہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ 1993 میں یہی میرا مشغلہ تھا۔ یونیورسٹی سے جو بھی فارغ وقت ملتا انہی جگہوں پہ گذار دیتا۔ ٹوٹی پھوٹی، پرانی گاڑی نے میرا بہت ساتھ دیا۔ ماؤنٹ ورنن، جیفرسن میموریل، لنکن میموریل، سمتھ سونین مال۔ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے۔ میں بظاہر قدیر کو بوسٹن کے قیام اور ہارورڈ کے بارے میں بتا رہا تھا لیکن میری توجہ کہیں اور تھی۔ ماؤنٹ ورنن کی یہ خوبصورت پہاڑی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہ جگہ ہی ایسی ہے اور اس جگہ کا مکین جارج واشنگٹن! امریکہ کا مقبول صدر۔ میں اس کی یاد کو ذہن سے جھٹکنے سے قاصر تھا۔ امریکہ کے بڑے لیڈرز کی فہرست میں اس کا نام بہت اوپر ہے۔

1.25۔ جارج واشنگٹن۔ امریکہ کا پہلا صدر

جارج واشنگٹن امریکہ کا پہلا صدر تھا۔ اس شخص کو قدرت نے بہترین صلاحیتوں سے نوازا۔ امریکہ کی آزادی سے پہلے وہ ریاست ورجینیا کی طرف سے فوجی خدمات بھی سرانجام دیتا رہا۔ یہ اس کی نوجوانی کے دن تھے۔ بہادر، ذہین اور متحمل مزاج۔ برطانیہ اور فرانس کی جنگ کے دوران اس نے بہت نام کمایا۔ جنگ کے بعد وہ اپنی رہائش گاہ 'ماؤنٹ ورنن' واپس لوٹ آیا اور اپنے خاندان کی روایت کے مطابق سیاست میں حصہ لینے لگا۔ پہلے پہل وہ چاہتا تھا کہ امریکہ پر برطانیہ کی حاکمیت برقرار رہے لیکن آہستہ آہستہ اس تسلط سے بے زار

ہونے لگا۔ 1775 میں جب امریکی عوام نے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو اسے متحدہ افواج کی سربراہی کے لئے چنا گیا۔ اس کا تدبر اور تجربہ اس کے ترکش کے دو بڑے تیر تھے۔ آزادی کی یہ جنگ آسان نہ تھی لیکن فتح نے بالآخر واشنگٹن کے قدم چوم لئے۔ وہ ایک قومی ہیرو بن گیا۔ لیکن اتنی بڑی فتح کے بعد وہ ایک روز خاموشی سے واپس ماؤنٹ ورنن پہنچا اور پھر سے اپنے پالتو کتوں اور گھوڑوں سے دل بہلانے لگا۔ فتح کے بعد ہر سپہ سالار بادشاہت کا تاج پہننا چاہتا ہے لیکن واشنگٹن نے ایسی کسی خواہش کا اظہار نہ کیا۔ یہ خود پر جبر کی ناقابلِ یقین مثال تھی۔ اس کا یہی انداز لوگوں کو بھا گیا اور اسے اتفاقِ رائے سے امریکہ کا پہلا صدر منتخب کر لیا گیا۔ بطور صدر بھی وہ انتہائی قابل منتظم ثابت ہوا۔ اس کا سب سے بڑا چیلنج قومی وحدت کا فروغ تھا۔ وہ اس کے حصول میں کامیاب رہا اور امریکہ کی ریاستیں فیڈرل ازم کے اصولوں کے تحت اپنی اپنی خودمختاری کے باوجود ایک مرکز پہ متفق ہونے لگیں۔

1792 میں واشنگٹن دوبارہ صدر منتخب ہوا۔ صدارت کے دوسرے دور میں اس کی مشکلات کچھ اور بڑھ گئیں۔ اس وقت برطانیہ اور فرانس عالمی سیاست کے دو بڑے کردار تھے۔ جارج واشنگٹن نے ایک نوزائیدہ ریاست کو ان طاقتوں سے جس طرح بچایا وہ دنیا کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ مارچ 1797 میں اس کی صدارت کا دوسرا دور ختم ہوا۔ وہ چاہتا تو تیسری بار بھی صدر منتخب ہو سکتا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے تاحیات صدر بنانے کی تجاویز بھی دیں جبکہ کچھ اسے بادشاہ کا درجہ دینا چاہتے تھے۔ لیکن امریکہ کی اولین قیادت جنہیں Founding Fathers کہا جاتا ہے تاریخ کا مکمل شعور رکھتی تھی۔ جیفرسن، ہملٹن، جان ایڈم، فرینکلن۔ اس کہکشاں میں واشنگٹن ایک چمکتا ہوا ستارہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر ماؤنٹ ورنن کی پرسکون خاموشی کو ترجیح دی اور ذاتی اقتدار کی خواہش کو جمہوریت کی نئی شمع پہ نچھاور کر دیا۔ ایسے ہی لوگ مدبر کہلاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ قوموں کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ جارج واشنگٹن 1799 میں اس دنیا سے چل بسا۔ جمہوری اقدار کا علمبردار یہ ایک عجب جرنیل تھا۔ سپہ سالاری، سیاست اور پھر قناعت اور گمنامی کا پرسکون راستہ۔ ایسا امتزاج تاریخ میں بہت کم ملتا ہے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں تو یہ امتزاج اور بھی کم ہے............ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو کوئی جنگ لڑے بغیر فیلڈ مارشل بن جاتے ہیں اور ایک طرف وہ لوگ ہیں جو خود صلیب پر لٹک کے ملک اور قوم کو بقا کا تحفہ دے جاتے ہیں............ افسوس کہ جارج واشنگٹن جیسا ایک سپاہی بھی ہمیں نصیب نہ ہوا:

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اتنی دیر میں ہم قدیر کے گھر پہنچ گئے۔ اس جگہ کا نام پوٹو مک ویلی ہے۔

1.26۔ پھولوں کا شہر

اگلے دو روز ڈاکٹر قدیر کے ساتھ گذرے۔ ورجینیا اور میری لینڈ۔ آئندہ دو ہفتوں کا پروگرام روبرو تھا۔ کیا کرنا ہے' کہاں جانا ہے' کس سے ملنا ہے۔ Reaching One Thousand Americans کی تفصیلی منصوبہ بندی کے بعد جو خاکہ ترتیب پایا وہ کچھ یوں تھا۔ اٹھائیس مارچ کیلی فورنیا کے شہر لاس اینجلس روانگی جہاں اعزاز ڈار حکومت پاکستان کی طرف سے کمرشل قونصلر ہیں۔ اخوت کو امریکہ میں رجسٹر کروانے کی ذمہ داری انہوں نے قبول کی اور پھر کچھ اور دوستوں کو اس میں شمولیت کیلئے آمادہ کیا اور یوں رجسٹریشن کا عمل شروع ہو گیا۔ واشنگٹن سے کیلی فورنیا یعنی امریکہ کے مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک کا یہ ہوائی سفر چھ گھنٹے کا ہے لیکن وہاں جانا اور اخوت کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنا بے حد اہم تھا۔ اعزاز نے اس ملاقات کے علاوہ پاکستانی قونصل جنرل محترمہ رفعت مسعود کی اجازت سے کیلی فورنیا کے پچیس منتخب کاروباری افراد کے ساتھ ایک لنچ کا اہتمام بھی کر رکھا تھا جس میں انہیں اخوت کے بارے میں بریفنگ دینا تھی۔ تیس اور اکتیس' مارچ شکاگو کا پروگرام تھا جہاں ڈاکٹر اعجاز اور ڈاکٹر علی رضا نقوی منتظر تھے۔ یکم اور دو' اپریل ٹیکساس فتح خان کے پاس' تین اور چار' اپریل نارتھ کیرولینا میں ذکی الدین خلیفہ اور پھر چار سے آٹھ' اپریل تک دوبارہ قدیر کے ہمراہ واشنگٹن' ورجینیا اور میری لینڈ۔ آخری چار دنوں کی سرگرمیاں بہت جزئیات کے ساتھ طے ہوئیں جس میں قدیر کے علاوہ ہمارے دیرینہ دوست ڈاکٹر امتیاز نور کی بھرپور مدد بھی شامل تھی۔

میری لینڈ کے شہر گیدرز برگ میں یہ دو' دن بہت یادگار تھے۔ اس شہر کی ہوائیں بہت مانوس لگیں۔ بیس سال پہلے جب میں امریکہ آیا تو ڈیڑھ برس اسی شہر میں قیام کیا۔ امیریکن یونیورسٹی جہاں مجھے داخلہ ملا' یہاں سے پون گھنٹے کی مسافت پہ تھی۔ پھولوں سے لدا خوبصورت شہر۔ بہار' تو بہار گیدرز برگ کی خزاں بھی قابل دید ہوتی ہے۔ خزاں کے موسم میں پتوں کے جتنے رنگ میں نے یہاں دیکھے کہیں اور نظر نہ آئے۔ سرخ' نارنجی' زرد' سرمئی' کاسنی' گلابی' چمپئی' نیلے' پیلے' شربتی۔ شاید لغت میں ان تمام رنگوں کے نام نہ ہوں جنہیں قدرت

ان دنوں یہاں بکھیر دیتی ہے۔ میں ان دو دنوں میں ان بہت سی جگہوں پر گیا جہاں میں نے اپنی بیگم فرخ، بیٹے جنید اور بیٹی فرازین کے ہمراہ ایک طویل عرصہ گذارا تھا۔ وہ خوبصورت اپارٹمنٹ جہاں ہم نے رہائش اختیار کی ابھی تک وہیں تھا۔ اردگرد کے منظر نامہ میں بہت تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ نئی عمارتیں، نئے دفاتر۔ گیدرز برگ ایلیمنٹری سکول کی عمارت بھی وہیں کھڑی تھی۔ جنید اور فرازین نے ابتدائی تعلیم یہیں سے لی اور فرخ کا اکثر وقت بھی یہیں گذرتا۔ بچوں نے سکول جانے کی اولین شرط یہ رکھی کہ ماں ہر وقت سکول کے باہر موجود رہے۔ ماں اپنی زندگی کے کتنے لمحے اولاد کی چھوٹی، چھوٹی خوشیوں کی نذر کر دیتی ہے۔ فرخ نے ہمیشہ ایک بہترین ماں کا کردار ادا کیا۔ گیدرز برگ میں ان دو دنوں میں چوہدری اللہ بخش اور ان کی بیگم سے بھی ملاقات ہوئی۔ چوہدری اللہ بخش بے حد مہربان اور مرنجاں مرنج شخصیت ہیں۔ ان کی اہلیہ عسکری بخش بھی اتنی ہی مہربان اور مہمان نواز۔ وہ کئی سال سے کینسر جیسے موذی مرض سے نبرد آزما تھیں لیکن اس کے باوجود ان کی شگفتگی اور زندہ دلی قائم تھی۔ ان کی بیٹی منال سے بھی ملاقات ہوئی جس نے اخوت کا بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مائیکروفنانس کے ایک بہت بڑے ادارے فنکا FINCA کے صدر سے میری ملاقات کا اہتمام بھی اسی کے توسط سے ہوا، اس ملاقات کی کہانی آگے چل کے بیان ہوگی۔ قدیر کا کہنا تھا کہ ہمیں ان دو دنوں میں سب سے پہلے منٹگمری مسلم کونسل سے متعارف ہونا چاہیے۔

منٹگمری مسلم کونسل، میری لینڈ کا ایک رفاہی ادارہ ہے جس کے روح رواں کچھ پاکستانی ہیں۔ کئی اور بااثر مسلمان بھی جن کا تعلق دیگر ممالک سے ہے اس ادارے سے منسلک ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جو ایک کامیاب زندگی گذارنے کے بعد ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن کچھ کرنے کی خواہش ابھی تک باقی ہے۔ فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا۔ کونسل کے ارکان کو جب اخوت کے بارے میں علم ہوا تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میں اور قدیر اس موقعہ کو کیسے ہاتھ سے جانے دیتے۔ فوراً ایک میٹنگ ہوئی اور اخوت کا پیغام عام کرنے کیلئے ''اخوت ڈنر'' کے انعقاد کا فیصلہ ہو گیا۔ کونسل کے ایک اہم رکن، ایک پاکستانی محمد طفیل، کبھی حکومت پاکستان میں ملازمت کرتے تھے لیکن اب مدت سے امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ طفیل صاحب کو سب لوگ محبت سے طفیل بھائی کہتے ہیں۔ طفیل بھائی نے اپنی معاونت کیلئے ایک نوجوان قاسم ولید کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ شستہ مزاج، تعلیم یافتہ قاسم ولید کا تعلق صومالیہ سے ہے۔ طفیل صاحب نے اس

ڈنر کے انتظام کی ذمہ داری قاسم کے سپرد کر دی۔ ڈیڑھ سو افراد کو منتخب کرنا، دعوت دینا اور پھر یونیورسٹی آف میری لینڈ سے جگہ کا حصول اور کھانے کے انتظامات۔ قاسم نے یہ سارے کام انتہائی محنت سے کیے۔ قدیر، طفیل صاحب، ڈاکٹر امتیاز نور۔ ان سب نے اپنا اپنا حصہ ڈالا لیکن قاسم اور ڈاکٹر قدیر کی بیٹی ثمن قدیر کی محنت سب سے نمایاں تھی۔ دو دن اسی ڈنر کی تیاری اور واشنگٹن اور بالٹی مور کی دیگر مصروفیات طے کرنے میں صرف ہوئے۔ اس دوران گیدرز برگ کے در و دیوار پہ بکھری خوبصورتی پرانے دنوں کی یاد تازہ کرتی رہی۔ اچھی یادیں ذہن سے محو ہونے کے باوجود دل کے کسی گوشے میں آباد رہتی ہیں۔

1.27۔ گردشِ لیل و نہار

ستائیس مارچ کی شام چوہدری اللہ بخش نے اپنے گھر مدعو کیا ہوا تھا۔ وہ ورجینیا کی کاونٹی فیئر فیکس میں رہتے ہیں اور یہ جگہ قدیر کے گھر سے کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پہ واقع ہے۔ چوہدری اللہ بخش ایک مدت سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ جب میں امریکہ میں زیرِ تعلیم تھا تو انہوں نے ایک قریبی عزیز کی طرح ہمارا خیال رکھا۔ ہم بار ہا ان کے گھر دعوتوں میں مدعو ہوئے۔ ان دعوتوں میں بھارت کے وہ سکھ اور ہندو بھی شامل ہوتے جن کے والدین پاکستان میں پیدا ہوئے لیکن 1947 کے بعد انہیں ہجرت کرنا پڑی۔ ہجرت کی اداسی اور بھولی بسری یادوں کی برکھا۔ ہم سب اپنی اپنی دنیا ساتھ لے کے چلتے ہیں۔ قدیر گاڑی چلا رہا تھا اور بیس برس پرانی یہ ساری باتیں میرے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ یادوں کے اس سفینے پہ ایک گھنٹے کا یہ سفر بھی یادگار تھا۔ چوہدری صاحب کے گھر پہنچے تو محبت اور اپنائیت کا وہی عالم دوبارہ لوٹ آیا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے ٹی وی لاؤنج میں جا پہنچے۔ وہی آتشدان اور اسی ترتیب سے رکھی ہوئی نشستیں۔ گویا یہاں سے ہمارا جانا کل ہی کی بات ہو۔ رمیش کھنہ، خلیل الرحمان، ان کے اہلِ خانہ اور محمد شفیق۔ کتنے ہی چہرے نظروں کے سامنے سے گذرنے لگے لیکن رمیش کھنہ کی یاد ان سب سے نمایاں تھی۔ بھارتی نژاد رمیش کھنہ سے میری ملاقات چوہدری اللہ بخش ہی کے گھر میں ہوئی۔ وہ عید کے موقعہ پر ہونے والا ایک یادگار ڈنر تھا۔ سخت سردی اور بارش۔ کھانے کے بعد سب لوگ آتش دان کے گرد جمع ہوئے اور بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرنے لگے۔ آگ کے شعلے اور جلترنگ۔ دل کے کسی گوشے میں پڑے خوبصورت لمحے۔ مجھے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ عمر کے ایک خاص حصہ میں یادیں کتنا بڑا اثاثہ بن جاتی ہیں۔

رمیش کھنہ کی کہانی میں عجیب طرح کی اپنائیت دکھائی دی۔اس نے بتایا کہ وہ کوئی پچیس برس پہلے امریکہ پہنچا۔ جب وہ دہلی سے چلا تو خالی ہاتھ تھا لیکن اس کے سینے میں آرزوؤں کی ایک دنیا آباد تھی۔امریکہ امکانات کی سرزمین ہے۔محنت کی عادت ہوتو ترقی کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔رمیش کھنہ کے پاس بھی یہی خوبی تھی۔پینتیس سال بعد جب وہ ریٹائر ہوا تو اس کے پاس کچھ دولت جمع ہوچکی تھی۔ریٹائرمنٹ کے بعد رمیش کھنہ اور اس کی بیگم نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔جب انہوں نے آدھی دنیا دیکھ لی تو ایک دن انہیں چنیوٹ نامی وہ چھوٹا سا شہر یاد آیا جہاں ان کا بچپن گزرا۔جس کی گلیاں ان کی حسین یادوں کا حصہ تھیں۔جس کے درودیوار، چبوترے، ممٹیاں، ان کے دل میں دھڑکتے تھے۔جس کی حویلیاں انہیں متحیر کردیتی تھیں۔

یہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی کا تذکرہ ہے جب رمیش پاکستان کے ایک قصبہ چنیوٹ میں اپنے والدین کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔اسے وہاں کی تین چیزیں بہت اچھی لگتیں۔مندر، مندر کے قریب واقع مسجد اور اس مسجد کے مینار۔لاہور کے محلّہ سنت نگر میں رہنے والی ایک چھوٹی سی لڑکی بھی اسے اچھی لگتی تھی۔اس کا نام نمل تھا۔بعد میں یہی نمل اس کی شریکِ حیات بھی بنی۔مندر، مینار، مسجد اور نمل۔اتنی دیر میں آزادی کا بگل بجا اور یہ سب کچھ اس سے چھن گیا۔سوائے نمل کے۔چنیوٹ سے چک جھمرہ کا ریلوے اسٹیشن، وہاں سے لاہور اور پھر بھارت۔خوف کے گہرے سائے میں رمیش اپنے خاندان کے ہمراہ دہلی پہنچ گیا۔ زندگی کے اگلے پچاس سال محنت میں گذر گئے۔کچھ دہلی اور کچھ امریکہ۔جستجو، کامیابی، ریٹائرمنٹ، سیروسیاحت۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اسے چنیوٹ کی یاد بےچین کرنے لگی۔ایک بار، صرف ایک بار میں نمل کے ساتھ وہاں جانا چاہتا ہوں جہاں میرے بزرگوں کی زندگی گزری۔رمیش کھنہ نے یہ کہا اور پھر سوچنے لگا کہ یہ سب کیسے ممکن ہوگا۔سوچتے سوچتے ایک دیا سا روشن ہوا۔اسے دسمبر 1993 کی وہی رات یاد آنے لگی جب چوہدری اللہ بخش کے گھر آتش دان کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔پھر اسے یاد آیا کہ وہاں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو خود بھی چنیوٹ کی محبت کا دعویدار تھا۔رمیش کھنہ نے چوہدری اللہ بخش سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور پھر بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد رمیش کھنہ اور اس کی بیگم نمل میرے پاس لاہور پہنچ گئے۔میرے اصرار پر انہوں نے مجھے ہی میزبانی کا شرف بخشا۔اگلے سات روز انہوں نے یوں گذارے جیسے وہ کسی جنت میں رہ رہے ہوں۔رمیش کھنہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔وہ چنیوٹ کی گلیوں میں دیوانہ

وار گھومتا رہا۔ اس نے ہر اس یاد کو تازہ کیا جو اس کے دل میں آباد تھی۔ چنیوٹ کے لوگوں نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے راستے میں آنکھیں بھی بچھائیں اور دل بھی۔ شہر کے ناظم، ذوالفقار علی شاہ نے اسے اپنے گھر مدعو کیا اور اتنی عزت دی کہ خوشی سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جب وہ رخصت ہوا تو ایک پوٹلی میں اس گھر کی مٹی ساتھ لے کے گیا جہاں اس نے پہلی بار آنکھیں کھولی تھیں۔ سرحدوں کی فصیل خواہ کتنی ہی بڑی ہو مٹی کی محبت تو زندہ رہتی ہے۔

یہ چند دن پلک جھپکتے میں بیت گئے۔ جانے سے پہلے رمیش کھنہ نے اخوت کو دو سو ڈالر کا عطیہ بھی دیا۔ یہ کسی غیر ملکی کا اخوت کیلئے پہلا عطیہ تھا۔ ''اخوت کا رشتہ سرحدوں سے بلند ہے''۔ رمیش کھنہ نے عطیہ کے ساتھ ایک پیغام بھی دیا۔ امریکہ جا کر رمیش صاحب نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ ''تقسیم ہند کے وقت میرے بزرگ جب چنیوٹ سے نکلے تو نہ صرف معاشی غربت کا شکار تھے بلکہ کسی بڑے سماجی رتبہ کے مالک بھی نہ تھے۔ اگر میں اپنے مرحوم والد کو یہ بتا سکتا کہ میں چنیوٹ میں ان لوگوں کا مہمان تھا جن کی حویلیوں کو دیکھ کے ہم حیران ہوتے تھے تو شاید انہیں یقین ہی نہ آتا۔ چنیوٹ میری یادوں کا حرم ہے۔ واپس آنے کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے میں ابھی تک طواف میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب! آپ نے ایک عام انسان کو اتنا بڑا بنا دیا''۔ وہی رمیش کھنہ جو ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا ہجرت کی صعوبتوں کے باوجود لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ اسی کا نام گردش لیل و نہار ہے۔ لوگ اپنے ماضی کو بھول جاتے ہیں لیکن رمیش کھنہ نے ماضی کو فراموش نہیں کیا۔ اس نے اپنی محنت سے ایک برتر سماجی رتبہ حاصل کیا۔ لیکن اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنی پوستین کو پہنے رکھا۔ یادوں کا حرم اور طواف۔ آج پینسٹھ سال پہلے رمیش کھنہ جب خوف کے عالم میں چنیوٹ سے نکلا تو اسے کیا خبر تھی کہ وہ ایک روز اسی شہر کا مہمان بنے گا۔ شہر کا ناظم اسے دل میں جگہ دے گا۔ کبھی خوشی کبھی غم، کبھی توقیر کبھی تحقیر۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اونچ نیچ کی اس حقیقت کو سمجھتے ہیں۔

1.28۔ کُو بہ کُو پھیل گئی

میں آج ورجینیا کے گھر کے اسی آتشدان کے سامنے کھڑا تھا جہاں بیس سال پہلے رمیش کھنہ سے ملاقات ہوئی۔ دو دہائیوں بعد۔ وہی یادگار لمحے جگمگانے لگے۔ چوہدری صاحب کے کہنے پر رمیش کھنہ سے فون پر بات بھی ہوئی۔ وہ ان دنوں بھارت گئے ہوئے تھے۔ پہلے تو انہوں نے تاسف کا اظہار کیا کہ میرے امریکہ

کے وزٹ کے دوران وہ وہاں نہیں تھے اور پھر چنیوٹ کو یاد کر کے آبدیدہ ہونے لگے۔ ان کی بیگم نمل اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ چنیوٹ کی پر پیچ گلیوں اور لاہور کے محلّہ سنت نگر میں جو محبت پروان چڑھی اس نے دریائے پوٹومک کے ساحل پہ آخری سانس لیا۔ لوگ تو ساتھ چلنے کا وعدہ کرتے ہیں لیکن قدرت یہ وعدہ پورا نہیں ہونے دیتی۔ دہلی میں انہوں نے بیگم کی یاد میں ایک رفاہی ادارہ بنا دیا ہے۔ یہ کہہ کے انہوں نے حیران کر دیا کہ ''اس ادارے کی Inspiration میں آپ بھی شامل ہیں۔ دردمندی کا یہ سبق میں نے آپ سے اور اخوت سے لیا تھا''۔ مجھے یہ سن کے بے پناہ خوشی ہوئی۔ نیکی بھی خوشبو کی طرح پھیلتی ہے۔ کوئی دیوار' کوئی سرحد اسے روک نہیں پاتی۔ چوہدری صاحب اور ان کی بیگم نے حسبِ روایت ہماری بہت خاطر کی۔ ان کے داماد ڈاکٹر مبارک احمد اور عامر ملک بھی موجود تھے۔ ان سب لوگوں نے بڑی دلچسپی سے اخوت کی کہانی سنی۔ مجھے یوں لگا جیسے'' Reaching One Thousand Pakistani Americans ''نامی اس مہم کا آغاز آج انہی کے گھر سے ہو رہا ہے۔ ہماری واپسی رات نو بجے کے قریب ہوئی۔

غربت' ہجرت' ایک اور ہجرت اور پھر آسانیاں' آسائشیں اور امارت۔ مندر' مسجد اور نمل۔ راستہ میں رمیش کھنہ کی کہانی یاد آتی رہی۔ کوئی ہمیں تھوڑے سے دکھ اور تھوڑی سی مشکل سے آزماتا ہے۔ سرخرو وہی ہوتے ہیں جو محنت کا دامن پکڑ لیں اور پھر صبر سے کام لیں۔ واپس پہنچتے ہی ہم نے کھانا کھایا۔ قدیر کی توجہ اور مہمان نوازی تو ضرب المثل ہے لیکن اس کی بیگم عاصمہ بھابھی اس سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہیں۔ ہمیں امریکہ پہنچے سات دن ہو چکے تھے۔ مجھے لگا یہ تو کل ہی کی بات ہے کہ ہم لاہور ائیر پورٹ پر تھے۔ اکیس گھنٹے کا طویل سفر۔ اس سفر کے دوران ایک اور سفر۔ اخوت کی یادوں کا اور پھر نیویارک اور بوسٹن۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں مختصر قیام اور لاء سکول کا فورم جہاں مواخات کی بات ہوئی' بھائی چارے کی بات ہوئی۔ وہاں سے نکلے تو میری لینڈ اور پھر پوٹومک ویلی میں قدیر کے خوبصورت گھر میں دو روزہ قیام جو اگلے دو ہفتوں کی تیاری کیلئے تھا۔ لمحوں کی کڑیاں جڑتی رہیں تو ایک زنجیر سی بن جاتی ہے جسے ہم عمرِ رفتہ کہہ کے پکارتے ہیں۔ یہ چند روز بھی اب عمرِ رفتہ کا حصہ تھے۔

2

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

واشنگٹن۔میری لینڈ۔لاس اینجلس۔شکاگو

باب دوم

2.1۔آگ بجھانے والے

مستنصر حسین تارڑ۔مشہور سفر نامہ نگار۔

ان کا کہنا ہے کہ ''اخوت ایک چھوٹی سی کشتی ہے لیکن اس میں وہ طاقت ہے جو گہرے سمندروں کے پار روشنی کی طرف لے جا سکتی ہے............ہمیں یقین ہے کہ ہم اس کشتی کو بہت بڑا جہاز بنتے ہوئے دیکھیں گے''۔ انہوں نے یہ بات 2006 میں کہی۔آج سے سات سال پہلے۔آج سات سال بعد یہ کشتی واقعی ایک جہاز بن چکی ہے۔اخوت کی پہلی ڈاکومنٹری بنانے کیلیئے ہم نے بہت سے لوگوں سے رابطہ کیا۔ان سب نے اخوت کے بارے میں اظہارِ خیال کی ہامی بھری۔جاوید احمد غامدی' مجیب الرحمٰن شامی' منیر نیازی' امجد اسلام امجد' عبدالقادر حسن' پروفیسر عبدالجبار شاکر اور پھر مستنصر حسین تارڑ۔انہوں نے اخوت کے متعلق جو بات بھی کی قدرت نے وہ بات سچ کر دکھائی۔یہ ڈاکومنٹری جاوید چوہدری کی نگرانی میں بنی اور اس کا اختتام بھی انہی کی آواز میں ایک پیغام پر ہوا۔جاوید چوہدری نے اپنے اس پیغام کو ایک تاریخی واقعہ سے جوڑتے ہوئے کہا......''خواتین وحضرات! جب نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں دھکیلا اور اس کے غلام آگ پر تیل پھینکنے لگے تو ایک ابابیل آئی۔اس نے اپنی چونچ میں پانی کا ایک قطرہ اٹھایا اور آگ پر پھینک دیا۔کسی نے ابابیل سے پوچھا کہ کیا تمہارے اس قطرے سے یہ آگ بجھ جائے گی؟ ابابیل بولی نہیں بجھے گی۔پوچھنے والے نے پوچھا تو تم یہ کوشش کیوں کر رہی ہو۔ابابیل نے جواب دیا۔حشر کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے دو فہرستیں پیش ہونگی، ایک فہرست میں ان لوگوں کے نام ہونگے جنہوں نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ جلائی تھی جبکہ دوسری فہرست میں آگ بجھانے والے ہونگے۔میری خواہش ہے کہ میرا نام آگ بجھانے والوں میں شامل ہو..................اخوت اور اخوت کے کارکن دوسری فہرست کے لوگ ہیں۔ان لوگوں کا شمار آگ بجھانے والوں میں ہوتا ہے۔میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ لوگ پاکستان سے غربت دور کر دیں گے لیکن مجھے یقین ہے جب حشر کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے غربت پھیلانے اور غربت سمیٹنے والوں کی فہرستیں پیش ہونگی تو اخوت کے لوگوں کا نام دوسری فہرست میں ہوگا۔مجھے

یقین ہےاس وقت اللہ تعالیٰ ان لوگوں کوقریب بلائیں گےان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیریں گےاور پھرفرمائیں گے کہ ان لوگوں نے دنیا میں میرے نادارلوگوں کے دکھ سمیٹے تھے میں آج آخرت میں ان کی ساری تکلیفیں ان کے سارے دکھ سمیٹتا ہوں۔

خواتین وحضرات!اخوت کی فہرست میں آپ کے نام کا خانہ ابھی تک خالی ہے۔آپ چند ہزارروپے دے کرغربت کی آگ بجھانے والے لوگوں میں شامل ہوسکتے ہیں۔آپ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتے ہیں۔اخوت آپکی منتظر ہے''۔

جاوید چوہدری کے پیغام میں بہت تاثیرتھی۔یہ ڈاکومنٹری جس نے بھی دیکھی وہ اخوت کی فہرست میں اپنے نام کا خانہ پُرکرتا رہا۔غربت کی آگ سرد ہو یا نہ ہولیکن سب سے اہم شے یہ ہے کہ ہمارا نام کس فہرست میں درج ہوا۔آگ لگانے والوں میں یا آگ بجھانے والوں میں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ابراہیم علیہ السلام سے محبت کے باوجود ہم نمرود کی صف میں کھڑے ہوں۔مستنصر حسین تارڑ سے لے کر جاوید چوہدری تک...... پاکستان کے ان منتخب لوگوں نے اخوت کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا وہ اخوت کیلئے بہت بڑا اعزاز ہیں۔

2.2۔ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے

اگلی صبح، ہمیں چھ بجے کی فلائیٹ پہ لاس اینجلس کے لئے روانہ ہونا تھا۔علی الصبح اٹھنا اور پھرایئر پورٹ پہنچ کر تلاشی کے سخت مراحل سے گذرنا ...... مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔ بار بار ہونے والی یہ مشقت اعصاب پہ سوار ہو جاتی ہے۔صبح تین بجے اٹھے۔سفر کی تیاری شروع ہوئی' اتنے میں قدیر نے آواز دی۔ سامان گاڑی میں رکھا' ایئر پورٹ کا نام کمپیوٹر میں فیڈ ہوا اور تمام راستہ ایک نقشے کی صورت میں ڈیش بورڈ پر نمایاں ہونے لگا۔ یہ بھی عجب دریافت ہے۔آپ کو کہیں جانا ہو صرف ایڈریس کا علم ہونا چاہیے۔ یہ نقشے آپ کو کسی تردد کے بغیر وہاں لے جائیں گے۔ایک زمانہ تھا کہ مسافرنواز درکار تھے اب ان کی بھی ضرورت نہیں۔صبح کا وقت' پرندوں کی چہچہاہٹ کے باوجود ایک گہری خاموشی ......لیکن جونہی ہم ایک بڑی شاہراہ پہ پہنچے منظر بدلنے لگا۔علی الصبح بھی ٹریفک کا ایک ہجوم تھا۔آہستہ' آہستہ اس میں اور اضافہ ہونے لگا۔''کیا یہ

لوگ سوتے نہیں''۔ یہ ایک بچگانہ سوال تھا لیکن قدیر یہ سوال سن کے مسکرانے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ امریکہ کی ترقی کا یہی تو راز ہے۔ یہ ملک ہر وقت جاگتا ہے اور چلتا ہے۔ مجھے اقبال کی وہ نظم یاد آئی جو ہم نے کبھی بچپن میں پڑھی تھی۔ صرف ہم نے نہیں پاکستان کے بہت سے بچوں نے پڑھی ہوگی......لیکن افسوس ہم سب نے فراموش کر دی۔ اس نظم میں تارے، چاند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے　　تارے کہنے لگے قمر سے
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا　　چلنا، چلنا، مدام چلنا
ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا　　منزل کبھی آئے گی نظر کیا

اور پھر چاند یوں جواب دیتا ہے:

کہنے لگا چاند، ہم نشینو　　اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی　　یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
چلنے والے نکل گئے ہیں　　جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن　　آغاز ہے عشق، انتہا حسن

گویا اس کرۂ ارض کی ہر شے بے تاب ہے۔ تارے انسان، حجر، شجر۔ سب حرکت میں ہیں۔ عشق اس سفر کا آغاز ہے اور حسن اس کی انتہا۔ جن لوگوں نے یہ اصول یاد رکھا وہ کامیاب ہوئے۔ جنہوں نے بھلا دیا وہ ناکام ٹھہرے۔ ''چلنے والے نکل گئے ہیں، جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں''۔ بادِ صبا نے یہ کہا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

2.3۔ تلاشی در تلاشی

بادِ صبا کا پیغام لیے، خوشگوار جھونکوں کے درمیان، ہم ڈیلس ایئر پورٹ پہنچے۔ خوبصورت اور جدید سہولتوں پر مشتمل یہ ایئرپورٹ جتنا زمین کے اوپر ہے اس سے کہیں زیادہ زیرِ زمین ہے۔ ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل تک جانے کے لئے زیرِ زمین ریل چلتی ہے۔ سیکڑوں مسافر۔ نہ کوئی قلی، نہ پورٹر، نہ شور، نہ ہنگامہ۔ خوبصورت نشانات آپ کی رہنمائی کے لئے موجود۔ اکثر اوقات یہاں کوئی راستہ بتانے والا نہیں ملتا کہ کسی

شخص کے پاس اتنا وقت نہیں۔ اپنا راستہ بھی خود ہی ڈھونڈ نا پڑتا ہے اور اپنی منزل بھی۔ شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا زمین دوز نظام۔ انتہائی صاف ستھرا' دلکش اور آسان۔ دو تین جگہوں پر ریل بدلی' ایلیویٹر پہ چڑھے اور بالآخر ڈیلٹا ایئر لائین کے ٹرمینل پہ جا پہنچے۔ سامان کا وزن ہوا' بورڈنگ پاس ملا اور اس مقام پر پہنچ گئے جو سفر کا سب سے سخت مقام تھا یعنی ذاتی تلاشی کے مراحل۔ پہلے جوتا اترا' پھر کوٹ اترا' پھر بیلٹ اتری' پھر کمپیوٹر نکالا گیا' پھر والٹ' گھڑی' موبائیل' چابیاں' سکے' عینک۔ یہ تمام اشیاء کیمرے کی آنکھ سے گذریں اور ہمیں بھی ایک سیکورٹی گیٹ کے سامنے کھڑا کر کے تصویر بنائی گئی۔ عافیت ہی تھی کہ کوئی قابلِ اعتراض شے برآمد نہ ہوئی۔ ہاں اگر کوئی کیمرہ دل پہ لکھے شکایت بھرے الفاظ پڑھ سکتا تو ہم یقیناً دھر لئے جاتے۔ ''دل' دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہُو''۔ تنکا تنکا سارا سامان پھر سے جمع کیا اور مقررہ گیٹ کے سامنے پڑی کرسیوں پہ جا بیٹھے۔ انتظار ہونے لگا کہ کب پرواز کا اعلان ہو اور ہم جہاز پہ اپنی نشست سنبھالیں۔ جہاز کی روانگی عین وقت پہ ہوئی۔

2.4۔ ایک اور سفر

واشنگٹن سے لاس اینجلس تک کا سفر چھ گھنٹوں پہ محیط تھا۔ جہاز میں بیٹھ کر علم ہوا کہ ان چھ گھنٹوں میں کھانے پینے' ناشتہ یا لنچ کا کوئی اہتمام نہ ہوگا۔ اگر کسی کو بھوک لگے تو وہ فضائی میزبان کو بلائے' کریڈٹ کارڈ پیش کرے' اور جو چاہے کھانے کے لئے خرید لے۔ ایئر لائین کھانے پینے کی کوئی شے مفت نہ دے گی۔ ہم پی آئی اے کو برا کہتے ہیں لیکن یہ کاروباری اور روکھا انداز پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ میں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ یورپین' ہسپانوی' سیاہ فام' ایشیائی۔ ہر رنگ اور نسل کے لوگ بیٹھے نظر آئے۔ کچھ بہترین لباس میں' کچھ عام سی جین پہنے ہوئے۔ ایک طرف دس بارہ عجیب سے لوگوں کا ایک گروہ براجمان تھا۔ رنگین کپڑے' نسوانی انداز' میک اپ۔ شاید یہ ہیجڑے تھے۔ امریکہ کی کئی ایک ریاستوں میں ہم جنس پرستوں کے درمیان شادی کو قانون کا تحفظ حاصل ہے۔ صرف واشنگٹن میں پانچ ہزار ایسے شادی شدہ جوڑے ہیں جن کا تعلق ایک ہی جنس سے ہے۔ انہیں اکٹھے رہنے کیلئے عدالت باقاعدہ اجازت نامہ جاری کرتی ہے۔ یہ پانچ ہزار شادی شدہ جوڑے اور دیگر ہم جنس پرست جب اپنے حقوق کیلئے جلسہ جلوس کا اہتمام کرتے ہیں تو ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ میرے ساتھ کی نشست پہ ایک انتہائی عمر رسیدہ شخص براجمان تھا۔ بڑھاپے کے باوجود قویٰ مضمحل

نہ ہوئے تھے۔اس نے ان لوگوں کو دیکھا تو اپنا سر پیٹنے لگا۔شاید اسے یہ چلن پسند نہ آیا۔سارا راستہ وہ انہیں بُرا بھلا کہتا اور کمپیوٹر پر ایک ناول پڑھتا رہا۔ چند صفحوں کے بعد کمپیوٹر سے نظریں ہٹاتا اور فضا میں تکنے لگتا۔ تحریر سے لذت اٹھانے کا یہ ایک منفرد انداز تھا۔ ہر لفظ یادوں کے کسی دبستان میں کھلتا ہوگا۔ اس نے اپنے بیگ سے چند بسکٹ نکالے اور دو بسکٹ مجھے پیش کئے۔ یہ ایک غیر معمولی سی بات تھی۔ مجھے لگا امریکہ میں ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ایئر لائین کی بے رخی کا گلہ جاتا رہا۔اس شخص کی وضعداری متاثر کن تھی۔ دو بار ٹائلٹ جانے کے لئے اٹھا لیکن دس بار اس زحمت پہ معذرت خواہ ہوا۔اس کے لہجہ کی شائستگی ادب سے محبت کا تحفہ تھا۔ اچھی کتابیں بہت کچھ سکھاتی ہیں۔تہذیب بھی اور تحمل بھی۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے اکثر کتابوں سے ہی دل بہلا رہے تھے۔میرے پاس کوئی کتاب نہ تھی لیکن ایک کتاب ہمیشہ پہلو میں رہتی ہے۔ جونہی میں نے سیٹ کی پشت پر سر رکھا اخوت کی کتاب کے ورق کھلنے لگے۔اس کتاب کا ایک باب خواجہ سراؤں کے بارے میں بھی ہے۔ بیمار اور بوڑھے خواجہ سراؤں کی مدد کا ایک منفرد قدم جو اخوت نے اٹھایا۔

2.5۔خواجہ سرا

خواجہ سرا؟
یہ کون لوگ ہیں؟ کیا ان کا زندگی پہ کوئی حق نہیں
کوئی ستارا٬ جوان کے لئے چمک اٹھے
کوئی دِیا٬ جوان کے نام پہ جلنے لگے
کوئی ایسا خواب جس کی تعبیر ان کے آنگن میں اترے اور انہیں ہمیشہ کے لئے پرسکون کر دے۔لیکن یہ تحقیر اور تمسخر کا شکار ہیں۔راندۂ درگاہ۔مفلس وقلاش۔بے گھر۔بے نشان۔لوگ انہیں ''ہیجڑا'' کہتے ہیں اور اگر کوئی مہربان ہو بھی جائے تو ''خواجہ سرا'' کا لقب ملتا ہے۔غربت کیا ہے؟ دولت کا نہ ہونا٬ علم کا نہ ہونا٬ روزگار کا نہ ہونا٬ گھر بار یا دوست احباب کا نہ ہونا۔اگر یہ سب غربت ہے تو ان کے پاس تو اس میں سے کوئی بھی شے نہیں۔ان سے بڑھ کر اور کون غریب ہوگا۔

نہ کسی ہاتھ کا لمس٬ نہ کسی آنکھ کا نور٬ نہ کسی دل کی دھڑکن۔ پھول کی طرح نازک اور خوشبو کی طرح پریشان۔

ایک خواجہ سرا نے مجھے کہا۔ہم نے کبھی چوری نہیں کی' ڈکیتی نہیں کی'قتل نہیں کیا' کسی کو اغوا نہیں کیا' کسی مسجد کو نہیں جلایا' کسی گرجا گھر کو آگ نہیں لگائی۔ پھر بھی ہمارے دامن میں حقارت کے کانٹے بکھیرے جاتے ہیں۔قانون ہمیں انسان نہیں سمجھتا۔ظلم وحوادث کے یہ تھپیڑے۔ بے بسی کے یہ بھنور۔ ہم کہاں پناہ لیں۔ میں نے ایک خواجہ سرا سے پوچھا۔تمہارے پاس جوتوں کے کتنے جوڑے ہیں۔ وہ زہر خند ہنسی سے بولا:''ایک وقت میں صرف ایک اور وہ بھی قینچی چپل۔ جب گھسٹ' گھسٹ کے وہ کھجور کے پتوں کی طرح باریک ہو جاتی ہے تو کہیں سے ایک اور مانگ لیتا ہوں۔ میں نے آج تک بنیان نہیں خریدی۔آج تک جراب نہیں پہنی۔ بدن پر صرف دو کپڑے ہیں۔ پھٹ جاتے ہیں تو اور مانگ لیتے ہیں۔ مجھے شوگر ہے۔ مجھے ہیپا ٹائیٹس ہے۔ مجھے بلڈ پریشر ہے۔میرے لئے کوئی دوا نہیں۔کوئی ڈاکٹر نہیں۔کوئی ہسپتال نہیں۔ہم ہر وقت زمانہ کی ٹھوکریں سہتے ہیں۔کھسرے' ہیجڑے' زنانے' خواجہ سرا ہمارے کئی نام ہیں لیکن کہانی ایک ہی ہے''۔اخوت کے ذریعے ہم اب تک سیکڑوں خواجہ سراؤں کی مدد کر چکے ہیں۔ میں نے جب ایک بار ایک خواجہ سرا کے گرد آلود پاؤں کو گود میں رکھ کر اس کا زخم دھونے کی کوشش کی تو مجھے لگا میں نے سب سے بڑی نیکی کی ہے۔''اخوت خواجہ سرا' بحالی پروگرام''ان خواجہ سراؤں کے لئے ہے جن کی عمر پچاس سال سے زائد ہے اور جن کے مقدر میں بھوک' بیماری اور ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں۔ہم ہر ماہ انہیں اپنے پاس بلاتے ہیں۔ان کا علاج کرتے ہیں۔انہیں کھانا کھلاتے ہیں۔جی بھر کے باتیں کرتے ہیں اور جانے سے پہلے تھوڑا سا جیب خرچ پیش کرتے ہیں۔ یہ تقریب ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں ہوتی ہے۔اب تک سیکڑوں خواجہ سرا رجسٹر ہو چکے ہیں۔ان سب کا کہنا ہے کہ ہم سارا مہینہ اس انتظار میں گذارتے ہیں کہ''کب اگلے مہینے کا پہلا ہفتہ آئے اور ہم اخوت والوں سے ملیں۔اس روز ہمیں ایسے لگتا ہے جیسے ہم اپنے گھر جا رہے ہوں۔ بہن' بھائیوں یا ماں' باپ کے پاس۔ہمیں کسی نے زندگی میں اتنی محبت سے دعوت نہیں دی ۔بلال' صائمہ' عائشہ' روبی' عاصم' جمرود' سلیم' زرین' روبینہ اور فاطمہ رشید۔ یہ سب لوگ جب ہماری راہ میں اپنا دل بچھاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہم اکیلے نہیں''۔ بلال اور صائمہ نے واقعتاً ان کی راہ میں دل بچھا دیئے اور خدمت کا ایک نیا باب لکھ دیا۔

گوگی' نیلم' سپنا' بندیا' رانی' مٹھو' چاندنی' بوبی' مالا' شمع۔ان سب نے ایک بار مجھے اپنے ملک گیر کنونشن میں بلایا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جو محبت دیکھی وہ حیران کر گئی۔گوگی نے کہا:''ہم پیدا ہوتے ہیں تو نفرت

کا نشانہ بننے لگتے ہیں۔ ماں، باپ۔ بہن، بھائی۔ ہمیں دنیا کے رحم وکرم پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارا گاناسن کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی کوئی ڈھولک یا گھنگھرو ہیں۔ دل کا یہ آبگینہ ہر روز ٹوٹتا ہے۔ آج تک ہمیں کسی نے سکول نہیں بھیجا۔ ہمیں وراثت میں حصہ نہیں دیا۔ اس بے بسی میں اگر کوئی صرف ہنس کے بات بھی کر لے تو اس کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے"۔ مٹھو کہنے لگی......"آپ نے ہمیں سکھی کر دیا" اور اس کے بعد وہ میرے گلے لگ کر اس طرح روئی جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ہو۔ صرف لاہور میں پچاس سال کی عمر سے زائد کئی ہزار خواجہ سرا بھوک، بیماری اور بڑھاپے کا شکار ہیں۔ وہ منتظر ہیں کہ کوئی محبت بھرا ہاتھ ان کی طرف بڑھے اور کہے کہ آج سے تمہارے دکھ میرے بھی ہیں۔

"اخوت خواجہ سرا بحالی پروگرام آپ ہی کیلئے تو ہے۔ یہ ایک دن آپ کی بہبود کا بہت بڑا پروگرام بنے گا"۔ جب میں نے یہ بات کہی تو ان سب کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھنے لگے۔ مجھے لگا یہی وہ دعا ہے جو حدِ افلاک کو چیرتی ہوئی عرش بریں پہ جا کے دم لیتی ہے۔

یہ کون لوگ ہیں۔
کیا ان کا زندگی پر کوئی حق نہیں۔
صحنِ فلک پہ کوئی ستارا جوان کیلئے چمک اٹھے۔
پیار کی کوئی آواز جوان کے کانوں میں گھل جائے۔
مجھے لگا زندگی پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے۔
گوگی، نیلم، سپنا، بندیا، رانی............

اخوت کی اصل منزل ایک ایسے معاشرہ کے قیام میں مدد دینا ہے جہاں ہر شخص کو بلا امتیاز آگے بڑھنے کا موقعہ مل سکے۔ اس کا مقصد قرضے دینا نہیں سہارا بننا ہے۔ کاروبار کرنا نہیں ایثار کرنا ہے۔

میں نے ایک نظر جہاز میں بیٹھے خواجہ سراؤں کو دیکھا۔ یہ اس نفرت کا نشانہ نہیں بنتے جس کا مظاہرہ ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

2.6 ۔میک اے ڈریم

جہاز اڑتا رہا۔ پہلو میں کھلی کتاب کے ورق پھڑ پھڑاتے رہے۔

خواجہ سرا بحالی پروگرام جیسے ایک اور پروگرام کا نام میک اے ڈریم ہے۔اس پروگرام کا مقصدان بچوں کی زندگی میں خوشیاں بکھیرنا ہے جن کے زندہ رہنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوں۔

گلشنِ حیات کے وہ معصوم پھول جن کی عمر محض چند دن ہے۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ بچے جن بیماریوں کا شکار ہیں ان کا علاج دریافت نہیں ہوا۔ بلڈ کینسر‘ تھیلے سیمیا‘ لمفو ما۔ ان کے والدین انہیں موت کی گہری دلدل میں گرتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔ ہر پل‘ ہر ساعت۔ بے بسی کے ساتھ۔ان کے اختیار میں کچھ نہیں۔ بس چند آنسو‘ چند آہیں اور بے بسی۔امریکہ میں ''میک اے وش'' نامی ایک ادارہ مہلک بیماریوں کے شکار ایسے بچوں کی آخری خواہشیں پوری کرتا ہے۔ ایسی خواہش جو وہ موت کے منہ میں جانے سے پہلے کرتے ہیں۔ اخوت نے بھی ایک ایسا ذیلی ادارہ بنایا اور اس کا نام ''میک اے ڈریم'' رکھا۔جن بچوں کی زندگی کے محض چند ہفتے یا چند ماہ بقایا ہوں یہ ادارہ انکی کوئی ایسی خواہش پورا کرتا ہے جس کے بعد ان کی زندگی کے بقیہ دن خوشی کی کیفیت میں گذر جائیں۔ایک بچے سے‘ جس کے بارے میں ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اس کی شمع حیات بجھنے کو ہے‘ پوچھا گیا کہ اس کا کوئی ایسا خواب جو وہ پورا نہ کر سکا۔اس نے کہا: ''میں نے آج تک جہاز کا سفر نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ اندر سے کیسا لگتا ہے''۔

اخوت کی ٹیم نے ایک پائلٹ ڈھونڈا جس نے ہامی بھر لی کہ وہ اس بچے کو اپنے ساتھ جہاز میں لے کے جائے گا۔ لاہور سے اسلام آباد اور پھر واپس۔ کاک پٹ میں بٹھا کر۔اسے لگے گا جیسے یہ جہاز وہی چلا رہا ہے۔سارے انتظامات مکمل ہوئے‘ ٹکٹ خریدا گیا۔ نئے کپڑے‘ نئے جوتے‘ نیا بیگ۔لیکن جس روز یہ یادگار سفر ہونا تھا اس سے عین ایک رات پہلے وہ بچہ کسی اور سفر پہ روانہ ہو گیا۔موت نے مہلت ہی نہ دی کہ ہم اسے ایئر پورٹ لے کے جاتے۔الوداع کہتے اور وہ جہاز کی سیر کر پاتا۔بچوں کی ایسی ہی سیکڑوں معصوم خواہشیں۔کچھ پوری ہو گئیں‘ کچھ تشنۂ تکمیل رہیں۔

ایک بچے نے کہا: ''میں پاکستان کی فوج کے سپہ سالار سے ملنا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر عصمت لغاری نے جگہ جگہ دستک دی۔ جب کسی نے ہامی نہ بھری تو اس نے سپہ سالار کو ایک خط لکھا کہ

یہ بچہ جو چند روز کا مہمان ہے آپ سے ملنا چاہتا ہے۔اس خط کا جواب کیوں نہ آتا۔کور کمانڈر' ملتان کی ڈیوٹی لگی کہ وہ ایک دن اس بچے کے ساتھ گذاریں۔ بچے کو بصد اہتمام کور ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا۔سلامی دی گئی۔ جنرل نے خود گاڑی چلائی۔ بچہ اگلی سیٹ پہ بیٹھا اور فوج کی ایک تقریب میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوا۔

ایک بچے نے کہا: ''میں نے آج تک کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی۔کیا آپ میری سالگرہ منائیں گے؟'' اخوت کے رضا کاروں نے سارے ہسپتال کے ساتھ مل کے اس کی سالگرہ منائی۔غبارے' جھنڈیاں' آرائش' کیک' چائے اور پھر ہیپی برتھ ڈے کے نعرے۔اگلے چند روز وہ بچہ اس تقریب کے سحر میں گرفتار رہا۔اچھلتا' کودتا' بھاگتا' دوڑتا اور پھر ہنستے' ہنستے دنیا سے رخصت ہو گیا۔وہ تحفے جو اسے اس روز ملے اس کے بستر پہ بکھرے رہ گئے۔ریموٹ کنٹرول کار' موبائیل فون اور چھوٹا سا کیمرہ۔اس کی ماں کا کہنا تھا کہ ''جب وہ دنیا سے رخصت ہوا اس کے چہرے پہ لازوال مسکراہٹ تھی۔یہ مسکراہٹ اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھی''۔میک اے ڈریم نے موت کو تو نہیں ٹالا لیکن موت کا سفر آسان ہو گیا۔غریبوں کی خواہشیں بھی تو غریب ہوتی ہیں۔

ایک بچی نے کہا: ''میں نے زندگی میں کبھی گڑیا نہیں خریدی۔''

ایک نے کہا: ''میں نے آج تک آئس کریم نہیں کھائی۔''

ایک نے کہا: ''میں مینارِ پاکستان کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

ایک نے کہا: ''مجھے کیمرہ لینا ہے۔''

یہ گڑیا' یہ آئس کریم' مینارِ پاکستان کی سیر اور یہ کیمرہ۔ جب یہ خواہشیں پوری ہوئیں تو انہیں یوں لگا جیسے دنیا بھر کے خزانے مل گئے ہوں۔اب تک کئی سو بچوں کی آخری خواہشیں پوری ہو چکی ہیں۔ان میں سے نصف سے زیادہ بچے اب اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی تصویریں ہمارے پاس ہیں۔ان تصویروں میں وہ اپنے تحفوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔گلشنِ حیات کے یہ معصوم پھول جو صرف چند دن لے کے دنیا میں آئے۔

جہاز اڑتا رہا۔کتاب کے ورق پھڑ پھڑاتے رہے۔

2.7۔حیاتِ مستعار

میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا وہی بوڑھا شخص حسبِ عادت تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کمپیوٹر سے نظر اٹھاتا اور مسکرانے لگتا۔اس بار میں بھی اس کی مسکراہٹ میں شریک تھا۔میرے سامنے وہ بیسیوں بچے تھے جو ہنستے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔میک اے ڈریم کے نام سے اس سارے کام کو اخوت نے رضا کاروں کی مدد سے منظّم کیا گیا۔سکول اور کالج کے بچوں نے جب ہم سے پوچھا کہ ''ہم اخوت کے ساتھ تعاون کیسے کر سکتے ہیں''تو ڈاکٹر عصمت نے کہا ''تم بھی ایسے ہی کسی بیمار بچے کو اپنا دوست بنالو۔یہی تمہاری مؤاخات ہے''۔انہوں نے ایسا ہی کیا۔مواٗخات کا یہ بہترین اظہار تھا۔غریب اور امیر بچے۔ہم سفر۔ہم قدم۔زندگی اور موت پہ تو کسی کا اختیار نہیں لیکن کچھ عرصہ بعد جب یہ خبر ملتی ہے کہ کوئی بچہ ہمیں چھوڑ کے چل بسا تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی اپنا عزیز چل بسا ہو۔ان بچوں کو اپنانا بہت رُلا دینے والا کام ہے۔ڈاکٹر عصمت لغاری‘ روبی دانیال‘ سدرہ۔یہ بہت بہادر لوگ ہیں جنھوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔لاہور کے کئی ہسپتالوں میں میک اے ڈریم کے رضا کار گھومتے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں وہ تحفے ہوتے ہیں جو ان معصوم بچوں کے خواب تھے۔گڑیا‘ ریموٹ کنٹرول کار‘ لیپ ٹاپ‘ کیمرہ............اخوت کی ٹیم اور یہ رضا کار مسکراتے ہوئے‘ ان بچوں کو ڈھونڈتے ہیں جو گلشنِ حیات کے پھول ہیں لیکن جن کی عمر محض چند دن ہے۔

حیات کے بہتے ہوئے دھارے میں چند دن کم ہوں یا زیادہ‘ اس کی اہمیت نہیں۔اہمیت تو اس بات کی ہے کہ یہ دن بسر کیسے ہوئے۔گوگی‘ نیلم‘ سپنا‘ بندیا‘ رانی............اور پھر ارشد‘ احمد‘ دانیال‘ سلمیٰ‘ شیریں............میرا بوڑھا ہم سفر کتاب پڑھتا رہا۔میرے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ان درد بھری کہانیوں سے اچھی کتاب اور کون سی ہوگی۔

2.8۔لاس اینجلس

چھ گھنٹے کا طویل سفر بالآخر اپنے اختتام کو پہنچا۔جہاز لاس اینجلس ایئرپورٹ پہ اترا۔مسافر سامان اٹھانے لگے۔باہر نکلنے کی اتنی ہی جلدی جو ہمارے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ہم بھی اسی کشتی بلکہ جہاز میں سوار تھے۔جلدی جلدی کیبن سے نکلے اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے سامان لینا تھا۔کچھ ہی دیر میں سامان آ گیا اور ہم بیگ گھسیٹتے ہوئے باہر نکل آئے۔کیلی فورنیا کی خوشگوار ہوا کا پہلا جھونکا ہی جانفزا تھا۔یہ اسی خوبصورت موسم کا کمال ہے کہ ساری

دنیا یہاں کھنچی چلی آتی ہے۔قدرت نے جوخزانے یہاں لٹائے ان پرانسان نے اپنی محنت سے دلکش نقوش بنا دیئے۔یہی کیلی فورنیا کی کشش یہی اس کی خوبصورتی ہے۔میں پورچ میں کھڑا دائیں اور بائیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک اعزاز نے ہاتھ لہرایا۔ڈرائیور نے جلدی سے سامان پکڑا اور ہم گاڑی میں بیٹھے ایئر پورٹ کی حدود سے باہرنکل آئے۔بوڑھا ہم سفر بھی پیچھے رہ گیا۔بیمار خواجہ سرا بھی اور معصوم بچے بھی۔

لاس اینجلس امریکہ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ 1994 کے بعد میرا اس شہر کا تیسرا وزٹ تھا۔لاس اینجلس کو عام طور پر ''ایل اے'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔1781 میں جب اس شہر کی بنیاد رکھی گئی تو یہ سپین کی ملکیت تھا۔اس کے بعد میکسیکو کا حصہ بنا اور 1848 میں اس پورے علاقے اور کیلی فورنیا ریاست کو امریکہ نے خرید لیا۔گویا یہ شہر بھی ان بستیوں میں سے ہے جسے اہل نظر آباد کرتے ہیں اور اہلِ زر خرید لیتے ہیں۔ نظر اور زر کی یہ کشمکش بہت قدیم ہے۔

لاس اینجلس بزنس، کلچر،فلم، آرٹ،فیشن اور ٹیکنالوجی کا ایک عظیم مرکز ہے۔دنیا کے امیر ترین شہروں کی فہرست میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔ہالی وڈ کی وجہ سے ایل اے کو Entertainment Capital of the World بھی کہا جاتا ہے۔فلم سے متعلقہ دنیا کی اکثر نامور شخصیات یہیں رہتی ہیں۔1821 میں اس شہر کی آبادی صرف ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی جو 1900 میں بڑھ کر ایک لاکھ ہوگئی اور آج اس شہر میں ایک کروڑ تیس لاکھ کے قریب لوگ بستے ہیں۔1876 میں یہاں ریل آئی اور 1892 میں تیل دریافت ہوا۔پھر آہستہ آہستہ ہالی وڈ نے قبضہ کرلیا۔لاس اینجلس قدرتی مناظر کا شاہکار ہے۔یہاں پہاڑ بھی ہیں، میدان اور سمندر بھی۔چوالیس میل لمبے اور تیس میل چوڑے اس شہر میں نیو یارک کی طرح Sky Scrappers نظر نہیں آتے کیونکہ زلزلوں کی وجہ سے یہاں بلند و بالا عمارتیں بنانے پر پابندی عائد ہے۔یہاں کے لوگ آرٹ اور فن سے محبت کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسے Creative Capital of the World بھی کہا جاتا ہے۔انسانی تاریخ میں آج تک کسی ایک شہر میں اتنے فنکار، ادیب، رقاص اور موسیقار جمع نہیں ہوئے جتنے اس شہر میں رہائش پذیر ہیں۔شاید روم اور ایتھنز میں کبھی یہ منظر نظر آیا ہو۔کچھ لوگ لاس اینجلس کو حسنِ تخلیق کا گہوارہ بھی کہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ آپ اس تخلیقی حسن کے گرویدہ بھی ہوں۔عریانی، فحاشی، بے راہ روی، مادیت پسندی، جنسی تلذز......آپ کئی طرح

کے الزامات بھی عائد کر سکتے ہیں۔لیکن اس امر سے انکار نہیں کہ یہ جگہ فن کا خزانہ ہے۔شہر بھر میں موجود ساڑھے آٹھ سو آرٹ گیلریز اور عجائب گھر اس کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ گیلریاں خونِ جگر سے مزین ہیں۔ امریکہ میں نیویارک کے بعد سب سے زیادہ یہودی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ یہودی وہیں بستے ہیں جہاں دولت بستی ہے۔ 1923 میں یہودیوں نے اس شہر میں اپنی سب سے بڑی عبادت گاہ بنائی لیکن اب اس عبادت گاہ کو میوزیم اور کمیونٹی سنٹر میں بدل دیا گیا ہے۔عبادت گاہیں عجائب گھر وں میں تبدیل ہونے لگیں تو اقدار کا مٹنا ٹھہر جاتا ہے۔ دنیا کی تگ و دو میں خدا کہیں پیچھے رہ گیا۔ میں نے یہ بات اپنے ایک دوست کو بتائی تو اسکا کہنا تھا کہ ہالی وڈ بہت ظالم جگہ ہے۔ یہاں خدا کو عجائب گھر میں بھی جگہ مل جائے تو غنیمت ہے۔دولت کی ریل پیل دیکھ کے کھلا کہ یہاں دولت ہی خدا ہے۔ سارا شہر اسی کی پوجا کرتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ بدھ مت، ہندو مت، زرتشت، بہائی، سکھ، ہر مذہب کے لوگ اور ان کی عبادت گاہیں یہاں موجود ہیں۔مسلمانوں کی ایک بھاری اکثریت بھی یہاں آباد ہے لیکن حتمی اعداد و شمار موجود نہیں۔اپنی اقدار کے حوالے سے مسلمان ابھی تک اپنا الگ تشخص قائم رکھے ہوئے ہیں۔لیکن بھلا کب تک؟

ٹوکیو اور نیویارک کے بعد ایل اے دنیا کا سب سے بڑا کاروباری مرکز بھی ہے۔ دنیا کی چند بہترین یونیورسٹیاں بھی یہاں پر ہیں لیکن یہ Ivy League کی تمکنت اور جاہ و جلال سے پیچھے ہیں۔سو کے لگ بھگ پبلک لائبریریاں۔ہالی وڈ کی بے باک فضا پہ تو اعتراض کی گنجائش نکلتی ہے لیکن لائبریریوں پہ کون نکتہ چین ہو سکتا ہے۔فلمی دنیا کی چکا چوند بے شک مرعوب کرے نہ کرے ان کتابوں کی روشنی ضرور مرعوب کرتی ہے۔

اعزاز نے بتایا کہ لاس اینجلس میں ایک سو چوالیس ممالک کے لوگ رہتے ہیں جو سوا دو سو سے زائد زبانیں بولتے ہیں۔سفید فام انچاس فیصد اور دیگر اقوام کے لوگ تقریباً اکیاون فیصد ہیں۔ گویا یہ ایک شہر نہیں پوری دنیا ہے۔اس دنیا میں کرائم بھی بہت منظّم انداز میں ہوتا ہے۔مجرموں کے چھوٹے بڑے ساڑھے چار سو سے زائد گینگ ہیں جن کی وجہ سے اس شہر کو Gang Capital of America بھی کہا جاتا ہے............لاس اینجلس مجھے اچھا لگا۔اس لیے بھی کہ اس کو پاکستان کے ایک شہر فیصل آباد سے خصوصی نسبت ہے۔2009 میں دونوں شہروں کو جڑواں شہر یا Sister Cities قرار دیا گیا تھا۔

2.9۔اعزاز کے گھر میں

ہمارے میزبان اعزاز کا گھر ایک خوبصورت سی آبادی میں تھا۔کئی سال سے یہ گھر پاکستان قونصلیٹ کے قبضہ میں ہے۔اعزاز سے پہلے شاہداشرف تارڑ اور طارق باجوہ یہاں مقیم رہے۔شاہد بے حد عزیز دوست اور سول سروس میں میرے رفیق کار جبکہ طارق باجوہ دوست بھی ہیں اور ہم سے سینئیر بھی۔دونوں انتہائی دیانت دار' لائق اور ہر دلعزیز۔کیلی فورنیا کی پاکستانی کمیونٹی ان دونوں کو ابھی تک یاد کرتی ہے۔سول سروس میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں لیکن بیوروکریسی کا اچھا یا برا ہونا سیاسی قیادت کی اچھائی یا برائی پر بھی منحصر ہے۔ کبھی یہ ادارہ آہنی فصیل کی طرح مضبوط ہوتا ہے اور کبھی کبھی ریت کی دیوار کی طرح کمزور و ناتواں' جسے سیاست' نااہلی اور بددیانتی کے تھپیڑے دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس کر دیتے ہیں۔انگریز نے اسے راج کا ''سٹیل فریم'' کہا اور ہم نے اسے دیوارِ گریہ بنا دیا۔گھر میں داخل ہوئے' سامان رکھا۔گھر کی ترتیب سے اس امر کا اندازہ ہو رہا تھا کہ اعزاز نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ بقول شخصے''وہ ابھی اس اعزاز سے محروم ہے جسے عرفِ عام میں بیوی کہا جاتا ہے''۔کیلی فورنیا میں اس کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ ابھی تک اکیلا ہے۔منہ ہاتھ دھوتے ہی لنچ کی دعوت ملی۔ یہ لنچ گھر میں تو ہو نہیں سکتا تھا۔ باہر ہی جانا تھا۔اعزاز ہمیں قریب ہی واقع ایک ایسے بازار میں لے آیا جہاں جشنِ نوروز کے بینرز لگے ہوئے تھے۔دوکانوں پر اردو میں لکھی ہوئی تحریریں۔ابھی میری حیرت برقرار تھی کہ اندازہ ہوا یہ اردو نہیں فارسی ہے اور ہم اس علاقے میں ہیں جہاں ایرانی نژاد لوگوں کی اکثریت ہے۔یہ لوگ زیادہ تر اس وقت یہاں آئے جب ایران میں اسلامی انقلاب نے قدم بڑھانا شروع کئے۔اس وقت بھی یہ شاہ کے پرستار تھے اور آج بھی ان کی ہمدردیاں آنجہانی شاہِ ایران کے ساتھ ہیں۔ رضا شاہ پہلوی کے بچے اور اہلِ خانہ بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔بادشاہت تو ایک عرصہ ہوا ساتھ چھوڑ گئی' دولت البتہ اب بھی ان کے پاس ہے۔شطرنج کی بساط پہ ایران کبھی امریکہ کا بہترین مہرہ تھا۔اب یہ اسے کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ہم ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ حلال کھانا دستیاب ہو سکتا تھا۔خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔امریکی ایئرلائین میں کھانا نہ ملنے کی کمی بھی یہیں پوری ہوئی۔اعزاز کی گفتگو میں وہی پرانی خوشبو تھی۔ ہماری دوستی کا آغاز 1999 میں اس وقت ہوا جب میں چیف سیکرٹری' پنجاب کے ساتھ کام کرتا تھا۔یہ ایک اہم ذمہ داری تھی۔صوبہ کے تمام سینئر افسران' چیف سیکریٹری سے ملنے سے پہلے ہمارے ہی دفتر

میں براجمان ہوتے۔ان دنوں اعزاز کی سروس کا آغاز تھااور وہ اپنی پہلی پوسٹنگ کا منتظر۔وہ ساری گذری ہوئی باتیں' یوں لگا جیسے وہ سب کچھ کل کی بات ہو۔کھانا ختم ہوااور ہم ہوٹل سے باہر نکلے۔اعزاز نے مجھے گھر ڈراپ کیااور خود دفتر جانے کے لئے واپس مڑنے لگا۔آج شام اس نے گھر میں ایک ڈنر کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں اخوت یو۔ایس۔اے کے تمام ٹرسٹیز مدعو تھے۔میں گھر میں داخل ہوااور کچھ دیر آرام کے بعد کمپیوٹر کھول کر نئی ای میلز کے جواب دینے میں مصروف ہو گیا۔مجنوں کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے زندگی میں اور تو کچھ نہ کیا البتہ لڑکوں کے لئے ایک کھیل ایجاد کر گیا جس کا نام اس نے عشق رکھا۔ایسا ہی ایک کھیل کمپیوٹر بھی ہے جو بھی اس سے متعارف ہوا بس اسی کا ہو کے رہ گیا۔

2.10۔ایک خوبصورت ڈنر

کچھ دیر کمپیوٹر پہ کام کرنے اور کچھ دیر آرام میں گذر گئی۔کیلی فورنیا کا خوشگوار موسم قدرت کا حسین تحفہ ہے۔امریکہ کے مشرقی ساحل پر برف کی گہری چادر بچھی رہتی ہے لیکن یہاں اعتدال اور توازن ہے۔اتنے میں اعزاز بھی پہنچ گیا۔اس کے آتے ہی گھر میں رونق سی آ گئی۔ڈنر کے مہمان بھی ایک' ایک کر کے پہنچنے لگے۔یہ ویک اینڈ نہیں تھا اور نہ ہی یہ مہمان قریب رہتے تھے۔امریکہ میں چھٹی کے سوا کسی بھی روز لوگوں کا ڈنر پہ آنا اچھے خاصے تردد کا باعث بنتا ہے۔یہ اعزاز کی محبت تھی کہ اپنی اپنی مصروفیت کے باوجود وہ لوگ یہاں آنے پہ آمادہ ہو گئے۔سنی پنوار' صغیر سپال' فاروق عزیز' فیصل جمیل۔محترمہ زہرہ جمیل اور فائزہ بھٹی شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے نہ پہنچ سکیں۔یہ سب لوگ ایک مدت سے لاس اینجلس میں مقیم ہیں۔ایک ہی جیسا عزم لیے یہ لوگ یہاں پہنچے۔آگے بڑھنے کی جستجو' نئی دنیا کی تلاش اور کچھ کر گذرنے کی دھن۔امریکہ آنے والا ہر شخص اپنے دامن میں یہی متاع لے کے یہاں پہنچتا ہے۔صغیر سپال کا تعلق سیالکوٹ سے ہے اور یہ کھیلوں کے سامان کا بزنس کرتے ہیں۔سنی پنوار' حیدرآباد سندھ کے رہنے والے ہیں اور دو دہائیاں قبل امریکہ پہنچے تھے۔فاروق عزیز ساہیوال سے اور فیصل جمیل کا تعلق لاہور سے ہے۔ان سب کا شمار سیلف میڈ افراد میں ہوتا ہے۔مجھے ان کے اخلاص اور بے تکلفی نے بہت متاثر کیا۔ان کی سوچ ایک آزاد ملک کے شہریوں کی سوچ تھی۔پاکستان کے نام سے ان کے چہرے پہ مسرت سی پھیل گئی۔لاہور' سیالکوٹ' ساہیوال اور سندھ۔وطن کی مہک نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔پاکستان میں حالات کی سنگینی ان سب

کیلئے باعثِ تشویش تھی۔ وہ اپنے کرب کا اظہار بھی کرتے رہے۔ ''ہم تو ایک خوبصورت ملک چھوڑ کے آئے تھے۔ یہ وہاں کیا ہو رہا ہے''۔...... ''ہم آگے کی بجائے پیچھے کیوں جا رہے ہیں''۔...... ''یہ بدامنی کیوں ہے''۔...... ''بجلی کا بحران کب ختم ہوگا''۔...... ''ادارے کمزور کیوں ہو رہے ہیں''۔...... ''ہم انتہا پسند کب تھے...... مساجد اور درسگاہوں میں خودکش حملے''...... ''ہم ایک دوسرے کا گلا کیوں کاٹ رہے ہیں''۔ ''یہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری۔ یہ ہمیں کہاں لے جائے گی''۔...... یہ اور اس طرح کے بہت سے تند و تیز سوال۔ لیکن ہر سوال میں دردمندی کی ایک لہر سی تھی۔ یہ ایک ایسا شکوہ تھا جس میں اصلاحِ احوال کی خواہش نظر آتی ہے۔ میں ان سوالوں کے کیا جواب دیتا۔ ان سوالوں کے جواب انہیں بھی معلوم تھے۔ ٹی۔ وی چینلز کے ذریعے انہیں ہر پل کی خبر ملتی رہتی ہے۔ میں نے مقدور بھر وضاحتیں پیش کیں۔ کچھ اندرونی وجوہات' کچھ بیرونی۔ الزام بہرحال خود پر ہی آیا۔ دنیا میں اگر کوئی فرد ترقی کرنا چاہے تو کون ہے جو اسے روک سکے۔ یہ اصول افراد پر ہی نہیں اقوام پر بھی صادق آتا ہے۔ قدرت تو ہر اس شخص اور قوم کو نوازتی ہے جو کچھ کر دکھانے کی دھن میں مگن ہو۔ افسوس ہم خود ہی شوقِ سفر سے محروم ہیں۔ میں نے انہیں مثبت پہلو دکھانے کی کوشش بھی کی۔ ''سب برا نہیں۔ مایوسی کے اس افق پر امید کے کچھ دیئے بھی ہیں''۔ میری بات سن کر وہ سب مسکرائے۔ وہ سمجھ گئے کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ یوں گفتگو کا رخ اخوت کی طرف مڑنے لگا۔

2.11۔ غربت کیا ہے؟

اخوت کی کہانی دل پہ اثر کرتی ہے۔ میں نے جب بات شروع کی تو وہ لوگ متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ مضطرب سی کیفیت جس کا اظہار شروع میں ہوا دب سی گئی۔ کیا ایسے بھی ہوتا ہے۔ لوگ حیرت سے پوچھ رہے تھے۔ ان کا اعتماد واپس آنے لگا۔ امید سے بڑی شے اور کیا ہوگی۔ امید کا دامن پھیلتا ہے تو سارے افق کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ میں نے جب اپنی بات مکمل کر لی تو ان سے کہا اب آپ کی باری ہے۔ سوال کریں کیونکہ سوالوں سے ہی بہت سی باتوں کی وضاحت ہو سکے گی۔ وہ اس کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ پہلے تو میرے بارے میں پوچھا گیا۔ تعلیم' پیشہ' ذریعہ معاش وغیرہ وغیرہ۔ گو ان باتوں میں سے چند کا انہیں پہلے سے علم تھا۔ اعزاز کے ساتھ ان کی ان موضوعات پر کئی بار گفتگو ہو چکی تھی لیکن پھر بھی وہ یہ باتیں خود سے سننا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں اپنی کہانی دوبارہ سنائی۔ تعلیم' سول سروس اور پھر وہ واقعات جو مجھے اخوت کی

طرف لے کے آئے۔غربت' تنگدستی اورمحرومی کے وہ سارے منظر جو میں دیکھتا رہا......غربت وہی نہیں جو ورلڈ بنک اور یو۔این۔او کی دی گئی تعریفوں کی زمرے میں آتی ہے۔غربت تو اس سے سوا ہے۔روٹی' کپڑا اور مکان کا نہ ہونا بھی غربت ہے۔تعلیم' صحت اور صاف پانی کی عدم دستیابی بھی غربت ہے۔قانون کے تحفظ سے محرومی بھی غربت ہے۔سیاسی اور سماجی انصاف سے انکار بھی غربت ہے۔اخلاق اور اقدار کا افلاس بھی غربت ہے لیکن سب سے بری غربت امید کی غربت ہے۔اگر لوگوں کے پاس امید ہی نہ رہے تو پھر وہ کیا کریں۔وہ جو داغ نے کہا:

بڑھ گئی ہے ناامیدی اسقدر
آرزو کی آرزو ہونے لگی

اخوت کا سب سے بڑا کارنامہ ہی یہ ہے کہ اس نے امید کے ٹوٹے ہوئے دامن کو جوڑا۔لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ اکیلے نہیں۔زندگی کی کشمکش میں کوئی اور بھی ہے جو ان کے ساتھ کھڑا ہے۔پاکستان میں کتنے لوگ غربت کا شکار ہیں۔غربت کے خاتمہ کے لئے اعداد وشمار کا جاننا بہت اہم ہے لیکن کبھی کبھار یہ اعداد وشمار بے معنی ہو جاتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک ایک پاکستانی بھی غریب ہے ہم سب غریب ہیں۔خوشیوں کے کتنے ہی دیئے روشن ہوں' سکھ کی کتنی ہی بارش برستی رہے...... جب تک ہمارا ہمسایہ بھوکا رہے گا ہم چین کی نیند نہیں سو سکتے۔بیس فیصد' تیس فیصد یا چالیس فیصد۔یہ محض سراب ہے۔سچ تو یہ ہے کہ جب تک ایک گھر کا چولہا بھی سرد رہا' ایک بچے کو بھی کتاب نہ ملی' ایک بیمار بھی دوا سے محروم رہا ہم غربت میں خاتمہ کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔بات آگے بڑھتی رہی۔ہارورڈ کے بارے میں بھی سوال ہوئے۔ان سب کو یہ سن کے مسرت ہوئی کہ اخوت کی حیثیت کو وہاں بھی تسلیم کیا گیا۔میں نے انہیں چند کہانیاں بھی سنائیں کہ کیسے ایک معمولی رقم سے لوگوں نے اپنی زندگی بدلی اور پھر لینے کے بعد دینے کی راہ پہ چل پڑے۔رضیہ بیگم' شاہد محمود' خورشید کمال۔یہ سب لوگ تو اب لوک داستانوں کی طرح مشہور ہیں۔وہ سب اخوت کو امریکہ میں ایک قانونی حیثیت دینا چاہتے تھے۔میں نے انہیں بتایا کہ یو کے میں اخوت کو ایک باقاعدہ ٹرسٹ کے طور پر رجسٹر کروایا جا چکا ہے۔اس کام کا سہرا عمر افضل اور ڈاکٹر ندیم بٹ کے سر ہے جنہوں نے پہلے تو قانون کی بہت سی کتابیں پڑھیں اور پھر اخوت کی رجسٹریشن کا عمل مکمل کیا۔عمر افضل نے آکسفورڈ سے اکنامکس میں

ایم فل کیا اور جب اکنامکس کی سمجھ آئی تو اخوت کا رضا کار بن گیا۔ اپنے شہر سے اب تک ساٹھ ہزار پاؤنڈ سے زیادہ رقم اکٹھی کر کے اخوت کو بھجوا چکا ہے لیکن اس عطیے سے بڑا عطیہ اس کی محنت اور بے لوث وابستگی ہے۔ اس نے اخوت کو یورپ میں منظّم کرنے کا وعدہ بھی کر رکھا ہے۔ اخوت یو۔ کے' کے دیگر ٹرسٹیز میں ڈاکٹر ندیم بٹ' ڈاکٹر افضل جاوید اور ڈاکٹر شاہنور طارق شامل ہیں اور پھر وہاں میلکم ہار پر بھی تو رہتا ہے جو یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتا کہ اخوت ان حسین دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے جب مائیکرو فنانس ابھی کاروبار نہیں بنا تھا۔

مہمان رخصت ہو گئے۔ ان کے ساتھ گفتگو بے حد اطمینان کا باعث بنی۔ ان سب نے امریکہ میں اخوت کا ٹرسٹی بننا قبول کر لیا۔ وہ سب مستقبل کے بارے میں بھی پر امید تھے۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ اخوت کی رجسٹریشن کے بعد یو۔ کے کی طرح یہاں بھی بہت کام ہو سکتا ہے۔ ''اس ملک کی سیاسی ترجیحات خواہ کچھ بھی ہوں یہاں کے لوگ دردمند ہیں''۔ ایک مہمان نے کہا۔ وطن سے دور ہو کے بھی یہ سب لوگ وطن کی محبت میں گم تھے۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد ہم نے اعزاز کے ساتھ کچھ پرانی یادیں تازہ کیں اور کچھ وقت کل کی تفصیلات طے کرنے میں صرف ہو گیا۔

2.12۔ آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

خواب' خواب اور خواب۔ کوئی خواب بُنتا ہے' کوئی خواب بنتا ہے۔ ساحر لدھیانوی برصغیر کے ایک مشہور شاعر تھے۔ تاج محل' ایک خوبصورت موڑ' پرچھائیاں۔ نہ جانے کیسی کیسی نظمیں لکھیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب کا عنوان ہے ''آؤ کہ کوئی خواب بُنیں''۔ کسی نے وہ کتاب پڑھی تو کہا ''یہ شاعر بھی کیا خوب لوگ ہیں۔ ہر وقت خواب بُنتے ہیں' خواب بنتے نہیں''۔ خواب بُننا اور خواب بننا دو مختلف کام ہیں۔ اخوت خواب بُننے کا نام بھی ہے اور خواب بننے کا بھی...... خواب بننے کے معنی ہیں کہ آپ کے خواب دوسروں کے خواب بن جائیں۔ لوگ انہیں اپنا سمجھ کے ان کی تکمیل کیلئے کمر بستہ ہونے لگیں۔ لوگ دوسروں کے خواب آسانی سے نہیں اپناتے لیکن اگر کسی خواب میں آفاقیت ہو تو ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ اخوت بھی ایسا ہی کوئی خواب ہے۔ اس میں آفاقیت بھی ہے اور یہ ایک بڑی ہستی سے خاص نسبت کا حامل بھی ہے۔ آج کم و بیش پندرہ ادارے ہیں جو اخوت کے قرضِ حسن ماڈل کو اپنا کر یہی کام کر رہے ہیں۔ وہی اصول' وہی جذبہ'

وہی اخلاص۔ شاید اس سے بھی بڑھ کر۔ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے یہ کام اچھا لگا ہے۔ میں نے بھی اس راہ پہ چلنا ہے تو یہ ہمارے لیے بہترین خبر ہوتی ہے۔ اندھیروں میں کسی ایک چراغ کا روشن ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اندھیروں کو بالآخر مٹ کے رہنا ہے۔ لیکن اس راستے پہ چلنے کی کچھ کڑی شرائط بھی ہیں۔ جو بھی یہ کام کرنا چاہے گا سب سے پہلے اسے اپنے آپ کو بھولنا ہوگا۔ عشق میں یہی اصل قربانی ہے۔ اس قربانی کے بعد پھر ہر مزاحمت دم توڑ دیتی ہے۔

مولائے روم نے کہا ''عشق کے سات شہر ہیں اور ہر شہر کی ستر ہزار گلیاں...... میں ابھی پہلے شہر کی پہلی گلی میں کھڑا ہوں۔ نجانے منزل کب آئے گی'':

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

2.13۔ یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی

کیلی فورنیا کی ہر صبح خوبصورت ہوتی ہے۔

میں اگلی صبح کمرے سے باہر نکلا تو نیلا وسیع آسمان روبرو تھا۔ صبح کی اولین کرنیں۔ فرحت اور تازگی۔ اعزاز کے گھر کا خوبصورت لان۔ یوں لگتا تھا جیسے کائنات ابھی ابھی تخلیق ہوئی ہو۔ پرندوں کی خوبصورت آوازیں۔ ہلکی سی خنکی۔ پتوں پہ بکھرے اوس کے قطرے۔ سورج کی کرنیں ان قطروں سے ٹکراتیں تو آئینہ سا بن جاتا۔ گھاس کا ہرا سمندر اور پھول۔ وہ بھی تو کوئی لمحہ ہی تھا جب خدا نے کہا ہوگا کہ بن جا اور کائنات بن گئی۔ کِھل جا اور پھول کِھل اٹھے۔ چل پڑ اور ہوائیں چل پڑیں۔ برس جا اور بادل برس پڑے۔ دریا' پہاڑ' وادیاں' سمندر اور پھر انسان۔ جنگلوں سے نکل کر جھونپڑوں میں' جھونپڑوں سے بستیوں میں' بستیوں سے شہروں میں۔ انسان اس سارے سفر میں خدا کو نہیں بھولا۔ وہ نہیں بھولا کہ اسے پھر سے کسی کے پاس لوٹنا ہے۔ پھر سے کسی کو ملنا ہے۔ یہ ملاقات تو طے ہے۔ یہی احساس اسے گناہ سے بچاتا ہے۔ اچھے راستوں کا تعین کرتا ہے۔ انسان نے کائنات کو جس طرح مسخر کیا اور اس میں اپنی محنت کے رنگ بکھیرے اس پر خدا کو خوش ہونا چاہیئے۔ نیلا آسمان' صبح کی اولین کرنیں۔ گھاس کا ہرا سمندر' اوس کے قطرے اور آئینوں کی جگمگاہٹ۔ ہر آنے والی صبح اس امر کا

اعلان کرتی ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر خدا مایوس نہیں ہوا تو ہم انسان کے مستقبل سے ناامید کیوں ہیں۔ آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے۔ زندگی خواب بُننے، خواب دیکھنے کا عمل ہے۔

2.14۔ تاجر کمیونٹی: ہم خود تراشتے ہیں منازل کے راہ وسنگ

آج لاس اینجلس کی ایک خوبصورت کلب میں لنچ کا اہتمام تھا۔ پچیس کے لگ بھگ مہمان بھی مدعو تھے۔ اعزاز میرے اٹھنے سے پہلے ہی دفتر جا چکا تھا۔ ایک غیر شادی شدہ شخص کے گھر میں ناشتہ بنانا ہوا اور وہ بھی مجھ جیسے اناڑی کو تو جس مشکل سے گذرنا ہوگا اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ دودھ کہاں ہے؟ پتی کہاں ہے؟ جام، ٹوس، شہد، ٹوسٹر، چولہا۔ یہ سب چیزیں تلاش بسیار کے بعد ملنا شروع ہوئیں اور وہ ناشتہ جو ہر روز پانچ منٹ میں مل جاتا ہے آدھے گھنٹے میں تیار ہوا۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کونسا انڈا تھا تاہم فرائی اور آملیٹ کا امتزاج سا تھا۔ جو لوگ گھر کی قدر نہیں کرتے انہیں کبھی کبھار ایسے سفر پہ ضرور جانا چاہیے جہاں بستر، ناشتہ اور کھانا خود بنانا پڑے۔ دوپہر کے قریب قونصلیٹ کی گاڑی پہنچ گئی اور ہمیں ایل اے ڈاؤن ٹاؤن اس کلب تک پہنچنے میں کوئی تاخیر نہ ہوئی۔ لنچ میں پاکستان کی کونسل جنرل رفعت مسعود کے علاوہ پاکستانی تاجر کمیونٹی کے نمائندہ لوگ موجود تھے۔ اعزاز نے میٹنگ کے آغاز میں بتایا کہ امریکہ اور پاکستان تجارت کے میدان میں اہم ساتھی ہیں۔ پاکستان کی بائیس فیصد برآمدات امریکہ کو جاتی ہیں۔ ان میں ٹیکسٹائل، قالین، ادویات، سرجری کے آلات، کھیلوں کا سامان، چمڑے کی مصنوعات، جیولری اور کھانے پینے کی اشیاء شامل ہیں۔ 1999 میں باہمی تجارت کا حجم دو بلین ڈالر تھا جو اب بڑھ کر ساڑھے چھ بلین ڈالر کے قریب ہو چکا ہے۔ یہ سب حکومت کا نہیں انہی لوگوں کی محنت کا حاصل ہے جو اس میٹنگ میں موجود تھے۔ اعزاز کا کہنا تھا کہ حکومتوں کے باہمی تعلقات کئی طرح کے نشیب و فراز کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کامیاب تجارتی روابط کا تقاضا ہے کہ ہم عوامی سطح پر بھی تعلقات قائم کریں۔ امریکہ اور دنیا کے بہت سے ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات میں اضافہ امریکہ میں آباد ان ممالک کے باشندوں کی بدولت ہوا ہے۔ میکسیکو اور کوریا اسکی زندہ مثال ہیں۔ پاکستانی تاجر بھی اگر چاہیں تو اس ضمن میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ عوامی اور کاروباری سطح پر ہونے والے روابط ایک ہمہ جہت معاشی تعلق اور تجارت کو فروغ دے سکتے ہیں۔ میٹنگ میں موجود

تمام بزنس مین کروڑ پتی افراد کی فہرست میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے کاروبار سے پاکستان اور امریکہ ہر دو جگہ ہزاروں گھرانوں کا روزگار منسلک تھا۔ ان کی بھی دلی خواہش تھی کہ اس تجارت کے فروغ میں اپنا کردار ادا کریں۔ مشکل بین الاقوامی صورت حال کے باوجود وہ پرامید تھے۔ گلہ تھا تو صرف حکومت سے جس کی جانب سے توجہ کا فقدان تھا۔ غربت کے خاتمہ اور خوشحالی کے سفر میں حکومت سے کہیں زیادہ، اہم کردار تاجروں کا ہے لیکن ہم نے تاجر کمیونٹی کو کوئی بلند مقام ہی نہیں دیا۔ ہم ابھی تک ایک قبائلی اور جاگیر دار معاشرے کے عذاب سے باہر نہیں نکلے۔

اعزاز کی تجاویز اور اس کے نتیجے میں ہونے والے سیر حاصل مکالمے کے بعد کونسل جنرل نے مجھے گفتگو کی دعوت دی۔ انہوں نے اخوت کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا۔ میں نے ان کا خصوصی شکریہ ادا کرنے کے بعد بیس منٹ تک بات کی اور بقیہ وقت سوال جواب کیلئے چھوڑ دیا۔ یہ تمام لوگ چھوٹے قرضوں کے تصور سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے گرامین کے بارے میں بھی سن رکھا تھا۔ کئی ایک تو پاکستان میں مائیکروفنانس بنکوں کی کارکردگی سے بھی آشنا تھے۔ ان کے سوال بہت اہم اور برملا تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا دس، پندرہ ہزار کی رقم سے کیا بنتا ہے۔ کیا یہ پیسے کسی کاروبار کے لئے کافی ہیں۔ میں نے کہا بظاہر یہ رقم کم لگتی ہے لیکن جب اس رقم میں انسان کی محنت شامل ہو جائے تو پھر یہ کم نہیں رہتی۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے سائیکل پر کپڑا رکھ کے بیچا اور پھر ایک روز ٹیکسٹائیل ملوں کے مالک بن گئے۔ آپ خود کاروبار کرتے ہیں۔ آپ سے بڑھ کر کون جانتا ہے کہ سرمائے کے بغیر آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ ہمارا مقصد وہی موقع فراہم کرنا ہے۔ وہ پہلا سہارا بننا ہے جو کشکول سے بے نیاز کر دے۔ کچھ لوگوں نے مختصر وقت میں اپنے اپنے تجربے بھی بتائے۔ جاوید لودھی نے اپنے ایک ادارے نور فاؤنڈیشن کے بارے میں بتایا کہ وہ کیسے سندھ کے دیہاتوں میں شمسی توانائی کو عام کر رہے ہیں۔ نور فاؤنڈیشن اپنے نام کا پرتو ہے۔ اب تک ہزاروں خاندانوں کو قمقمے فراہم کر چکی ہے۔ تاریک راہوں میں روشنی پھیلانا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ لنچ بھی چلتا رہا اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔ دو سو سال پہلے جب یورپی تاجر کیلیفورنیا آئے تو اسی طرح سر جوڑ کر بیٹھتے ہوں گے۔ کسی پیڑ کے نیچے، کسی وادی میں، کسی ساحل کی بھیگی ہوئی ریت پر۔ یہ بیس، پچیس لوگ بھی

اپنے اپنے خواب لے کے یہاں پہنچے۔قدرت نے ان پر راستے آسان کر دیئے۔ان میں عزم بھی ہے اور صلاحیت بھی۔لیکن جس شے نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی دردمندی تھی۔ یہ صرف اپنے لئے نہیں سوچتے۔ان کی سوچوں میں دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔وہ لوگ جنہیں ابھی اس مقام پر پہنچنا ہے۔

2.15۔فقیر منش تاجر

تجارت پیغمبرانہ وصف ہے۔

مجھے ایک اور اچھے تاجر کی یاد آنے لگی۔اس کا نام حاجی انعام الٰہی اثر ہے۔اخوت کا دوست، ساتھی اور ہم سفر۔ اسے اللہ نے اتنا کچھ دیا کہ وہ اب واپس اسی کو قرض دیتا ہے۔جو شخص اللہ کو قرض دے اس سے بڑا رتبہ کس کا ہوسکتا ہے۔

بے لوث، بے غرض، ایثار اور قربانی کی نادر مثال۔حاجی صاحب کی ذات سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔ساری زندگی رزقِ حلال کی تلاش میں سرگرداں رہے اور پھر اس رزق کو خلقِ خدا میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔میرا ان سے تعلق دو دہائیوں پہ محیط ہے۔ان کی شفقت میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔شگفتہ مزاج، ذہین اور بذلہ سنج۔انہوں نے زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا ہے۔کتنے ہی نشیب و فراز سے گذرے لیکن نیکی سے ان کا رشتہ کبھی کمزور نہ ہوا۔ وہ خود بھی اللہ کی راہ میں لٹاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس طرف مائل کرتے ہیں۔میاں عبدالوحید، ایس ایم اشفاق، سہیل اقبال وہرہ، ثاقب اقبال۔انسانیت کے لیے انہیں مانگنے میں بھی کچھ عار نہیں۔لاہور کا حجاز ہسپتال حاجی انعام الٰہی اثر کے لیے توشہء آخرت ہے لیکن اسی پر کیا اکتفاء ان کے نامہ اعمال میں نیکی کے اور بھی بہت سے چراغ ہیں۔ فاؤنٹین ہاؤس، چنیوٹ بیت المال، اسلامیہ ہسپتال چنیوٹ۔ مجھے کوئی شخص یا کوئی ادارہ ایسا نہیں ملا جس نے حاجی صاحب کو آواز دی ہو اور انہوں نے لبیک نہ کہا ہو۔انہوں نے بہت سے لوگوں کو نیکی کے گر سکھائے۔اس قدر زادِ راہ اکٹھا کیا کہ رشک آتا ہے۔ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس شہر کا سب سے بڑا بھکاری ہوں کیونکہ مجھے اللہ کی راہ میں ہاتھ پھیلانا اچھا لگتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ایک دن مجھ سے بڑے بھکاری بنو گے...... میں نے کہا اللہ کرے ایسا ہی ہو۔حاجی صاحب کو دیکھ کر ایک پرانی روایت یاد آتی ہے۔کسی شہر میں قحط پڑا تو ایک شخص

نے غریبوں کیلئے لنگر کھلوا دیا۔ لوگ کھانا کھانے لگے۔ ایک شخص نے لنگر بانٹنے والے سے کہا کہ مجھے دو کھانے درکار ہیں۔ ایک کھانا میرے لیے اور ایک کھانا اس نحیف و نزار شخص کے لیے جو دیوار کے پاس بیٹھا ہے اور اس میں اتنی سکت بھی نہیں کہ وہ اٹھ کر یہاں آئے۔ لنگر بانٹنے والے نے دور بیٹھے ہوئے اس شخص کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے کہا کہ اس نحیف شخص کو اس کھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ لنگر اسی کی دولت سے چل رہا ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھنے آیا ہے کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ دیوار کے سائے تلے بیٹھا ہوا شخص حاجی انعام الٰہی اثر ہی ہوگا جو اپنا سب کچھ نچھاور کر کے ایک طرف کھڑا دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی ضرورت مند اور مستحق اکیلا تو نہیں رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اپنی جائیداد زندگی میں ہی تقسیم کر دی۔ کچھ بچوں میں اور کچھ خلقِ خدا میں۔ جس گھر میں وہ رہتے تھے اس کی ملکیت کم از کم نصف ارب روپے ہے۔ یہ گھر حجاز ہسپتال کے حصہ میں آیا۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ جس کا انہوں نے اعلان نہ کیا۔ امریکہ میں بل گیٹ اور وارن بفٹ کی فیاضی کا بہت چرچا ہے۔ ہمارے ہاں قحط الرجال ہے مگر اس قدر بھی نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب تاجر بھی ایک روز اس شخص کے نقشِ قدم پر چلیں گے جس کا نام انعام الٰہی اثر ہے اور جو اللہ کو قرضِ حسن دیتا ہے۔

2.16۔ کیلی فورنیا اور آبائی امریکی

میں اور اعزاز کلب کی خوبصورت عمارت سے باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھے کچھ دیر ڈاؤن ٹاؤن میں گھومتے رہے۔ بلند و بالا عمارات، دولت کی ریل پیل............ کیلی فورنیا امریکہ کی ایک منفرد ریاست ہے۔ یہاں ساڑھے چھ لاکھ سے زائد ارب پتی رہتے ہیں۔ پاکستانی روپے کے اعتبار سے یہ کھرب پتی ہوئے۔ یہ تعداد امریکہ کی کسی بھی ریاست سے کہیں زیادہ ہے۔ دولت کی یہ ریل پیل اس تیل اور سونے کی وجہ سے ہے جو یہاں دریافت ہوا۔ اس پر ہالی وڈ کی فلمی صنعت اور ٹیکنالوجی۔ امریکہ کی تاریخ کی طرح کیلی فورنیا کا ماضی بھی مثالی نہیں۔ ایک طرف خوشحالی کی دلکش کہانی اور دوسری طرف قتل و غارت کی غارت گر داستانیں۔ یہ جنت یونہی آباد نہیں ہوئی۔ اس کی بنیاد میں ان لوگوں کا بہتا ہوا لہو بھی ہے جنہیں کبھی Red Indians کہا جاتا تھا لیکن اب یہ آبائی امریکی یا Native Americans کہلاتے ہیں...... یہ لوگ ہزاروں سال سے یہاں آباد تھے۔ پھر پندرھویں صدی میں ایک طوفان اٹھا اور وہ یورپ سے آنے والے اس طوفان کی تاب نہ لا سکے۔ سفید فام آبادکاروں نے انہیں یا تو تہہ تیغ کر دیا یا پھر ان کی آزادی سلب

کرلی۔ لاکھوں نہتے اور معصوم لوگ اپنی جان گنوا بیٹھے۔ کرائے کے سپاہیوں اور مسلح لشکروں نے ظلم کی انتہا کردی۔ بے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔ جو لوگ قتل و غارت سے بچ گئے انہیں بڑے بڑے قید خانوں میں بند کردیا گیا۔ بھوک، قحط، بیماری۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ صفحۂ ہستی سے ناپید ہونے لگے۔ کہیں کہیں کچھ گروہ اپنی روایات کو ابھی تک گلے سے لگا کر زندہ ہیں لیکن یہ مروجہ معنوں میں امریکی شہریت کے حامل نہیں۔ دوسری جانب وہی لوگ جن کے ہاتھ میں خنجر تھا آج مسیحا ہیں۔ یہی تاریخ کا المیہ ہے:

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

2.17۔ایک عجیب شخص: میری تمام سرگذشت

ہم تاریخ کے نشیب و فراز میں گم، سچائی کو ڈھونڈ رہے تھے۔

بلند و بالا عمارتیں ہمیں غور سے دیکھتی رہیں۔ کچھ دیر لاس اینجلس ڈاؤن ٹاؤن میں گھومنے کے بعد ہمارا رخ ایک نواحی بستی کی طرف ہونے لگا۔ وہاں ہمیں ایک اور تاجر شیخ ایس الٰہی سے ملنا تھا۔ ٹریفک کا زور اور رش آورز کا ہنگامہ۔ شیخ ایس الٰہی سے یہ ملاقات کئی دنوں سے طے ہو رہی تھی۔ وہ کیلی فورنیا میں جوتوں کا کاروبار کرتے ہیں اور کئی ایک اسٹورز کے مالک بھی ہیں۔ وہ انتہائی کم عمری میں اپنے والد کے ہمراہ امریکہ پہنچے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے والد نے یہاں آنے کے بعد انہیں ایک بہت اچھے سکول میں داخل کروا دیا۔ والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ڈاکٹر بنے لیکن شیخ صاحب کو بہت جلد یہ احساس ہونے لگا کہ انہیں اس پیشے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ''میں جب اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا تو ان کے جوتے دیکھ کر بڑا محظوظ ہوتا۔ آہستہ آہستہ مجھے خیال آیا کہ جوتے بنانے سے اچھا کام کوئی نہیں ہوسکتا۔ میرے والدین کو میرے اس فیصلہ سے بڑی مایوسی ہوئی۔ کہاں ڈاکٹر اور کہاں ایک جوتے بنانے والا لیکن انہیں میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اگر میں پاکستان میں ہوتا تو شاید یہ کچھ نہ کر پاتا۔ ظاہر ہے وہاں کون ایسے والدین ہوں گے جو یہ چاہیں گے کہ ان کا بیٹا جوتے بنائے۔ جوتے بنانے کا یہ شوق بالآخر مجھے کاروباری دنیا میں لے آیا اور میں نے جوتوں کی فیکٹری اور سٹورز بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ مسلسل محنت اور عزم و ارادہ۔ یہی میرا اثاثہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میری

محنت کورائیگاں نہیں جانے دیا۔اب اس میدان میں میری ایک پہچان ہے۔عورتوں' بچوں' مردوں کے ہر طرح کے جوتے' بیگ' ہیٹ' پرس' جیکٹس' پتلونیں' شارٹس' سویٹرز' میں نے کیا کچھ نہیں بنایا۔''شیخ سٹورز'' کی چیزیں ایک معتبر نام بنتی جارہی ہیں''۔

میں نے انہیں پاکستان میں جوتوں کی صنعت سے وابستہ دو لوگوں کے بارے میں بتایا۔ بورجان کے زاہد حسین اور سروسز انڈسٹری کے عارف سعید۔ یہ دونوں اخوت کے دوست ہیں۔ زاہد حسین تو اس راہ میں اتنا آگے بڑھے کہ اخوت کی طرز پر قرضِ حسن کا ایک اپنا ادارہ بنالیا۔ ہرل بنیاد کے نام سے یہ خوبصورت ادارہ لاہور کی کچی بستیوں میں کام کرتا ہے۔ شیخ ایس الٰہی کی کہانی بہت دلچسپ تھی۔ عام طور پر پاکستانی امریکہ جا کر بھی نوکری ہی تلاش کرتے ہیں۔ اگر کاروبار کریں بھی تو گیس اسٹیشن یا سیون الیون سے آگے نہیں بڑھتے۔ مجھے یہ پہلا شخص ملا جس نے اپنے لیے ایک الگ سا راستہ چنا اور پھر ایک یا دو نہیں نصف درجن سے زائد سٹورز کا مالک بن گیا۔ جس شوق سے شیخ صاحب اپنی کامیابی کی کہانی سنا رہے تھے اس سے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اسی پر قناعت نہیں کریں گے۔ شیخ الٰہی نے اخوت کے تصور اور کام کی بھی بے حد تعریف کی۔ اخوت سے ان کا تعارف ان کی ہمشیرہ نے کروایا تھا اور انہی کے اصرار پر وہ اخوت سے تعاون کرنا چاہتے تھے۔''غربت جہالت اور پسماندگی......ان سے ہمیں کب نجات ملے گی''۔انہوں نے رخصت ہونے سے قبل یہ سوال ضرور پوچھا۔لیکن اسی دوران انہوں نے یہ کہہ کہ ہمیں اور بھی حیران کر دیا کہ ان کے بیٹے کا نام''کشمیر'' ہے اور بیٹی کا نام''بیت المقدس''۔ یہ نام سن کر ایک لمحہ کیلئے تو ہم حیران رہ گئے۔ کشمیر اور بیت المقدس۔ بچوں کے نام ملکوں اور شہروں کے نام پر! ہم نے وجہ پوچھی تو جواب ملا''جس طرح میرے دونوں بچے آزاد ہیں اسی طرح میں کشمیر اور بیت المقدس کو بھی آزاد دیکھنا چاہتا ہوں''۔ غلامی اور آزادی کی یہ انوکھی تعبیر تھی۔ یوں لگا تاریخ سے آشنا ایک شخص اپنے درد کا اظہار کر رہا ہے......شیخ سٹورز' لاس اینجلس' کشمیر اور بیت المقدس:

میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ہمارے درمیان کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو آزادی سے اس طرح محبت کرتے ہوں۔

2.18۔ ہالی وڈ: بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

شیخ ایس الٰہی کے سٹور سے نکل کر ہم نے واپسی کا رخ اختیار کیا۔ پہلے ہمیں اعزاز کے گھر جانا تھا اور پھر بیس کلومیٹر دور سپال صاحب کے ہاں جنہوں نے بڑی محبت سے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی۔ راستے میں ایک جگہ ہالی وڈ کے نشانات نظر آئے تو اعزاز نے وہاں لے جانے کی پیشکش کی۔ اعزاز کا کہنا تھا کہ جو شخص لاس اینجلس آنے کے بعد بھی ہالی وڈ نہ جائے اسے کور ذوق کہتے ہیں لیکن ہمیں وقت کی تنگی کا احساس تھا۔ یوں بھی ہم پچھلی بار ہالی وڈ کی خاک چھان چکے تھے۔ یہ شہر دنیا بھر کے لیے مرکزِ نگاہ بھی ہے اور مرکزِ شوق بھی۔ اس شہر کی چکا چوند میں سب سے یادگار چیز Walk of Fame نامی ایک سڑک ہے اس پر ان فنکاروں کے نام کندہ ہیں جو عالمی شہرت سے ہمکنار ہوئے۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے ستارے بنا کر ان ستاروں میں ان لوگوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ کبھی کبھی ستارے بھی زمین پر اتر آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت ہم نے بہت سے مشہور ناموں کے ساتھ تصویریں بھی کھنچوائی تھیں۔ اس واقع کو بہت سال بیت گئے۔ نہ وہ وقت رہا، نہ خواہش، نہ بے تابی...... منزل بدل جائے تو راستے بھی بدل جاتے ہیں۔ جنون کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ کوئی اور شے یاد نہ رہے۔

سپال صاحب کے گھر پہنچنے میں دیر لگ گئی۔ کچھ تو ٹریفک کا ہجوم اور کچھ طویل فاصلہ۔ چیونٹیوں کی طرح رینگتی ہوئی گاڑیاں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارا شہر سڑک پہ ہو۔ سپال صاحب کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے لاء کی ڈگری لی اور وکالت کو بھول کر کاروبار شروع کر دیا۔ اخوت کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبر ہمایوں احسان ان کے ہم جماعت تھے۔ اس حوالے سے کئی اور مشترکہ دوستوں کا نام سامنے آیا۔ راؤ فضل الرحمان اور ندیم اشرف جو دونوں اخوت کے بہترین دوست بھی ہیں۔ میرے اور اعزاز کے علاوہ یہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ گفتگو شروع ہوئی۔ لاس اینجلس سے لاہور اور امریکہ سے پاکستان۔ ہم پیچھے کیوں ہیں۔ امریکہ میں بسنے والا ہر پاکستانی اپنے وطن کو عروج پہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جہالت، تعصب، فرقہ واریت۔ ہم نے کیسی کیسی دیواریں کھڑی کی ہوئی ہیں۔ مذہب نے ہمیں جوڑنے کی بجائے تقسیم کر دیا۔ سپال صاحب اور ان کے دوستوں نے اخوت کے حوالے سے بہت سے سوال کیے۔ بالآخر کہنے لگے کہ ''آپ کی باتوں پہ یقین نہیں آتا''۔ ''کیا لوگ واقعی مواخات پہ یقین رکھتے ہیں۔ آپ بہت خوش فہم لگتے

ہیں''۔''اس راہ میں ارادے کے سوا اور کیا کچھ درکار ہے۔ہم بیرونِ ملک بیٹھ کر کیا کر سکتے ہیں''............ یہ سارے سوال ان کے تجسس کا اظہار تھے۔کچھ عرصہ قبل مشہور کالم نگار ہارون الرشید نے اپنے ایک کالم میں اخوت کا ذکر کیا۔میرا جی چاہا کہ وہ کالم انہیں پڑھ کے سناؤں۔ان کے کئی سوالوں کے جواب اس کالم میں بھی موجود ہیں۔

2.19۔ اگر

''اگر'' کے نام سے جنگ میں چھپنے والا یہ کالم ایک معتبر گواہی بھی ہے۔سپال صاحب یہ کالم پڑھ چکے تھے بلکہ یہی کالم اخوت کا ان سے پہلا تعارف بنا تھا۔''اگر'' نامی یہ تحریر ایک خواہش بھی ہے اور دعا بھی۔ہارون الرشید کہتے ہیں کہ......''ملک میں فقط حکمران طبقہ ہی نہیں، اہل دل ہیں اور اہلِ نظر بھی۔وہ کہ چودہ سو برس پہلے کے مدینہ میں برپا ہونے والی ''مواخاۃ'' سے جنہوں نے اپنا چراغ جلایا۔مایوسی کفر ہے اور امید ایمان۔جاگو، جاگ اٹھو، اے اہل وطن، اے اہل وطن۔ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا، کیسا ہی معزز اور معتبر تو میں یہ گمان کرتا کہ غلط بیانی کا مرتکب نہیں تو وہ خود فریبی میں ضرور مبتلا ہے لیکن یہ ڈاکٹر امجد ثاقب تھے، امجد ثاقب۔ان کی بات پتھر پہ لکیر ہوتی ہے، دو جمع دو، برابر چار کی طرح حرفِ آخر۔اس کے باوجود یقین نہ آیا اور عرض کیا: ڈاکٹر صاحب آخر یہ ممکن کس طرح ہے کہ محض ایک سماجی تنظیم پچاس ہزار کی آبادی کے ایک پورے شہر کو سود سے پاک کر دے۔ دھیمے، بہت دھیمے لہجے میں بات کرنے والے معالج کا جواب یہ تھا: دو تہائی کام تو ہم پہلے ہی نمٹا چکے۔سات ہزار خاندانوں پر مشتمل اس بستی میں تین ہزار ضرورت مند خاندان بستے تھے۔ان میں سے دو ہزار برسرِ روزگار ہو چکے، صرف ایک ہزار باقی ہیں۔ان کے لیے جو روپے درکار ہوں گے، وہ ہمارے پاس موجود ہیں۔ہم نے تو دوسرے شہر کا انتخاب بھی کر لیا ہے۔لکڑی کے خوبصورت مکانوں والا قریہ چنیوٹ، جس کا مٹی کے برتنوں میں پکنے والا کھانا ''کنا'' ایک غارت گر فیشن کی طرح راولپنڈی سے کراچی تک پھیل چکا ہے اور جس کی چار سو سالہ قدیم مسجد میں ان کی تنظیم اخوت کا دفتر قائم ہے۔شب تین بجے تک شرقپور کے کچھ شرفاء سے تبادلہ خیال جاری رہا کہ تیسرا شہر شرقپور ہونا چاہیے۔حسن اتفاق سے، جس کی آبادی جہانیاں کے برابر ہے اور تعلیم کا تناسب زیادہ۔

سات سو برس ہوتے ہیں، اسی جہانیاں کے حضرت مخدوم جہانیاںؒ، جہاں گشت کے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ایک محتاج کی مصیبت پر مضطرب تھے۔ملاقات سے انہوں نے انکار کر دیا کہ ہم

عصری بری بلا ہے۔ دوسری بار پھر تشریف لے گئے۔ بتایا گیا کہ مصروفِ مطالعہ ہیں۔ تیسری بار کوئی اور بہانہ لیکن کب تک۔ پہاڑ ٹل سکتے ہیں لیکن صوفی جب ارادہ کر لیتا ہے تو وہ نہیں ٹلتا۔ آخر کار برہم اور بھرے ہوئے نجم الدین برآمد ہوئے اور چنگاریاں اڑاتے ہوئے ارشاد کیا: آخر عزتِ نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے، بار بار جب میں نے کہلوایا کہ مصروف ہوں تو آپ کو پالینا چاہیے تھا کہ سفارش کرنے پر میں آمادہ نہیں۔ آپ کیسے آدمی ہیں کہ ایسی توہین کے باوجود بار بار چلے آتے ہیں۔ فرمایا: فقیر کی کوئی حاجت ہی نہیں، ہوتی بھی تو کسی کا دروازہ کبھی نہ کھٹکھٹاتا۔ مجبوری یہ ہے کہ ایک مسلمان پہ مشکل وقت آن پڑا ہے، جب تک وہ گرداب سے نکل نہ آئے میں اس کا ہاتھ چھوڑ نہیں سکتا۔ نجم الدین صغریٰ یکا یک موم کی طرح پگھل گئے۔ کہاں وہ زعم اور تکبر کہ دل پتھر سا ہو گیا تھا لیکن اب دھوپ میں پگھلتی برف کی طرح قدموں میں آن گرے۔ معافی مانگی اور عرض کیا: حکم صادر کیجیے۔ بادشاہ کی خدمت میں جاؤں گا اور اٹھ کر نہ آؤں گا، جب تک حاجت روائی نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر امجد ثاقب مخدوم جہانیاں نہیں اور نہ شیخ الاسلام۔ مگر ضد ویسی ہی پائی ہے۔ فولاد کا ارادہ اور ریشم کی زبان۔ آٹھ برس سے عزم کر رکھا ہے کہ ہر اس شخص کو قرضِ حسن دیا جائے گا جو رزقِ طیب کے لیے پسینہ بہانے پر آمادہ ہے۔ ناقابلِ یقین۔ پچاس کروڑ روپے، فقط پچاس کروڑ روپے سے اب تک 59 ہزار خاندانوں کو برسرِ روزگار کر چکے۔ (اب یہ رقم پانچ ارب اور خاندانوں کی تعداد تین لاکھ ہو چکی ہے۔ الحمدللہ) کاروبار سیاست اور کارِ حکمرانی کو انہوں نے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا اور مخلوق خدا کی خدمت میں کولہو کے بیل کی طرح جتے ہیں:

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

حیرت ہوتی ہے اور ناقابل بیان حیرت کہ جب اللہ کا ایک بندہ ارادہ کر لیتا ہے، مصمم ارادہ تو کیسا معجزہ سا رونما ہوتا ہے۔ فرد سے جماعت، جماعت سے قافلہ اور قافلے سے کارواں۔ معلوم نہیں کون ہے جو راستوں میں سے کانٹے چن دیتا ہے اور منزلِ مقصود کی طرف اس طرح وہ دوڑتے چلے جاتے ہیں، بے روک ٹوک جیسے پانی ڈھلوان پہ اترتا ہے اور اترتا ہی چلا جاتا ہے۔ نسخہ بہت سادہ ہے، بہت ہی سادہ۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ مشقت کرنے والے ہاتھ بہت تھے اور آرزو بھی بہت مگر سرمایہ نہیں تھا۔ حل انہوں نے یہ ڈھونڈا

کہ پہلے اپنی جیب سے کچھ روپیہ نکالیں، پھر دوستوں کو آمادہ کریں کہ دس ہزار روپے سے لے کر تیس ہزار روپے تک، جتنے بھی کسی کو درکار ہوں، شخصی ضمانت پر بلاسود فراہم کر دیئے جائیں۔ پھر وہ سائیکل کی گدیاں تراشے، پی سی او بنائے، پلاسٹک کی چپلیں ڈھالے یا پھل کی ریڑھی لگائے۔ پورے ایک سو پچاس پیشے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ اکثر میں تربیت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ایک آدھ ہنر سے بیشتر آشنا ہوتے ہیں۔ اگر ہو تو بندوبست کر دیا جائے اور ایک مزید خاندان پر رزقِ طیب کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

رسول پارک لاہور کی وہ بیوہ خاتون ڈاکٹر صاحب کو اب تک یاد ہے، آٹھ برس پہلے وہ ان کے پاس آئی اور یہ کہا تھا: بھیک مانگوں گی، خیرات قبول کروں گی' نہ کسی رشتہ دار کا کواڑ کھٹکھٹاؤں گی۔ زندگی کی بساط پر اپنا سرتاج میں نے ہارا ہے، زندگی نہیں۔ قرض چاہیے، قابلِ واپسی قرض۔ دس ہزار روپے اسے دیئے گئے۔ سلائی کی دو جدید مشینیں اس نے خریدیں۔ محلے کے سکول سے بچیوں کی وردیاں سینے کا معاہدہ اس نے کیا۔ چھ ماہ میں اس نے بیٹی بیاہی، قرض لوٹا دیا اور ایک تنگ گلی سے نکل کر حیات کی کشادہ شاہراہ پر بگٹٹ بھاگنے لگی، جس کے آسمان پر ہر شب امید کے ستارے چمکتے تھے۔ جس کے افق پر آفتاب ہر سحر نئی امیدوں کے ساتھ طلوع ہوتا۔ ''بہت کٹھور ہیں'' ڈاکٹر صاحب نے کہا اہلِ زر اور حکمران بہت کٹھور ہیں مگر انہی میں ایسے ایسے اہلِ دل ہیں کہ آپ کو بتاؤں تو یقین ہی نہ آئے۔

لاہور کا ایک محنت کش جولائی 2009 میں ان کے ہاں آیا اور یہ کہا: آپ کی عنایت نے زندگی سنوار دی، اظہار تشکر کے لیے نذرانہ پیش کرنے کا آرزومند ہوں کہ کسی اور زندگی کا بوجھ ہلکا ہو۔ مشکل مگر یہ ہے کہ محدود سی آمدن ہے۔ کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا: ایک روپیہ روزانہ دے دیا کرو۔ وہ رو دیا اور بولا۔ ایک کیوں، دس کیوں نہیں؟ ڈبے بنوائے، ان دکانوں، کھوکھوں، خوانچوں اور ریڑھیوں پر رکھ دیے گئے جو اخوت کے اہتمام سے رزقِ حلال کے چراغوں سے روشن ہوئی تھیں۔ پہلے ماہ ساٹھ ہزار، پھر نوے، تیسرے مہینے ایک لاکھ دس ہزار، اب فقط داتا کی نگری سے تین لاکھ روپے ماہوار کی آمدن ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا رہا اور کوئی دن جاتا ہے کہ خیبر سے کراچی تک چراغاں ہو جائے گا۔ کراچی والوں کے ڈاکٹر صاحب بہت مداح ہیں۔ بولے: دیکھ لیجئے گا دنیا کے اس سب سے بڑے شہر میں، شوکت خانم ہسپتال دیکھتے ہی دیکھتے تعمیر ہو جائے گا اور لاہور سے زیادہ کامیاب رہے گا۔ کیا اسی شہر کے فرزند مولانا عبدالستار ایدھی نے معرکہ سر نہیں کر لیا؟ امید کا

ایک ماہتاب ابھرا اور چہار سمت چاندنی پھیل گئی۔ ورق تمام ہوا اور داستان باقی ہے۔ تفصیلات بہت ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر اہل وطن، خاص طور پر سمندر پار پاکستانیوں نے اخوت نامی اس تنظیم سے تعاون میں اضافہ کر دیا، جس کے دفتری اخراجات معمولی ہیں اور قرض واپسی کی شرح 99.8 فیصد تو انشاءاللہ 27 رمضان المبارک کے دن قائم ہونے والے اس ملک میں احتیاج کا بھوت سمٹتے سمٹتے ایک دن جیب تراش کا ہاتھ رہ جائے گا اور جیب تراش سے نمٹنا کتنا مشکل؟ پچاس کروڑ روپے سے اگر 59 ہزار خاندانوں کو روزگار مل سکتا ہے تو پچاس ارب سے پچاس لاکھ کو کیوں نہیں؟ یہ بھیک دینے کا پروگرام تو نہیں ہے۔

اٹھو اے اہل وطن، پاکستان میں فقط حکمران طبقہ نہیں، اہل دل بھی ہیں، اہل نظر بھی۔ وہ کہ جنہوں نے چودہ سو برس پہلے کے مدینہ میں برپا ہونے والی ''مواخاۃ'' سے اپنے دیے اور دل روشن کئے''۔

2.20۔ پہلی کرن

ہارون الرشید کی تحریر نے جادو سا کر دیا۔

سپال صاحب کے گھر پہ نشست کافی طویل رہی۔ ''اُٹھو اے اہل وطن' پاکستان میں اہلِ دل بھی ہیں' اہلِ نظر بھی۔ وہ کہ جنہوں نے چودہ سو برس پہلے کے مدینہ میں برپا ہونے والی ''مواخاۃ'' سے اپنے دیئے اور دل روشن کئے''۔......میرے مخاطب جو پہلے ذرا مایوس تھے' مطمئن ہونے لگے۔ اس سے اچھا پیغام ہم اور کیا دے سکتے تھے۔ صغیر سپال اور ان کے دوستوں نے بہت تپاک سے رخصت کیا۔ ساحلِ سمندر کے قریب ایک خوبصورت گھر میں درد کی چند اور شمعیں روشن ہوئیں۔ Reaching One Thousand Americans کا ایک اور سنگِ میل۔ ہم بڑی بڑی شاہراہوں سے گذرتے ہوئے واپس اعزاز کے گھر پہنچے۔ اگلی صبح شکاگو کے لئے روانہ ہونا تھا۔ صبح صبح تیاری مشکل ہوتی اس لیے رات کو ہی سامان سمیٹنا شروع کیا۔ چار گھنٹے کا ایک اور سفر۔ کچھ کپڑے' کچھ کاغذ' کچھ ان دو دنوں کی یادیں۔ ہمیں تیاری میں وقت نہیں لگا۔ سارا سامان بیگوں میں ڈالا اور بیگ سمیٹ کے ایک جانب رکھ دیئے۔ اعزاز نے ڈرائیور کو تین بجے آنے کیلئے کہہ رکھا تھا۔ ڈرائیور کی آمد' گھر سے روانگی' ایئرپورٹ پہنچنا اور پھر سامان کی بکنگ۔ سارے مرحلے آسانی سے طے ہو گئے۔ ہمیں علم تھا کہ ایئر لائین دورانِ سفر کھانے پینے کے لئے کچھ بھی پیش نہیں کرتی۔ بہتر یہی تھا کہ ایئرپورٹ پر ہی کچھ اہتمام کر لیا جائے۔ کافی کا کپ اور چند بسکٹ۔ چائے تو امریکہ میں ہوتی

نہیں۔ جسے وہ چائے کہتے ہیں وہ پھیکا سا ایک سفوف ہے۔ میخانہء مغرب کے یہی دستور ہیں۔ رات کا آخری پہر یا صبح کے اولین لمحے۔ لاس اینجلس ایئرپورٹ جاگ رہا تھا۔ بھاگ دوڑ' گہما گہمی۔ کتابوں کی ایک دکان نظر آئی تو میں نے اندر کا رخ کیا۔ ایئرپورٹ پر اس چھوٹی سی دکان میں بھی ہر موضوع پہ کتب موجود تھیں۔ دکان کے ایک کونے میں ایک مشہور کتاب Uncle Tom's Cabin پڑی نظر آئی۔ اس کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جو تبدیلی اور انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ اس کتاب نے غلامی کے مسئلہ پر امریکی ضمیر کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ بہت کم کتابوں نے انسانی تاریخ کو اس قدر متاثر کیا ہوگا۔ یہ کتاب ان سیاہ فام افراد کی کہانی ہے جو غلامی کی زنجیر میں جکڑے گئے اور پھر نسل در نسل ظلم کا شکار ہوتے رہے۔ میں نے کتاب اٹھا کر کھولنا شروع کی۔

پہلی بار یہ کتاب 1852 میں شائع ہوئی۔ اگلے دو برس میں اس کی امریکہ میں تین لاکھ اور برطانیہ میں دس لاکھ کاپیاں بک چکی تھیں۔ انیسویں صدی میں بائبل کے بعد سب سے زیادہ بکنے والی کتاب Uncle Tom's Cabin تھی۔ جو لوگ انسانی معاشروں پر ادب کے اثر سے ناآشنا ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ اس کتاب میں آنسو ہی نہیں ظلم کے خلاف نفرت بھی ہے اور تبدیلی کی امنگ بھی۔ امریکہ میں غلامی کے خلاف جنگ کی ایک وجہ یہ کتاب بھی ہے۔ اس کی مصنفہ کو لنکن نے پہلی بار دیکھا تو یہ مشہور فقرہ کہے بغیر نہ رہ سکا:

So, this is the little lady who started that great war...

دکان سے نکلنے کے بعد کچھ دیر اور ادھر ادھر گھومتے ہوئے گذرا۔ ہمیں اپنے اردگرد ہر طرح کے لوگ نظر آئے۔ کچھ نیم خواب' کچھ تھکے تھکے' کچھ ہشاش بشاش۔ کچھ عام سے لباس میں اور کچھ بنے سنورے' سجے ہوئے۔ اتنے میں جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا اور ہم مختصر سا سامان اٹھائے جہاز کی طرف چل دیئے۔ سورج کی اولین کرنوں کے جلو میں لاس اینجلس ایئرپورٹ سے روانگی کا بگل بج رہا تھا۔

2.21۔ کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

شکاگو امریکہ کا تیسرا بڑا شہر ہے۔
تیز ہوائیں' بلند عمارتیں' خوبصورت جھیلیں۔ شکاگو صرف یہی کچھ نہیں بلکہ کاروبار اور تجارت کا بہت بڑا مرکز

بھی ہے۔ 1833 میں جب یہ شہر آباد ہوا تو اس کی آبادی دو سو افراد پہ مشتمل تھی۔ آہستہ آہستہ اس آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان دنوں آمدورفت کے لئے ریل ہی واحد ذریعہ تھی۔ شکاگو ریلوے کا مرکز قرار پایا اور اس شہر میں صنعتی سرگرمیاں تیزی سے نشوونما پانے لگیں۔ نیلگوں جھیلیں' برفیلا پانی' رنگین نقش و نگار والے پرندے۔ کون ہے جو اس رومان پرور ماحول میں نہ رہنا چاہے۔ پرندوں کو ایک اچھا دوست مل گیا۔ شہر ابھی آباد ہو رہا تھا کہ 1871 میں ایک روز آگ بھڑک اٹھی۔ تیز ہوائیں اس آگ کو تیز تر کرنے لگیں۔ کئی دن تک شعلے آسمان سے باتیں کرتے رہے۔ جب آگ سرد ہوئی تو آدھا شہر جل کے راکھ ہو چکا تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی خوبصورت عمارتوں کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ راکھ کے اس ڈھیر میں تعمیر نو کا ایک شعلہ مگر زندہ تھا۔ اسی شعلے نے اس شہر کو ایک نیا روپ دے دیا۔ وہی عمارتیں جو خاکستر ہو گئیں' دوبارہ تعمیر ہونے لگیں۔ لیکن اب کی بار معماروں نے ان میں لکڑی کی بجائے سٹیل بھر دیا۔ یہ تعمیر کا ایک نیا انداز تھا جس کی بدولت دنیا بھر میں فلک بوس عمارتوں Sky Scrappers کا دور شروع ہوا۔ تعمیر و ترقی' صنعت و حرفت' کارخانے۔ یہی وہ دن ہیں جب برصغیر پستیوں میں ڈوب رہا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ شہر مزدوروں کی آماجگاہ بننے لگا۔ دنیا بھر میں منائے جانے والے مزدوروں کے دن یکم مئی کی روایت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ان دنوں یہاں کسی کو انسانی حقوق کی اتنی پرواہ نہ تھی۔ مزدوروں کو تھوڑا معاوضہ دیا جاتا اور زیادہ کام لیا جاتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز احتجاج ہوا اور احتجاج کے دوران کچھ لوگ بغاوت پہ تل گئے۔ بغاوت کا پہلا انعام تشدد اور دوسرا موت ہے۔ گولی چلی اور کچھ بے گناہوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ شکاگو کے ان شہیدوں کا لہو ایک علامت بن گیا۔ یہ علامت ایک سو سال تک ان کا لہو گرماتی رہی۔ اب نہ وہ علامت ہے اور نہ اس علامت کے علمبردار ہیں۔ سرمائے کی آندھی نے احتجاج کی یہ شمع بھی گل کر دی۔ شکاگو نے اپنے مزدوروں کو بھلا دیا اور مزدوروں نے شکاگو کو۔ ہاں کہیں کہیں یکم مئی کی چھٹی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن حقوق چھٹی سے نہیں ملتے۔ 1871 میں شکاگو میں لگنے والی آگ تو بجھ گئی لیکن اس آگ نے معاشی ترقی کے الاؤ کو اور بھڑکا دیا۔ یورپ کے دور دراز ممالک سے لوگ شکاگو کا رخ کرنے لگے۔ شہر میں موجود خوبصورت جھیلوں کے گرد گھر' دفتر اور کاروباری مراکز بن گئے۔ آج تقریباً ایک تہائی شہر جھیلوں کے ارد گرد آباد ہے۔ شکاگو ڈاؤن ٹاؤن کو لوپ (Loop) کہا جاتا ہے۔ کاروباری مراکز' ریستوران' شاپنگ مالز' عجائب گھر' آرٹ گیلیریز' سنگ و خشت کی بلند عمارتیں اور ان سب میں گھرا ہوا انسان۔ سیئرز ٹاور' جو شکاگو کی سب سے بلند عمارت ہے' کی

آخری منزل سے نیچے دیکھیں تو انسان بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے ترقی یافتہ شہروں کا یہی المیہ ہے۔

2.22۔آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر

شکاگو ایک خوبصورت شہر ہے۔

1994 میں شکاگو کے اولین وزٹ کے دوران مجھے یہاں ایک ہفتے سے زیادہ قیام کا موقعہ ملا۔اس وقت امریکہ آمدورفت پہ اس قدر پابندیاں نہ تھیں اور بیرونِ ملک سے آنے والے شک سے مبرا سمجھے جاتے تھے۔نہ وضاحتیں، نہ شکایتیں...... مجھے وہ مہربان چہرے یاد آنے لگے جن سے اس وقت شکاگو میں ملاقات ہوئی۔افتخار نسیم سب سے زیادہ یاد آیا۔شاید اس لئے کہ اب وہ شہر تو کیا دنیا ہی چھوڑ کر جا چکا ہے۔افتخار نسیم شکاگو کا جانا پہچانا نام تھا۔شکاگو کی پاکستانی کمیونٹی میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو اس سے متعارف نہ ہو۔اس کی زندگی دو انتہاؤں کے درمیان گذر گئی۔اس سے محبت کرنے والے اس سے بے حد محبت کرتے اور جو اس سے نفرت کرتے وہ بھی نفرت کی انتہا کو پہنچ جاتے۔فیصل آباد کے رہنے والوں کو ایک مشہور مقامی اخبار روزنامہ ''غریب'' اب بھی یاد ہے جس کے مالک اور مدیر کا نام خلیق قریشی تھا۔خلیق قریشی ایک سلجھے ہوئے انسان اور منجھے ہوئے صحافی تھے۔افتخار نسیم انہی کا لختِ جگر تھا۔وہ نوجوانی کے دنوں میں فیصل آباد چھوڑ کے شکاگو آ گیا اور پھر ساری زندگی یہیں رہا۔شاعر' ادیب' دانشور۔شکاگو کی ہواؤں نے اسے آزاد منش بنا دیا۔پہلے وہ شہری اور انسانی حقوق کا علمبردار بنا اور پھر ہم جنس پرستوں کی حمایت بھی شروع کر دی۔میں جب پہلی بار شکاگو آیا تو وہ بے حد تپاک سے ملا۔اس نے میرے اعزاز میں ایک خوبصورت تقریب منعقد کی جس میں کئی ایک شاعر بھی مدعو تھے۔کھانے کی یہ تقریب چھوٹے سے مشاعرے میں ڈھل گئی۔اس نے مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی ملوایا۔مجھے لگا وہ سب محبت کے متلاشی ہیں۔تنہا اور اداس۔بقول شخصے غربت صرف دولت سے محرومی نہیں۔تنہائی بھی تو غربت ہے۔بھری دنیا میں کوئی شخص آپ کا دوست نہ ہو۔آپ کا سہارا نہ بنے۔ اشفاق صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ ہم سب کوئی ایسا کندھا چاہتے ہیں جس پر سر رکھ کے دو آنسو بہا سکیں۔ وہ کندھا نہ ملے تو ہم غریب ہیں۔افتخار نسیم اور اس کے دوست۔مجھے لگا وہ ایسی ہی غریبی کا شکار تھے۔ افتخار نسیم اجڑے ہوئے' بے قرار لوگوں کا دوست تھا۔خواجہ سراؤں سے محبت کا پہلا سبق بھی شاید اسی نے دیا۔ ''لوگ یا تو مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نفرت۔'' افتخار نسیم یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن آج

بھی بہت سے لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔نوشی گیلانی، معظم بن ظہور، پروفیسر ریاض مجید، امجد اسلام امجد۔ جہاز فضاؤں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے افتخار نسیم کا ایک شعر یاد آنے لگا:

تو میرے ساتھ، کہاں تک چلے گا میرے غزال
میں راستہ ہوں مجھے شہر سے گذرنا ہے

افتخار نسیم تو مر چکا لیکن یہ شعر نہیں مر سکتا۔ میں کچھ ہی دیر میں افتخار نسیم کے شہر شکاگو پہنچنے والا تھا۔

2.23۔عقیدت نہیں عمل

جہاز کے اترنے کا اعلان ہوا۔ نشستیں سیدھی ہوگئیں۔سیٹ بیلٹ بندھنے لگیں۔ہم نے بلندیوں کو خدا حافظ کہا اور زمین کو چھونے کی تیاری کرنے لگے۔ شکاگو ایئرپورٹ نیویارک اور لاس اینجلس کی طرح وسیع وعریض ہے۔جدید سہولتوں سے آراستہ۔ ہر سال یہاں لاکھوں مسافر اترتے ہیں۔ ہر ملک، ہر دیس سے۔ کچھ یہیں بس جاتے ہیں کچھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارا سامان آنے میں کوئی دیر نہ ہوئی۔ایئر پورٹ پر ڈاکٹر اعجاز نبی اور چوہدری عبدالستار پہنچے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز نبی سے تو معاملات طے تھے لیکن ستار صاحب کو وہاں دیکھ کے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ پچھلے دنوں ہی پاکستان سے شکاگو آئے تھے اور اپنے بیٹے کے پاس مقیم تھے۔ساری عمر زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد میں گذار دی اور اب شکاگو میں بسنے کا ارادہ تھا۔ ڈاکٹر اعجاز نبی بھی زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد کے فارغ التحصیل ہیں۔ سات آٹھ سال قبل شکاگو پہنچے۔ صلاحیت کی کمی نہ تھی۔جلد ہی پی ایچ ڈی کر ڈالی۔ان کا شعبہ پالتو جانور ہیں۔امریکہ میں کچھ لوگ جانوروں سے کتنی محبت کرتے ہیں اور ان کا کس طرح خیال رکھتے ہیں اس موضوع پر ان کے پاس ان گنت کہانیاں موجود ہیں۔ہم جانوروں کو کسی قابل نہیں سمجھتے اور یہ لوگ اپنی جائیدادیں ان کے نام وقف کر جاتے ہیں۔شاید ہمیں جانور اس لیے نہیں بھاتے کہ دل کے صنم کدے میں دو ہی نام اچھے لگتے ہیں۔خدا کا یا انسان کا۔محبت انہی سے اچھی لگتی ہے۔ڈاکٹر اعجاز اور ستار صاحب نے سامان کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا۔ باہر نکلے، گاڑی میں بیٹھے اور ڈاکٹر اعجاز نبی کے گھر کی طرف چل دیئے۔اگلے دو روز ہم انہی کے مہمان تھے۔

ڈاکٹر اعجاز اس گھر میں چند روز قبل ہی منتقل ہوئے تھے۔اس سے پہلے وہ کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔

امریکہ میں کامیابی کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ آپ کس قدر جلد اپنا گھر بناتے ہیں۔ اچھا گردونواح اور آرام دہ گھر۔ لوگوں کی آدھی زندگی اسی خواب کا پیچھا کرتے ہوئے گذر جاتی ہے۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ کھانے کے دوران اگلے دو روز کا سارا پروگرام زیر بحث آیا۔ کھانے کے بعد مقامی اخبار پاکستان ٹائمنز کے نمائندہ ندیم ملک پہنچنے والے تھے۔ ان کے ساتھ گفتگو۔ شام کو پاکستانی کمیونٹی کے ساتھ ''اخوت ڈنر''۔ اگلے روز Illinois Institute of Technology (IIT) میں پاکستانی طالبِ علموں سے ملاقات۔ دوپہر کو ڈاکٹر علی رضا کے ہاں ڈاکٹرز اور پروفیشنلز کے ساتھ لنچ اور پھر شام کو مشرقی پنجاب کے کچھ افراد سے ملاقات جو جالندھر میں اخوت کی طرز کا کوئی کام کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز اور علی رضا نے یہ سارا پروگرام بہت محنت سے ترتیب دیا تھا۔ لنچ کے بعد کچھ دیر ستار صاحب سے گپ شپ رہی۔ زرعی یونیورسٹی پاکستان کا بہت بڑا سرمایہ ہے لیکن یہاں تحقیق اور جستجو کے ساتھ ساتھ قبیلوں اور علاقوں کے نام پر گروہی سیاست بھی ہوتی ہے۔ مغرب کی کسی درسگاہ میں ایسی ''صف بندی'' کا گمان ہی ناممکن ہے۔ انسان کی گروہوں میں تقسیم تعارف کے لیے تھی، تعصب کیلئے نہیں۔ یہ سبق بھی اہلِ مغرب نے لے لیا۔ موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر اقرار خان نے اس یونیورسٹی کو ایک بہتر ادارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں امریکہ کی یونیورسٹیوں کا وزٹ بھی کر رہا تھا۔ اس پس منظر میں مجھے ذات برادری کی یہ تفریق اور بھی کھٹکنے لگی۔ اتنے میں ندیم ملک تشریف لے آئے۔ جن کا تعلق پاکستان ٹائمنز سے تھا۔ ان کا اخبار نارتھ امریکہ کا سب سے بڑا اردو اخبار ہے جو کئی شہروں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اردو بولنے اور پڑھنے والوں کیلئے ایک نعمت۔ اخبار کا ایک بڑا حصہ کاروباری اور سماجی خبروں پہ مشتمل ہوتا ہے۔ وطن سے دور، وطن کی خبریں لئے یہ اخبار ایک طویل عرصہ سے لوگوں کی خدمت میں مگن ہے۔ ندیم ملک کا کہنا تھا کہ ان کا اخبار خبر ہی نہیں دیتا خبر گیری بھی کرتا ہے۔ مجھے تو وہ خود اخوت کے علمبردار نظر آئے۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو بات آگے بڑھتی رہی۔ اخوت پر گفتگو صرف قرضوں تک محدود نہیں رہتی، مؤاخات کے ہر پہلو کو اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ غربت کے خاتمہ میں ریاست کا کیا کردار ہے۔ اس ضمن میں بھی کئی سوال ہوئے۔ ڈاکٹر اعجاز نے یاد دلایا کہ ہمیں آٹھ بجے ڈنر پہ پہنچنا تھا۔ یوں اس نشست کا خاتمہ ہوا۔ ہم سب جلدی سے تیار ہوئے اور شکاگو کی مشہور Devon Street کی طرف روانہ ہونے لگے۔ یہ شکاگو کی ایک مشہور جگہ ہے جس پر اب امریکہ کا نہیں بلکہ برِصغیر کا قبضہ ہے۔ پاکستان اور بھارت سے آنے والے افراد نے اسے دیسی مرکز میں تبدیل کر دیا ہے۔ پاکستانی اور بھارتی

دکانیں، شورومز اور دفاتر۔ اس جگہ دونوں ممالک کے یومِ آزادی بھی باقاعدہ طور پر منائے جاتے ہیں۔ چودہ اور پندرہ اگست کو خصوصی تقریبات کا اہتمام ہوتا ہے۔ Devon کے ایک مخصوص حصہ کے نصف کو قائدِ اعظم سٹریٹ اور بقیہ نصف کو مہاتما گاندھی سٹریٹ کا سرکاری رتبہ مل چکا ہے لیکن عقیدت نمائش کا نہیں عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ کاش یہ دونوں اقوام قائداعظم اور گاندھی کے ارشادات پر بھی عمل کر سکیں۔

2.24۔ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر

دیوان پہ واقع اس ریسٹورنٹ کا نام عثمانیہ ریسٹورنٹ ہے۔ پاکستانی اور انڈین کھانوں کا مرکز۔ آج کے ڈنر کا انتظام یہیں پہ تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو مہمان پہنچ چکے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز نبی نے تعارف کروانا شروع کیا۔ ان میں نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ نوجوانوں کو دیکھ کر خوشی اس لیے ہوئی کہ وہی اخوت کا مستقبل ہیں۔ شکاگو میں فیصل آباد اور حیدر آباد (بھارت) کے بہت لوگ آباد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان یہاں اجنبی نہیں رہی۔ پاکستان اور بھارت سے کئی ایک شاعر، ادیب اور دانشور اپنی اپنی سوغات لیے یہاں پہنچتے ہیں۔ سیاستدان، مذہبی رہنما اور علماء بھی پیچھے نہیں۔ ہال مہمانوں سے بھر گیا تو تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ نعمت اللہ صاحب نے نظامت کے فرائض سنبھالے۔ ان کی تقریر فصاحت سے بھرپور تھی۔ اخوت کے بارے میں پوری معلومات۔ یہاں تک کہ اعداد و شمار تک درست تھے۔ نعمت اللہ فیصل آباد کے رہنے والے ہیں۔ ستر کی دہائی میں وہ یونیورسٹی کے بہترین مقرروں میں شمار ہوتے تھے۔ کالج اور یونیورسٹی کے ہر مباحثہ میں انعام لیتے۔ معظم بن ظہور کا کہنا ہے کہ اس عہد کا جو طالب علم انہیں نہیں جانتا اسکی ڈگری جعلی ہے۔ انہوں نے اخوت کے فلسفہ اور طریقہ کار پر بھی خوب روشنی ڈالی۔ مجھے لگا جیسے میرے پاس کہنے کے لیے کچھ زیادہ نہیں بچا۔ مجھے اس ادیبانہ گفتگو کی توقع نہ تھی۔ میں نے اخوت کا تفصیلی تعارف کروایا۔ وہ اولین دن جب بات سنانے کیلئے سوجتن کرنا پڑتے تھے۔ اخوت کو یہ پذیرائی بہت کاوش کے بعد حاصل ہوئی۔ جس شوق سے میں نے کہانی سنائی اسی شوق اور توجہ سے لوگوں نے اسے سنا۔ مقرر کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ بات دل تک پہنچ پائی یا نہیں۔ میرے اس اطمینان پر مہر تصدیق اس وقت ثبت ہوئی جب لوگوں نے سوال پوچھنا شروع کیے۔ ان سوالوں کی مدد سے ایسی باتوں کی وضاحت بھی ہو گئی جو میں دورانِ تقریر نہ کہہ سکا۔ اظہار مدعا اتنا بھی آسان نہیں۔ سوال ختم ہوئے۔ لوگوں نے تعاون کی یقین دہانی کروانا شروع کی۔

مسعود ساہی، محمد شفیع، رانا جاوید، محمد ارشد...... قافلہ اسی طرح بنتا ہے۔ کچھ لوگ عطیات دینا چاہتے تھے لیکن ہمارا اصرار تھا کہ عطیات نہیں لیں گے۔ پہلے آپ پاکستان آئیں۔ ہمارا کام دیکھیں پھر فیصلہ کریں۔ ہمارا مقصد عطیات کا حصول نہیں، مؤاخات کا پرچار ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ خود سے کسی ایسے شخص کو تلاش کریں جو عزتِ نفس سے زندہ رہنا چاہتا ہو۔ بھیک کا طلبگار نہ ہو۔ پھر اس کو اپنائیت کی زنجیر میں باندھ لیں۔ اس شخص کو محسوس ہو کہ کوئی اور بھی ہے جو اس کی بھلائی کے خواب دیکھتا ہے۔ اپنائیت کا یہ عمل سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور چراغ سے چراغ روشن ہونے لگیں۔ تبدیلی اس کے بغیر نہیں آئے گی۔ دکھ اور دردیوں ہی ختم نہ ہوں گے۔ سوال جواب کا اختتام ہوا۔ کھانے کا اعلان کیا گیا۔ کھانے کے دوران بھی گفتگو یہی تھی۔ ایک روز پہلے لاس اینجلس میں ملنے والے افراد کا شمار بڑے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا جبکہ شکاگو میں آج جو لوگ ملے وہ بڑے تاجر تو نہ تھے لیکن فیاضی میں کم نہ تھے اور اخوت تو ہے ہی فیاضی۔ دردِ دل اور اخلاص۔

2.25۔ اپنی جان نذر کروں اپنی وفا پیش کروں

دیوان سے واپسی رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ رخصت ہوتے ہوتے بھی کچھ وقت لگا۔ وہ سب لوگ اخوت کیلئے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور ہم سب واپس ڈاکٹر اعجاز نبی کے گھر روانہ ہوئے۔ اگلی صبح Illinoise Institute of Technology (IIT) میں پاکستانی طالب علموں سے ملاقات اور کچھ دیگر پروگرام تھے۔ IIT آنے کی دعوت فاطمہ رضوی کی جانب سے ملی۔ فاطمہ یہاں انجینئرنگ کی طالب علم ہے۔ میری بیٹی فرازین کی بچپن کی دوست۔ نہایت مہذب اور شستہ اخلاق کی حامل۔ جب سے میں امریکہ آیا رابطے میں تھی۔ مسلسل بے چین کہ کب اخوت کی کہانی اس کی یونیورسٹی میں عام ہو۔

گھر پہنچنے میں زیادہ وقت صرف نہ ہوا۔ ہلکی ہلکی بارش نے موسم بے حد خوشگوار بنا دیا۔ صبح اٹھے تو ابھی بارش ہو رہی تھی۔ فطرت کی آنکھ سے ٹپکتے ہوئے موتی۔ شاید ساری رات یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے فوراً بعد IIT کا رخ کیا۔ شکاگو شہر کے تقریباً وسط میں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں ایک چھوٹا سا آڈیٹوریم جہاں کئی پاکستانی طالب علم موجود تھے۔ فاطمہ کی توقعات تو زیادہ تھیں لیکن ہفتہ کی صبح طالب علموں کا یونیورسٹی آنا آسان نہیں ہوتا۔ ان میں سے کچھ بچوں کے والدین مستقل امریکہ میں ہی مقیم تھے۔ وہ یہیں

پیدا ہوئے۔یہیں پلے بڑھے لیکن اس کے باوجود بڑی روانی سے اردو بول رہے تھے۔ پاکستان سے محبت ان کے دل میں رچی ہوئی نظر آئی۔اخوت کی کہانی سن کے ان کے حوصلوں کو اور مہمیز ملی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ان سب نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور جو کچھ تھا اخوت کی نذر کر دیا۔ گو ہمارا عطیات وصول کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن یوں لگا جیسے یہ عطیات نہیں کچھ اور ہے۔

محبت کا یہ اظہار دیکھ کے یادوں کا ایک اور دریچہ وا ہوا۔ مجھے دو سال پرانا ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ یہ واقعہ خانیوال کے ایک مشہور قصبہ جہانیاں کا ہے۔ گرمیوں کے دن اور تیز لُو۔ غلہ منڈی جہانیاں کی مسجد میں قرضوں کی تقسیم ہو رہی تھی۔ اللہ کی راہ میں دینے کی بات آئی تو مقرر کی زبان تاثیر میں ڈوب گئی۔تقریب ختم ہوئی۔لوگ گھروں کو جانے لگے کہ ایک نوجوان نے جیب سے ایک سو کا نوٹ نکال کر ہاتھ میں دے دیا۔ ''میرے پاس اللہ کی راہ میں دینے کیلئے یہی کچھ ہے''۔اس نے رکتے رکتے یہ کہا اور تیزی سے مجمع میں غائب ہو گیا۔ نہ نام' نہ پتہ' نہ رسید۔ میں نے آواز دینے کی کوشش کی لیکن اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ سو روپے کا وہ نوٹ بڑی دیر میرے پاس محفوظ پڑا رہا۔ پھر ایک روز میں نے دو سو روپے اس گمنام ڈونر کے نام پہ جمع کروائے اور اس نوٹ کو فریم کروا کے اپنے دفتر میں لگا دیا۔ میں جب بھی اس نوٹ کو دیکھتا ہوں تو اس نوجوان کی یاد آنے لگتی ہے۔میرے کانوں میں یہ آیت گونجتی ہے.................. ''تم نیکی کا راستہ پا ہی نہیں سکتے جب تک اللہ کی راہ میں وہ شے قربان نہ کرو جو تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے''......اس نوٹ کو اور لوگوں نے بھی دیکھا اور متاثر ہو کر عطیات بھی دیئے۔لیکن کیا کوئی عطیہ اس ایک سو روپے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔کیا کوئی اس نوجوان کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔'' کچھ دینے''اور''سب کچھ'' دینے میں یہی تو فرق ہے۔

IIT کے نوجوان عطیہ پیش کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ہم ان میں سے کس کس نوٹ کو فریم کروا کے اپنے دفتر میں آویزاں کریں گے۔ جہانیاں کے اس نوجوان اور شکاگو کے ان طالب علموں کے عطیات اس امر کا پیغام ہیں کہ اخوت ایک نہ مٹنے والے جذبے کا نام ہے۔

فاطمہ اور اس کے ساتھیوں نے پرتکلف چائے کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ گو ہم ناشتہ کر کے پہنچے تھے لیکن انکار نہ ہو سکا۔نوید سرور' شکاگو کا ایک اور ساتھی بھی ہمارے ہمراہ تھا۔نوید نے پاکستان سے سول انجینئرنگ کی ڈگری

لی اوراب شکاگو میں مقیم ہے۔رضا کاریت کے جذبہ سے سرشار۔اس سے پہلی بارکل ڈنر پہ ملاقات ہوئی لیکن اس نے اخوت سے انتہائی پرخلوص وابستگی کا اظہار کیا۔ چائے کے بعد ہم باہر نکلے۔ ہمارارخ علی رضا نقوی کے گھر کی طرف تھا جہاں بہت سے مہمان ہمارے منتظر بیٹھے تھے۔یہ جگہ کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پہ ہوگی۔

2.26۔دل سے جوبات نکلتی ہے

ہم IIT سے نکلے تو بوندا باندی ہورہی تھی۔

پاکستانی طالب علموں کا دیا ہوا لفافہ میری جیب میں تھا۔اس لفافے نے مجھے بہت سے واقعات یاد دلا دیئے۔ایثاراورقربانی کے۔جہانیاں کا نوجوان' لاہور کا حاجی بابا' اسلام آباد کے ڈاکٹر صاحب۔لیکن یہ ایک اورطرح کا واقعہ ہے۔اس روز بھی بہت تیز بارش ہورہی تھی جیسے کل ساری رات شکاگو میں ہوتی رہی۔ فطرت کی آنکھ سے ٹپکتے ہوئے موتی۔میں دفتر پہنچا تو وہاں چند خواتین ایک جانب پریشان سی کھڑی تھیں۔ میں نے ان سے اس افسردگی کی وجہ پوچھی تو ایک ادھیڑعمر خاتون کی آنکھوں سے آنسوامڈ پڑے۔اس کا کہنا تھا کہ انہیں 18 تاریخ کو اخوت کی جانب سے قرضے کا چیک ملنا تھا لیکن یہ چیک اب چاردن بعد ملے گا۔اس خاتون کے بقول اس کیلئے مزید انتظار بے حد مشکل ہے۔میں نے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو علم ہوا کہ وسائل کی تنگی کے باعث تاریخ کو آگے کردیا گیا ہے۔عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔اس خاتون کی مایوسی دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔برانچ منیجر نے بتایا کہ اٹھارہ تاریخ کو ایک سوتین لوگوں کو قرضے ملنے تھے اور یہ کل رقم بیس لاکھ روپے بنتی ہے اوراس رقم کا بندوبست نہیں ہوسکا۔میں پریشانی کے عالم میں ان عورتوں کے سامنے کھڑا تھا۔جب کوئی راستہ نظر نہ آئے تو دعا کیلئے ہاتھ اٹھتے ہیں۔اچانک موبائل کی گھنٹی بجی۔ایک پرانے دوست کی آواز سنائی دی۔ان کا دفتر ہمارے دفتر کے قریب ہی واقعہ تھا۔وہ مجھے اپنے پاس بلانا چاہ رہے تھے۔میں نے ان خواتین کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ان سے معذرت بھی کی اوراس دوست کے دفتر جا پہنچا۔ہماری گفتگو پندرہ منٹ تک چلتی رہی۔اس دوران ان عورتوں کا چہرہ بار بار میرے سامنے آتا اور آزردگی کی لہر سی پھیل جاتی۔آزردگی اور دعا۔ابھی یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ میرے میزبان نے اپنی میز کی دراز سے چیک بک نکالی اور ایک چیک لکھا۔چیک لفافے میں ڈالا اور لفافہ مجھے پیش کردیا۔میں نے ان سے چیک کی ایسی کوئی

درخواست نہ کی تھی۔خود ہی ان کا فون آیا۔خود ہی انہوں نے چیک تھمایا۔میں نے گاڑی میں جا کر لفافہ کھولا تو پورے بیس لاکھ کا چیک میرے ہاتھوں میں تھا۔ان عورتوں کو بیس لاکھ ہی درکار تھے۔اگلے دن چیک تقسیم ہوئے۔تمام لوگوں کو قرضے ملے۔ان میں سے کسی کو انتظار کی صلیب پہ لٹکنا نہ پڑا۔

یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے کچھ سوال بھی ابھرتے ہیں۔میں اس روز عین اس وقت دفتر کیوں پہنچا جب ان خواتین کو وہاں آنا تھا۔میرے استفسار پر اس خاتون کے آنسو کیوں امڈ پڑے۔فطرت کی آنکھ سے ٹپکتے ہوئے آنسو...... میں نے ان کے ساتھ مل کر دعا کیوں کی......اس شخص نے اسی وقت فون کیوں کیا اور پھر جو چیک اس نے دیا وہ بیس لاکھ کا ہی کیوں تھا۔ان سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں۔شاید ہم میں سے کسی کے پاس نہیں۔یہ حسن اتفاق ہے یا کچھ اور؟ ہر دعا مانی نہیں جاتی' ہر دعا رد بھی نہیں ہوتی۔

علی رضا کا گھر یونیورسٹی سے ایک گھنٹے کی مسافت پہ تھا۔بارش کے باوجود ہمیں اتنا ہی وقت لگا۔

2.27۔اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا

علی رضا سے ہماری دوستی 1973 میں اس وقت ہوئی جب ہم نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ان دنوں یہاں داخلہ ایک بڑا اعزاز تھا۔برصغیر کا نامور ادارہ۔علم وادب سے لے کر شاعری' کھیل' سیاست اور صحافت تک کوئی ایسا میدان نہ تھا جہاں اس ادارے کے طالب علم عروج پہ نہ پہنچے۔جب ہم یہاں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے تو سٹوڈنٹس پالیٹکس کا خوب رواج تھا۔تبدیلی' انقلاب اور بغاوت۔اسی حوالے سے علی رضا سے دوستی ہوگئی۔فتح خان ہمارا لیڈر تھا۔بہترین مقرر' بہترین دوست۔اوپن ائیر تھیٹر میں جب اس کی آواز گونجتی تو ایک تلاطم سا برپا ہو جاتا۔علی رضا گورنمنٹ کالج سے نکل کر میڈیکل کالج پہنچا' ڈاکٹر بنا اور پھر امریکہ چلا آیا۔لیکن تبدیلی' انقلاب اور بغاوت کے خواب اس کے ساتھ ساتھ رہے۔شاید یہی وجہ تھی کہ جب اسے اخوت کی خبر ملی تو پھر سے ہمارے ساتھ چل پڑا۔شکاگو آنے کی ایک وجہ اسکا اصرار بھی تھا۔علی رضا کے گھر بہت سے لوگ موجود تھے۔یہ سب یا تو ڈاکٹر تھے یا بزنس سے وابستہ۔ڈاکٹر نعیم کوہلی کی شمولیت سے محفل اور خوبصورت ہوگئی۔کنگ ایڈورڈ کا ہمارا پرانا کلاس فیلو اور دوست۔نعیم کا گھر یہاں سے کئی گھنٹوں کی مسافت پہ واقع ہے۔وہ خصوصی دعوت پر اتنی دور پہنچا۔مہمانوں میں کچھ خواتین بھی شامل تھیں۔علی اور اس کی بیگم نے بہت محبت سے ان سب لوگوں کو مدعو کیا۔ڈرائنگ روم میں نشست کا اہتمام' تہہ خانے میں ملٹی میڈیا' سپیکرز

اور دیگر لوازمات۔ سب سے پہلے مہمانوں کا تعارف ہوا۔ پھر اخوت کی بات ہونے لگی......لوگوں کو پریزنٹیشن روم میں چلنے کی دعوت دی گئی جہاں اخوت کی ڈاکومنٹری اور پھر کچھ تصاویر دکھائی گئیں۔ اخوت کی پہلی ڈاکومنٹری جاوید چوہدری کی نگرانی میں بنی۔ اس میں ان کی آواز میں وہ خوبصورت پیغام بھی شامل ہے جس کا پہلے تذکرہ ہوا۔ دوسری ڈاکومنٹری اخوت کے طریقہ کار کی وضاحت کرتی ہے۔ اس میں ڈاکٹر اظہار الحق' ہمایوں احسان اور حاجی انعام الٰہی اثر کی گفتگو شامل ہے۔ یہ ڈاکومنٹری علی محسن گردیزی اور ظہیر شاہد کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں ڈاکومنٹریز مختلف طرح کے تاثر کو جنم دیتی ہیں۔ ڈاکومنٹری کے علاوہ ان کاروباروں کی تصاویر بھی دکھائی گئیں جو اخوت کی مدد سے شروع ہوئے۔ لوگ عام طور پر یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ پندرہ بیس ہزار روپے کی رقم جو دوسو ڈالر کے لگ بھگ بنتی ہے' سے کون سا کاروبار شروع ہوسکتا ہے۔ یہ تصاویر ایسے سوالوں کا جواب ہیں۔ اخوت کے دفاتر اور مساجد میں ہونے والی تقاریب کی تصویریں بھی دکھائی گئیں جہاں قرضے پیش کیئے جاتے ہیں۔ مسجد میں بیٹھے لوگ۔ متوجہ اور مودب۔ نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔ یہ لوگ اخوت کے عالمگیر پیغام کی تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔ ان تصویروں کے بارے میں لوگوں نے مزید جاننا چاہا تو مجھے ترقی کے سفر میں مکالمے یا ڈائیلاگ کی اہمیت پر بات کرنا پڑی۔

2.28۔ مکالمہ اور ترقی کا سفر

''قرضوں کی فراہمی کا سب سے اہم مرحلہ لوگوں کے ساتھ مکالمہ ہے''۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔ اخوت کے ہر دفتر میں قرضوں کی تقسیم کا ایک دن مقرر ہوتا ہے۔ اس ماہ کے دوران جتنے لوگوں کے قرضے منظور ہوں وہ لوگ مقررہ وقت پر دفتر سے ملحقہ مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ عموماً کسی نماز کے بعد اور پھر گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ بیس یا پچیس منٹ......اخوت کا فلسفہ' طریقہ کار' اغراض و مقاصد' مستفید افراد کی ذمہ داریاں......اخوت کا ایک نمائندہ یہ سب باتیں بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد سوال جواب کی نشست ہوتی ہے۔ یہ نشست اس تقریب کا اصل حاصل ہے۔ اس نشست کے دوران اخوت کا سٹاف خود کو احتساب کے لیے بھی پیش کرتا ہے۔ کوئی غلطی یا کوتاہی۔ اس کے بعد لوگ بھی ایک عہد کرتے ہیں۔ اخوت کے فلسفہ کو سمجھنے' اس کے پانچوں اصولوں پر عمل کرنے اور اسکی اقدار کی پاسداری کا۔ یہ عہد ایک دائمی رفاقت کی بنیاد رکھتا ہے۔ لوگ اگر یہ عہد نہ کریں تو اخوت محض یک طرفہ کارروائی رہے گی۔ اگر کوئی انسان خود اپنی زندگی بدلنے کیلئے

تیار نہ ہوتو کوئی اور یہ کام نہیں کرسکتا۔ یہ عہد نامہ لوگوں کو Recepient سے Partner بنادیتا ہے۔ ان کے اپنے اندر دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے اوران کی زندگی بدلنے کی ایک خواہش بیدار ہوتی ہے۔ اس عہد کے پسِ منظر میں یہ احساس بھی ہے کہ اخوت کے چند ہزار کارکن معاشرے میں شاید کوئی بہت بڑی تبدیلی نہ لاسکیں لیکن وہ لاکھوں لوگ جو اخوت سے منسلک ہوں گے یہ کام ضرور کرسکتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اخوت کے فلسفہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں تو ہمارا کام آسان ہوسکتا ہے۔

غربت کے خاتمہ اور ترقی کی بنیاد مکالمہ پر ہے۔ میں نے ان کی دلچسپی دیکھتے ہوئے مزید وضاحت کی۔ رورل سپورٹ پروگرام کے بانی شعیب سلطان کا کہنا ہے کہ دل کے کواڑ مکالمے سے ہی کھلتے ہیں۔ محرومی کی مہر بھی مکالمے سے ٹوٹتی ہے۔ لوگ اپنی اپنی دنیا میں رہتے ہیں۔ مکالمہ انہیں ایک مقام پہ لے کے آتا ہے۔ شعیب صاحب مکالمے کو ڈائیلاگ کہتے ہیں۔ ہم نے ان کی معیت میں پنجاب رورل سپورٹ پروگرام میں کئی ایک ڈائیلاگ سنے۔ شمالی علاقہ جات‘ گلگت‘ ہنزہ‘ چترال۔ انہی سے ہم نے سیکھا کہ ترقی کا خواب اس وقت حقیقت بنتا ہے جب لوگ خود اس خواب میں شریک ہوں۔ جب اخوت کا آغاز ہوا تو مکالمے کے عمل کو ایک اہم حکمتِ عملی کے طور پر اپنایا گیا۔ صرف اتنی تبدیلی کی گئی کہ یہ مکالمہ مسجد میں ہونے لگا۔ مسجد شراکت کا ایک نیا افق تھا۔ دوسو‘ چارسو‘ پانچ سو‘ سات سو۔ جب ان مکالموں کی تعداد بڑھنے لگی تو گنتی ہی چھوڑ دی۔ برداشت‘ تحمل‘ رواداری اور باہمی تعاون۔ مکالمہ باعثِ برکت بھی ہے۔ مکالمے سے ایک رشتہ جنم لیتا ہے۔ ایک دوسرے کی رائے تک رسائی ہوتی ہے۔ اخوت نے مسجد میں بیٹھ کر مکالمے کی جو جہت متعارف کروائی اس کے بہت مثبت نتائج سامنے آئے۔

مہمانوں نے ہماری ساری باتیں بہت دلچسپی سے سنیں۔ مجھے خوشی تھی کہ کسی نے بھی وقت کی قلت کا شکوہ نہیں کیا۔ وہ یہ باتیں سمجھنا چاہتے تھے۔ شک اور اشتباہ پڑھے لکھے لوگوں کا خاصہ ہے۔ اس تصویری پریزنٹیشن نے انہیں اک گونہ اطمینان بخشا۔ پریزنٹیشن کے ساتھ ساتھ کھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ انتہائی پرتکلف کھانا جس کی تیاری میں علی رضا اوراس کی بیگم نے خوب محنت کررکھی تھی۔ تہہ خانے سے نکل کر سب لوگ واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے اور چائے کا انتظار ہونے لگا۔ ’’ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی نیکی سے وابستہ ہے‘‘۔ ایک صاحب نے کہا۔ ’’کوئی سکول‘ کوئی ہسپتال‘ کوئی یتیم خانہ۔ ضرورت یہ ہے کہ ان نیکیوں کو اکٹھا کیا جائے۔ نیکیاں اکٹھی

ہوتی ہیں تو ان کی تاثیر بڑھ جاتی ہے‘‘ ۔ چائے کے دوران نعیم کوہلی سے گفتگو چلتی رہی ۔ وہ اپنی شاعری کی دو کتب شائع کروا چکا ہے ۔ ادیبوں اور شاعروں سے اس کی محبت ضرب المثل بنتی جارہی ہے ۔ کنگ ایڈورڈ کی خوبصورت یادیں ۔ وہ دوست‘ وہ درو دیوار اور پیپل کے وہ درخت جواب گرتے جارہے ہیں ۔ ان پر چہکنے والے پرندے نجانے کہاں ہوں گے ۔ ہم نے بہت سے پرانے دنوں کو یاد کیا ۔ اب ان درو دیوار میں ہم سے اچھے لوگ بستے ہیں......ڈاکٹر سائرہ‘ سدرا‘ خالد......جو کام ہم نے بہت دنوں بعد کیا انہوں نے اس کا آغاز ابھی سے کردیا ۔ میں نعیم کو بتا تا رہا ۔ کیمکولین اخوت کلب کے نام سے انہوں نے ایک تنظیم بنائی اور اخوت کے کام کو آگے بڑھانے لگے ۔ پروفیسر محمود شوکت نے ان کی خوب سرپرستی کی ۔ ایسی تنظیموں کا آغاز کئی اور اداروں میں بھی ہونے لگا ہے ۔ گویا مواخات پہ صرف ہمارا استحقاق نہیں ۔ یہ تو ہمارا اجتماعی ورثہ ہے ۔ ہم علی رضا کو بھی کنگ ایڈورڈ کی یادوں میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن اسے تو مہمانداری سے ہی فرصت نہ تھی ۔

2.29 ۔لبریشن لون اور نعیم مسیح

ڈرائنگ روم کی فرنچ ونڈو سے گھر کا لان بہت خوبصورت لگ رہا تھا ۔ کئی رنگ کے پھول اور نفاست سے تراشی ہوئی گھاس ۔ بارش نے سارے ماحول کو بھگو کے اور خوبصورت بنا دیا ۔

چائے کے بعد میں نے مہمانوں کو ایک بار پھر متوجہ کیا ۔ میں انہیں لبریشن لون کے بارے میں بتانا چاہتا تھا ۔ اخوت کی ایک اور جہت ۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہمارے گلی کوچوں میں چھوٹے چھوٹے قرضوں اور سود کا کاروبار زہر کی طرح سرایت کر چکا ہے ۔ مملکتِ خداداد اور خدا سے جنگ ۔ سو سے دو سو فیصد سالانہ شرح سود پر دیئے گئے ان قرضوں کا ہدف عموماً غریب اور سفید پوش ہوتے ہیں ۔ بعض اوقات یہ لوگ دو یا تین سودخوروں کے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں ۔ ہر لحہ موت اور ناامیدی ۔ یہ بے بسی بالآخر جرم اور گناہ کے دروازے کھول دیتی ہے ۔

میں نے انہیں بتایا کہ شروع شروع میں اخوت کے قرضے صرف کاروباری مقاصد کیلئے دیئے جاتے تھے لیکن جب ہمیں علم ہوا کہ ہزاروں لوگ سود کے بوجھ تلے دفن ہیں تو اخوت کے کل قرضوں کا دس فیصد حصہ ان

قرضوں سے نجات کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔اخوت کے ان قرضوں کو آزادی لون یا Liberation Loan کہا جاتا ہے اور یہ قرضے ان افراد کو دیئے جاتے ہیں جو کسی بیماری یا حادثہ کی وجہ سے سودی قرضوں کی دلدل میں جا گرتے ہیں۔ بہن کی شادی' ماں کی بیماری' بیٹے کی تعلیم' کاروباری نقصان' کسی ملک کا ویزا' اچھی ملازمت۔ بہت سی وجوہات ہیں جو لوگوں کو سودخور کی دہلیز پہ لے آتی ہیں اور پھر وہ ساری زندگی اس صلیب پر لٹکتے ہوئے گذار دیتے ہیں۔اخوت کی جانب سے اب تک لبریشن لون کی مد میں تین ہزار سے زائد قرضے جاری کیے گئے ہیں۔ یہ قرضے بہت سے خاندانوں کا سہارا بنے ہیں۔لبریشن لون کا آغاز بھی ایک کہانی سے ہوا۔اس کہانی کا عنوان نعیم مسیح ہے جو تیرہ سال سے سود کا بوجھ اتارتے' اتارتے تھک چکا تھا۔یہی ایک کہانی سود سے نفرت اور جہاد کیلئے کافی ہے۔

2.30۔ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

نعیم مسیح کی کہانی ہمارے معاشرے کی ایک بھیانک تصویر ہے۔

نعیم نے اپنی زندگی کا آغاز چھوٹے سے کاروبار سے کیا لیکن تجربے کی کمی کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اسے بہت سے لوگوں کو رقم کی ادائیگی کرنا تھی۔مجبوری کے عالم میں اسے ایک شخص سے پینتیس ہزار روپے سود پر لینے پڑے۔ بہت منت سماجت کے بعد تین ہزار روپے ماہانہ سود مقرر ہوا۔یعنی ایک سال میں اصل زر سے زائد سود کی رقم۔اس کے والد ان دنوں واپڈا میں ملازم تھے۔ان کے توسط سے اسے بھی واپڈا میں معمولی ملازمت مل گئی۔باپ' بیٹا پارٹ ٹائم الیکٹریشن کا کام بھی کرنے لگے۔اس طرح سود کی رقم ادا ہونے لگی اور گھر کا نظام بھی چلتا رہا۔سودخور بہت طاقت ور اور ظالم تھا۔اس کا نمائندہ ہر ماہ پہلی تاریخ کو اپنی قسط وصول کرنے آجاتا۔گھر میں چولہا جلتا یا نہ جلتا' سود کی رقم ضرور ادا ہوتی۔ 1992 سے لے کر مئی 2005 تک نعیم مسیح بطور سود چار لاکھ اٹھتر ہزار روپے ادا کر چکا تھا۔ان تیرہ برسوں میں اس کے پاس یکمشت اتنے پیسے اکٹھے نہ ہو سکے کہ وہ اصل زر یعنی پینتیس ہزار ادا کر کے قرضے سے جان چھڑوا سکتا۔ جتنے دکھ اس نے اور اس کے گھر والوں نے اٹھائے' کسی نے کیا اٹھائے ہوں گے۔ ہر لمحہ موت' ہر لمحہ اذیت۔سود کتنی بڑی لعنت ہے اور سودخور کتنے بے حس ہیں یہ اس سے بڑھ کر اور کوئی نہیں جانتا۔

اخوت نے نعیم مسیح کے 35 ہزار روپے ادا کر دیئے۔ اب وہ قرض کے بوجھ سے مکمل آزاد ہو چکا تھا۔ دکھ کی بھیانک رات گذرنے کے بعد سکھ اور اطمینان کی کرنیں طلوع ہوئیں۔ نعیم نے اخوت کو ڈیڑھ سال کے اندر قرض کی رقم بھی واپس کر دی۔ اب وہ جو کماتا وہ صرف گھر والوں کے کام آتا ہے لیکن اس کے ساتھ جو کچھ ہوا کیا وہ ہمارے لیے باعث افسوس نہیں؟ آج بھی ہزاروں لاکھوں لوگ ''دورِ جاہلیت'' کے اس سود کا شکار ہیں جسے ہمارے آقا نبی اکرم ﷺ نے گناہ کی اور رسموں کی طرح' اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ کیا اس ظلم اور استحصال کو اخلاقیات کے کسی بھی معیار کے تحت روا سمجھا جا سکتا ہے۔ سود کا یہ کاروبار کب ختم ہوگا؟ انسان کو آزادی کی نوید کب ملے گی؟ مہمانوں کے چہرے پہ گہری افسردگی بکھر گئی۔ معاشرے کی یہ تصویر انہوں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ کچھ لوگ جانتے ہی نہیں کہ زندگی کو جبرِ مسلسل کیوں کہا جاتا ہے..... علی رضا اٹھ کے کھڑکی کھولنے لگا۔ اسے کمرے میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ علی رضا پر ہی کیا موقوف مجھے لگا ہم سب تازہ ہوا کے متلاشی ہیں۔

2.31۔ از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

نعیم مسیح کی یہ کہانی ان ہزاروں کہانیوں میں سے ایک ہے جو ہمارے اردگرد بکھری پڑی ہیں۔ ایک مزدور نے دو ہزار روپے قرض لیا اور اس پر بارہ ہزار روپے سود دیا۔ ایک عورت نے دس ہزار پر پینسٹھ ہزار ادا کیے۔ ایک گھریلو خاتون نے کمیٹی کے چکر میں آ کر پچاس ہزار روپے سود پر اٹھائے اور اس پر کم و بیش بیس لاکھ روپے ادا کیے۔ ان کہانیوں کا ایک ایک حرف تلخیوں سے بھرا اور درد میں گندھا ہوا ہے۔ یہ سب ہماری بے حسی کی کہانی ہے۔ انسانیت کا زعم رکھنے کے باوجود انسان کی اس قدر تذلیل۔ کس میں ہمت ہے کہ وہ آج انسانی عظمت کے گیت گا سکے۔ ''ہم جس کے سامنے جھولی پھیلاتے ہیں اسی سے جنگ بھی کرتے ہیں۔'' ایک عمر رسیدہ بزرگ نے یہ بات کہی اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اس کا ہر آنسو ایک سمندر تھا۔ جیسے وہ صدیوں سے دشتِ ظلمت میں چل رہا ہو۔ ''سود کی جس رسم کو میں نے قدموں کی دھول بنا دیا تم اسے بت بنا کے پوجنے لگے۔ کیا یہی وہ عقیدت تھی جس کا دعویٰ کرتے اور نعرے لگاتے تمہاری زبان خشک ہو جاتی تھی............ اے لوگو تم نے وہ کیوں کہا جو کر نہ سکے۔'' کوئی بادشاہ' کوئی وزیر' کوئی حاکم' کوئی خادم۔ کوئی ہے جو رسالتمآبؐ کی اس شکایت کا جواب دے سکے۔ ایسی ہی کوئی بات تھی جس نے اقبال سے یہ شعر

کہلوائے:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
گر حسابم را ببینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

(اے مولائے کریم تو غنی ہے اور میں ایک عاجز اور فقیرِ بے نوا۔ قیامت کے روز تو میری تقصیروں کا عذر سننا' انہیں پذیرائی بخشنا اور اپنے عفو و کرم سے نوازنا۔ اے رب العزت اگر تو فیصلہ کرے کہ میرا حساب کتاب ناگزیر ہے تو میری صرف ایک عاجزانہ درخواست قبول فرما لینا۔ وہ درخواست یہ ہے کہ مجھ سے حساب جناب سرورِ کائنات ؐ کے سامنے نہ لینا۔ میرا محاسبہ ان کی پاک نگاہوں سے اوجھل ہو کے کرنا کہ میں پر تقصیر اُمتی آنحضرت ؐ کا سامنا نہ کر سکوں گا)۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ ''پر تقصیر امتی'' کسی ضرورت مند کو دو ہزار' دس ہزار یا پچاس ہزار دے کر سود کی دلدل میں گرنے سے بچا لیں اور روزِ محشر انہیں یہ التجا نہ کرنی پڑے............ گر حسابم را ببینی ناگزیر۔ از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر۔

2.32۔جالندھر میں اخوت

رخصت ہونے کا وقت آیا۔ مصافحے، معانقے۔ لوگ ایک بار پھر تپاک سے ملے۔ آمد اور رخصتی کے تپاک میں فرق ہوتا ہے۔ گاہ مسکراہٹ' گاہ آنسو۔ ہم سب نے علی رضا اور اس کی بیگم کا شکریہ ادا کیا۔ گو یہ شکریہ ہم پہ واجب نہ تھا۔ دوستوں کا حساب تو دل میں رہتا ہے۔ ڈاکٹر نبی کے گھر واپس آنے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ سردار جوگندر سنگھ جن کا تعلق بھارتی پنجاب کے شہر جالندھر سے تھا پہلے ہی تشریف لا چکے تھے۔

جوگندر سنگھ ایک مدت سے شکاگو میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نبی سے ان کی خوب دوستی ہے۔ کل رات اخوت ڈنر میں بھی موجود تھے۔ انہیں مؤاخات کا درس بہت بھایا۔ مواخات کیا ہے؟ ہم نے ساری بات پھر سے کھول

کے بیان کی۔ان کا سوال تھا کہ کیا یہ کام ان کے شہر جالندھر میں بھی ہوسکتا ہے۔کیوں نہیں' یہ تو ایک عالمگیر تصور ہے۔''لیکن قرضوں کی واپسی کے بارے میں ہمیں یقین نہیں''۔انہوں نے خدشے کا اظہار کیا۔ پریشان مت ہوں۔ہم جب بھی کسی نئے شہر میں کام کرتے ہیں تو وہاں کے لوگ اسی تذبذب کا شکار ہوتے ہیں۔انہیں یہ خوف رہتا ہے کہ ان کے شہر میں واپسی کی شرح شاید اچھی نہ ہو لیکن جب کام شروع ہوتا ہے تو یہ خدشات آہستہ آہستہ دَم توڑنے لگتے ہیں۔نیکی' نیکی کو جنم دیتی ہے۔یہ کیسے ممکن ہے کہ گلاب بونے کے بعد کانٹوں کی فصل کاٹنا پڑے۔مؤاخات کا بیج ہمیشہ پھل دے گا۔''کیا آپ ہماری مدد بھی کریں گے۔'' ''یہ تو ہمارے لئے اور بھی خوشی کی بات ہوگی۔آپ کچھ لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجیں یا ہمیں اپنے پاس اپنے شہر میں بلائیں۔ہم پورا پروگرام بنا کر اور چلا کر دیں گے۔اخوت نے بارہ سال میں یہی کچھ تو کیا ہے۔ اصول وضوابط' قاعدہ قانون' طریقہ کار' ایک بہترین ماڈل۔ہر شے ایک دستاویز کی صورت میں دستیاب ہے۔ ہمارے پاس تربیت کا نظام بھی ہے۔کوئی بھی ادارہ اگر یہ کام کرنا چاہے تو ہم ہر طرح کی رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔پاکستان میں ایک دو نہیں بلکہ کئی اداروں نے ہم سے قرضِ حسن کی تربیت لی ہے۔'' مجھے ہرل بنیاد' ایس اے وائی ٹرسٹ' زادِراہ' اصلاح فاؤنڈیشن' نعمت ٹرسٹ' ڈیسنٹ فاؤنڈیشن' سوجھر' اخوت سندھ' اخوت کراچی' مسلم ایڈ پنڈی جیسے ادارے یاد آنے لگے جنہوں نے مؤاخاتِ مدینہ کے تصور سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور قرضِ حسن کی راہ کو اپنایا۔وہ لاتعداد افراد بھی جو مذہب پہ یقین نہیں رکھتے لیکن بھائی چارے پہ یقین رکھتے ہیں۔وہ جو شکوک وشبہات کے ساتھ ہمارے پاس آئے اور پھر ہمارے مستقل ساتھی بن گئے۔مؤاخاتِ مدینہ ایک امرت دھارے کا نام ہے۔اس میں کوئی ایسی ہی شے ہے جو انسان کو کیمیا بنا دیتی ہے۔جوگندر سنگھ نے یہ ساری باتیں بڑی توجہ سے سنیں۔

مجھے یوں لگا جیسے واہگہ کی سرحد سمٹ گئی ہو اور میں اہلِ جالندھر کے پاس بیٹھا انہیں اخوت کا پیغام سنا رہا ہوں۔جوگندر سنگھ نے بتایا کہ بھارتی پنجاب میں کئی سماجی مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد نشہ کی لعنت کا شکار ہو رہی ہے۔وہ کسی ایسے راستے کی تلاش میں تھا جو امید کا پیغام بن جائے۔وہ راستہ مؤاخات ہے۔میں نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔جب میں نے انہیں بتایا کہ ہم یہ پروگرام بہت جلد ننکانہ صاحب میں شروع کرنے والے ہیں تو اسے بہت خوشی ہوئی۔بابا گورونانک کا محبت بھرا پیغام ہمارا مشترکہ اثاثہ ہے۔میں نے جوگندر سنگھ کو اپنے دوست رمیش سنگھ اروڑا کے بارے میں بتایا جو

نارووال ضلع میں غربت کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ رفتہ رفتہ یہ گفتگو اختتام کو پہنچی۔ جوگندر سنگھ کی آنکھوں سے عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ نیکی کی تبلیغ بھی تو نیکی ہے۔ وہ جو غالب نے کہا کہ ''ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال''۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو جوگندر سنگھ اوراس کے دوست نے اجازت لی۔ اگلی صبح ہماری بھی روانگی تھی۔ پہلے ٹیکساس اور پھر نارتھ کیرولینا۔ ہم اپنے میزبانوں کے ساتھ بڑی دیر تک شکاگو کے وزٹ پہ گفتگو کرتے رہے۔ اس شہر میں بے حد گرم جوشی اور تپاک ملا۔ فرینڈز آف اخوت' شکاگو کی بنیاد تو پڑ ہی چکی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز نبی' نوید سرور اور ارشد مل کر مستقبل کی تصویر بنانے لگے۔ روشن اور تابناک۔ بقول اقبال:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

3

گئے دنوں کا سراغ لے کر

باب سوئم

3.1۔ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

رات کی ظلمت اور سحر کا نور۔

شکاگو ائیر پورٹ۔ڈیلٹا ایئر لائین کا آرام دہ جہاز۔میں شکاگو سے ڈیلس جانے کے لئے اپنی نشست پہ سوار ہو چکا تھا۔میری گود میں لیڈر شپ کے موضوع پر ایک کتاب پڑی تھی۔اس کتاب میں ان افراد اور واقعات کا تذکرہ تھا جنہوں نے امریکہ کی تقدیر کو بدل کے رکھ دیا۔قوموں کی تاریخ یونہی نہیں بدلتی۔اس کے پیچھے اچھی قیادت کے علاوہ عمل کی ایک داستان ہوتی ہے۔امریکی تاریخ میں بہت سے نازک موڑ آئے لیکن ہر اہم موڑ پر اسے ایسی قیادت ملتی رہی جس نے گہرے تدبر کا مظاہرہ کیا۔مصنف کا کہنا تھا کہ اس تدبر میں اخلاص بھی تھا اور سچائی بھی۔

پھر وہ تین مختلف مثالوں سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔پہلی مثال امریکی صدر ابراہام لنکن کی ہے۔ابراہام لنکن اپنی صدارت کے پہلے دور (1864-1860) میں غلامی کے خاتمے کا اعلان کر چکا تھا۔ان دنوں جنوب کی ریاستیں غلامی کے حق میں تھیں جب کہ شمالی ریاستیں اسے ناجائز تصور کرتی تھیں۔لنکن کے مشیروں کا خیال تھا کہ اگر اسے دوبارہ الیکشن جیتنا ہے تو آزادی کے اعلان کو واپس لے لینا چاہیئے۔لنکن کئی ماہ تک کشمکش کا شکار رہا۔اس نے سوچا کہ وہ یہ پروانہ آزادی واپس لے لے اور الیکشن میں فتح کے بعد اس کے دوبارہ اجراء کی کوشش کرے لیکن اس کو یہ اقدام اپنے اصولوں کے منافی نظر آیا۔اس نے خود سے سوال کیا۔''کیا غلامی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے''۔دل کی گہرائیوں سے انکار کی صدا بلند ہوئی اور بالآخر اس نے وہی فیصلہ کیا جو ایک باضمیر شخص کو کرنا چاہیئے تھا۔اس نے جنوب کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔غلامی کے

خاتمہ کا اعلان برقرار رہا۔ اس موقعہ پر اس نے یہ تاریخی کلمات بھی کہے۔ "I'd rather be right than be President"۔ وقت نے دیکھا کہ غلامی کی لعنت کا خاتمہ بھی ہوا اور وہ دوسری بار صدر بھی بنا۔

دوسری مثال۔ 1940 میں فرینکلن ڈی روز ویلٹ، امریکہ کا صدر تھا۔ وہ اس سے پہلے دو دفعہ صدر بن چکا تھا اور اب تیسری بار صدر بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ امریکہ کو جنگِ عظیم دوم میں شامل نہیں ہونا چاہیے لیکن روز ویلٹ کا خیال مختلف تھا۔ اس نے الیکشن سے صرف ایک ہفتہ پہلے وہ تاریخی اعلان کیا جس کی بدولت امریکہ کو دوسری جنگِ عظیم میں بھرپور کردار ادا کرنے کا موقعہ ملا۔ روز ویلٹ کا کہنا تھا کہ ''میں ایسے ملک کا صدر نہیں بننا چاہتا جس کا دنیا کی سیاست میں کوئی کردار ہی نہ ہو۔''

تیس سال بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے۔ 1963 میں امریکہ ایک بار پھر تقسیم ہو چکا تھا۔ جان ایف کینیڈی، اپنے دورِ صدارت کے اہم موڑ پہ کھڑا تھا۔ وہ ''سیاسی حقوق کا بل'' کانگریس میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ جونہی یہ بل پیش ہوا، کینیڈی کو جنوبی ریاستوں کے لاکھوں ووٹروں کی مخالفت مول لینا پڑی۔ اس کے بھائی نے اسے بتایا کہ اس کا یہ قدم اگلے الیکشن میں اس کی شکست کا باعث بن جائے گا۔ کینیڈی نے مسکرانے کے بعد صرف اتنی سی بات کہی ''اگر مجھے اصولوں کی بنیاد پر شکست ہوتی ہے تو میں یہ شکست قبول کرلوں گا''۔

کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ لنکن، روز ویلٹ اور جان ایف کینیڈی کوئی غیر فانی انسان نہیں تھے۔ وہ اتنے ہی چالاک، اور موقع پرست سیاستدان تھے، جتنے ان کے دوسرے ہم عصر۔ ان میں خود نمائی کی عادت بھی تھی اور اقتدار کے حصول کی خواہش بھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اہم موقعوں پر سچائی کا دامن نہیں چھوڑا یہاں تک کہ اپنی سیاسی زندگی اور صدارت کو داؤ پہ لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ لنکن اگر جرأت نہ دکھاتا تو امریکہ کے کئی ٹکڑے ہو چکے ہوتے۔ روز ویلٹ جنگ سے کتراتا تو شاید آج دنیا پر جرمنی اور جاپان کی حکومت ہوتی۔ کینیڈی انسانی حقوق کا بل پیش نہ کرتا تو آج امریکہ نسلی امتیاز کا بدترین شکار ہوتا۔ امریکہ پر ہی کیا موقوف ہر ملک کی تاریخ میں ایسے موڑ آتے ہیں جب بہت اہم فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے کتاب بند کی اور سوچنے لگا۔ پاکستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کتنے موڑ۔ کتنے بڑے فیصلے۔ افسوس ہمارے ہاں کسی کے حصے میں یہ سعادت نہ آئی کہ وہ تاریخ کے کسی ورق پہ یہ لکھ دیتا کہ: I'd rather be right than

be President۔ یا پھر کم از کم یہی کہہ دیتا کہ اگر مجھے اصولوں کی بنیاد پر شکست ہوئی تو میں یہ شکست قبول کرلوں گا۔صدر ہونا بڑی بات سہی لیکن سچا ہونا اس سے بھی بڑا ہے۔کتاب کے ورق پہ ایک آنسو گرا۔ میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکنا چاہا۔میری نظر بلندیوں پہ نہیں پستیوں کی طرف جانے لگی۔

3.2۔ابراہام لنکن: آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا

امریکہ کئی اعتبار سے ایک خوش نصیب ملک ہے۔اسے تاریخ کے ہر اہم موڑ پر بہترین قیادت میسر آتی رہی۔اقبال کے الفاظ میں نگہ بلند' سخن دلنواز' جاں پرسوز...... یہ باتیں کسی مرعوبیت کا اظہار نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش ہیں۔بڑی قوم یا بڑے لیڈر کیا ہوتے ہیں۔کیا بڑے لیڈر بڑی قوموں کو ہی ملتے ہیں۔رچرڈ نکسن کا یہ سوال مجھے اکثر ماضی میں لے جاتا ہے۔اس سوال کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے چند مشہور امریکی رہنماؤں کی زندگی کے اوراق کھنگالے۔یہ دیکھنے کیلئے کہ ان میں کون سے ایسے اوصاف ہیں جن سے ہم محروم ہیں۔امریکہ کے سارے Founding Fathers ہی کسی نہ کسی خوبی کے مالک نکلے لیکن جس شخص نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ابراہام لنکن تھا۔لنکن نہ ہوتا تو شاید امریکہ کئی حصوں میں بٹ چکا ہوتا۔

لنکن ایک غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔اس کی ابتدائی زندگی مشکلات کا مرقع تھی۔روزگار کی تلاش میں اس نے کئی ایک پیشے اپنائے لیکن کامیاب نہ ہوسکا اور پھر مجبوراً ایک روز اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کرلیا۔ وکالت کی بدولت اسے دلیل پیش کرنے کا فن آ گیا۔اس پر جو سب سے بڑا راز منکشف ہوا یہ تھا کہ ہر دلیل کارگر نہیں ہوتی۔وکیل کو کیا کہنا ہے اور کب کہنا ہے یہ جاننا بہت اہم ہے اور اگر یہ گرُ آ جائے تو پھر وکیل مقدمہ نہیں ہارتا۔امریکی تاریخ کے سب سے نازک مقدمے کا آغاز 1858 میں ہوا۔یہی شکاگو شہر۔یہی اس کی سرد ہوائیں۔یہی جھیلوں کی پرسکون خاموشی......لیکن وہ دن اتنے پرسکون نہ تھے۔کانگرس کے دو امیدواروں ابراہام لنکن اور سٹفین ڈگلس کے مابین غلامی کے موضوع پر تاریخی بحث کا آغاز ہونے لگا۔ یہ بحث سات تقاریر پہ مشتمل تھی۔ان سات تقاریر کو ہزاروں افراد نے سنا۔اسے امریکی تاریخ کی Most Famous Political Debate بھی کہا جاتا ہے۔لنکن کو قدرت پہلے ہی اس موقعہ کیلئے تیار کرچکی تھی۔اس نے اپنی گفتگو اور دلائل سے پورے امریکہ پہ ایک سحر ساطاری کردیا۔وہ جو غالب نے کہا:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ سینیٹر کا الیکشن نہ جیت سکا لیکن اس نے امریکہ کو ہلا کے رکھ دیا۔شکست نے اس کے عزائم کو اور مضبوط کر دیا۔ وہ مایوس ضرور تھا مگر اس نے سچائی کا ساتھ نہ چھوڑا۔نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال بعد 1860 میں سینٹ کے الیکشن کا ہارا ہوا یہ امیدوار امریکہ کا سولہواں صدر بن گیا اور پھر زندگی کی آخری سانس تک صدر رہا۔اس کی قیادت میں امریکہ کو دوبارہ زندگی ملی۔امریکی ریاستیں اس وقت بکھرنے کے قریب تھیں۔شمال اور جنوب میں ناقابل عبور خلیج حائل ہو چکی تھی یہاں تک کہ لنکن کے صدر کا حلف لینے سے قبل ہی جنوب کی ریاستوں فلوریڈا' مسسی پی' الباما' جارجیا' لوزیانا اور ٹیکساس نے یونین سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔کچھ ہی عرصہ میں ورجینیا' نارتھ کرولینا' ٹینی سی اور آرکنساس بھی اس فہرست میں شامل ہو گئیں اور واشنگٹن ڈی سی کے مقابلہ میں رچمنڈ کو بطور دارالحکومت اور جیفرسن ڈیوس کو صدر بھی منتخب کر لیا گیا۔یہیں سے لنکن کی سیاسی سمجھ بوجھ کا امتحان شروع ہوا۔وائٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوا یہ شخص محض سیاستدان نہیں بلکہ ایک مدبر بھی تھا۔رفو گری کا کام اس نے اس خوبی سے کیا کہ تاریخ بھی حیران رہ گئی۔امریکہ میں اب تک چوالیس صدر منتخب ہو چکے ہیں جب بھی ان چوالیس میں سے تین عظیم صدور کا انتخاب ہوتا ہے تو ہر بار ابراہام لنکن' جارج واشنگٹن اور روز ویلٹ ہی منتخب ہوتے ہیں۔ان تینوں میں بھی لنکن کو پہلے نمبر پر رکھا جاتا ہے۔ہر نئے پول میں اس کی مقبولیت پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔وہ ان لوگوں کی فہرست میں شامل ہے جن کی عظمت کا راز آہستہ آہستہ آشکار ہوتا ہے۔امریکی آئین سے محبت اور قانون کی بالادستی کا عزم' یہ وہ دو خوبیاں ہیں جن میں وہ اپنے تمام اہل وطن سے آگے تھا۔وہ بہترین مقرر اور مدبر ہونے کے علاوہ سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔بہادر' فراخدل' موقعہ شناس......وہ قوم پرست بھی تھا۔اس کے یہ الفاظ صرف امریکہ کو نہیں دنیا بھر کو متاثر کرتے ہیں:

"A house divided against itself can not stand. I believe this government cannot endure permanently half slave and half free"

امریکی تاریخ کی ایک سب سے اہم دستاویز Declaration of Independence سے اسے جنون کی حد تک عشق تھا۔اس کا کہنا تھا کہ امریکی آئین کو اسی دستاویز کی روشنی میں پڑھا جانا چاہیے۔

Govt. of the people by the people for the people اسی کا مشہورِ عالم فقرہ ہے۔ وہ پہلا امریکی صدر تھا جو اپنی صدارت کے دوران قتل ہوا۔ موت بسا اوقات زندگی کو دوام دے دیتی ہے۔ اس کی موت نے اسے طلسماتی اور غیر مرئی شخص بنا دیا۔ سوال یہ ہے کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر لنکن ہی صدر کیوں بنا۔ اس کی قوم نے صدارت کا تاج کسی اور کے سر پہ کیوں نہ رکھا۔ سٹیفین ڈگلس یا کوئی اور۔ یہ اتفاق تھا یا قدرت کا سوچا سمجھا فیصلہ۔ کیا بڑی قوموں کو ہی بڑے لیڈر ملتے ہیں۔ نکسن کا سوال بہت مشکل ہے۔ پلوٹارک، کارلائل اور ٹائین بی۔ کہیں سے جواب نہیں ملتا۔ مختار مسعود اپنی مشہور کتاب آوازِ دوست میں کہتے ہیں: ''قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے۔ بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بھی کچھ اصول ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور دیئے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ آخر قدرت ایک سپاس نا آشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے......اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بے قدری ناگوار گذرتی ہے۔'' کئی ہزار فٹ کی بلندی پر۔ شکاگو سے ڈیلس جاتے ہوئے ایک حقیقت کا کھویا ہوا سرا ہاتھ آنے لگا۔ بڑے لیڈر بڑی قوموں کو ہی ملتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی چھوٹی قوموں کو بھی یہ انعام مل جاتا ہے۔ اس امید میں کہ شاید یہ لوگ راہِ راست پر آجائیں۔ شاید کوئی قدرت کے طریقوں کو سمجھ لے۔ لیکن یہ اصول نہیں کیونکہ قدرت کو 'اپنے عطیے کی بار بار رسوائی ناگوار گذرتی ہے' ......اگلا سوال تھا کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر بڑی قومیں کون سی ہوتی ہیں۔ جواب ملا۔ بڑی قوم وہ ہے جس کے لوگ شکر گذار ہوں، انصاف پسند ہوں اور حکمرانوں کے احتساب کی جرات رکھتے ہوں۔ روشن ضمیر اقوام کو ہی روشن ضمیر قیادت ملتی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے یوں ہی تو نہیں کہا کہ وہ لوگوں کی حالت میں تبدیلی نہیں لاتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔ جو لوگ زوال کو مقدر سے جوڑتے ہیں وہ ہمیشہ زوال میں رہتے ہیں۔

3.3۔ ٹیکساس: دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

شکاگو سے جہاز کو روانہ ہوئے صرف دو گھنٹے ہوئے تھے۔ ڈیلس پہنچنے میں ابھی ایک گھنٹہ اور باقی تھا۔ میں نے اپنا بیگ ٹٹولا اور وہ کاغذ دیکھنے لگا جن میں ٹیکساس اور ڈیلس کے بارے میں معلومات دی گئی تھیں۔ کسی بھی شہر میں تعارف کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔ اگر آپ شہر کی تاریخ سے آگاہ نہیں تو وہاں جا کے کیا دیکھیں گے۔ عمارتیں، سڑکیں اور مکان۔ یہ شہر نہیں۔ شہر تو لوگ ہیں اور لوگوں کو جاننے کے لیے تاریخ اور تہذیب کو

سمجھنا ضروری ہے۔ٹیکساس رقبے اور آبادی کے اعتبار سے امریکہ کی دوسری بڑی ریاست ہے۔ٹیکساس ایک مقامی زبان کا لفظ ہے جو بعد میں ہسپانوی زبان کا حصہ بنا۔اس لفظ کے معنی ہیں دوست۔اسپین نے 1600 عیسوی کے بعد اس علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کیا تو اس کو یہ نام دیا گیا۔فاتح مفتوح کو دوست نہیں بناتے۔ یہ نام نوآبادیاتی حکمتِ عملی کا ایک حربہ تھا۔ اڑھائی کروڑ سے زائد افراد پر مشتمل یہ ریاست آج امریکہ کی اہم ریاستوں میں شمار ہوتی ہے۔وادیوں' جنگلوں' ساحلوں اور صحراؤں کی سرزمین۔ کہیں کہیں اونچے پہاڑ۔دوسوسال پہلے ٹیکساس کا زیادہ تر حصہ چراگاہوں پر مشتمل تھا جہاں مویشیوں کے ریوڑ پالے جاتے۔ پستول یا بندوق اٹھائے' گھوڑے پہ بیٹھا کوئی مہم جو۔ٹیکساس کا عمومی تاثر ابھی تک کاؤبوائے اسٹیٹ کا ہے۔ٹیکساس کو چھ پرچموں کا دیس بھی کہا جاتا ہے۔گذشتہ تین سوسال میں یہاں چھ ممالک کا قبضہ ہوا اور چھ مختلف پرچم لہراتے رہے۔سب سے پہلے اسپین۔اس کے بعد مختصر عرصہ کیلئے فرانس' پھر میکسیکو۔1836 میں ٹیکساس نے میکسیکو سے بغاوت کی اور اسے ایک آزاد ملک کا تشخص ملا۔لیکن یہ آزاد حیثیت دس برس سے زیادہ برقرار نہ رہی۔1845 میں یہاں کے لوگوں نے اپنی رضامندی سے امریکہ کی ریاست بننا قبول کیا۔چونکہ ٹیکساس میں غلامی کو جائز قرار دیا گیا تھا اس لیے امریکی سول وار کے دوران ٹیکساس دیگر جنوبی ریاستوں کے ہمراہ امریکہ سے علیحدہ ہوگیا۔ 1861 میں اس علیحدگی کا باقاعدہ اعلان کیا گیا اور جنوبی ریاستوں کی ایک کنفیڈریشن وجود میں آئی۔سول وار کے دوران یہ علاقہ جنگ کا میدان تو نہ تھا لیکن جنوبی افواج میں بہت سے لوگ یہاں سے بھرتی ہوئے۔اس جنگ میں ٹیکساس اور اس کی حلیف ریاستوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔یوں ٹیکساس ایک بار پھر امریکہ کا حصہ بن گیا۔اپنے وسیع رقبے کی بدولت امریکی سیاست میں آج اس ریاست کا بے حد اہم کردار ہے۔ امریکہ کی پانچ سو (Fortune 500) بڑی کاروباری کمپنیوں میں سے ستاون کمپنیوں کا تعلق اسی ریاست سے ہے۔یہ کسی بھی ریاست میں موجود بڑی کاروباری کمپنیوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔زراعت' کمپیوٹر' توانائی' الیکٹریسٹی' ایروسپیس کونسا ایسا شعبہ ہے جس کی صنعت یہاں موجود نہیں۔بہترین یونیورسٹیاں ٹیکساس کا ایک اور طرۂ امتیاز ہیں۔رقبہ میں فرانس' جرمنی اور جاپان سے بڑی یہ ریاست محنت کرنے والوں کے لیے سونے کی کان ہے۔زراعت' معدنیات اور صنعت......ان تینوں میدانوں میں سب سے آگے۔انسانی وسائل کی فراوانی۔علم و ہنر کی بہتات اور پھر سماجی اور معاشی انصاف کے جلو میں چلتا ہوا جمہوری نظام۔یہ

سب عوامل مل جل کر ایک توانا معاشرے کی بنیاد بنتے ہیں۔ چاروں موسم۔سرما، بہار، گرمیاں اورخزاں۔ یہاں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اس لیے بھی کہ یہاں کا موسم کراچی سے بہت ملتا ہے۔1840 تک ٹیکساس کی آبادی چالیس ہزار سے بھی کم تھی۔اب یہ آبادی کروڑوں میں ہے۔ٹیکساس کی معیشت بھارت اور کینیڈا سے بڑی ہے۔فی کس آمدنی چالیس ہزار ڈالر سے زائد ہے۔یہاں دنیا کے ہر حصے کے لوگ آباد ہیں۔لاتعداد زبانیں اور مذہبی گروہ۔رنگ اور نسل کی بھی کوئی قید نہیں۔تہذیب اور ثقافت پر اسپین کا اثر بہت گہرا ہے۔ٹیکساس کو کئی اعتبار سے قدامت پسند کہا جاتا ہے۔مذہب کا اثر ہونے کی وجہ سے اس کا شمار امریکہ کی Bible Belt میں ہوتا ہے۔کچھ لوگ اسے Bukle of the Bible Belt بھی کہتے ہیں۔اس سے یہ مراد نہیں کہ یہاں ہر طرف مذہب کا چرچا ہے یا ہر گرجا گھر پر سپیکر لگے ہوئے ہیں۔کیتھولک، پروٹسٹنٹ، مسلم، یہودی، ہندو، سکھ اپنے اپنے طور پر بظاہر آزاد لیکن امریکی آئین کی زنجیر میں بندھے ہوئے۔ترقی، خوشحالی، معیشت، فی کس آمدنی، آئین اور قانون۔کامیابی کا یہ سفر دیکھ کر اپنی طرف دھیان جاتا ہے۔دکھ، درد اور احساس زیاں اور بڑھنے لگتا ہے۔ننانوے فیصد ایک ہی مذہب کے پیروکار اور مسجدوں پہ پہرے:

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

3.4۔آبائی باشندے اور سیاہ فام......داستانِ خونچکاں

ٹیکساس ہو یا امریکہ کی کوئی بھی اور ریاست۔امریکہ کی تاریخ کو عام طور پر سولہویں یا سترھویں صدی سے شروع کیا جاتا ہے۔اس سے پہلے کے واقعات کا تذکرہ بہت کم سنائی دیتا ہے۔سولہویں صدی سے پہلے کی کہانی کیا تھی۔وہ مقامی لوگ کیا ہوئے جو اصل داستان ہیں۔الاباما، آپاشی، اتاکاپن، بیدائی، کادو، کوانچی، چوکتا، حیسنائی، جمانو، کران کاوا، کسکاپو، کی ادوا، تونکاوا، واچیتا......یہ بھی تو کوئی نام تھے جنہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل دیا گیا یا بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالا گیا۔صفحۂ ہستی سے مٹنے والے یہ نام انسانی حقوق کے دعووں کی قلعی کھول دیتے ہیں۔کمزور، نہتے، ناتواں جو اس سرزمین کے اولین باشندے تھے لیکن ان میں سے اکثر کو بحراوقیانوس سے لے کر بحرالکاہل تک کہیں پناہ نہ ملی۔کچھ پرانے قبائل اوکلاہوما میں ابھی

تک اپنی تہذیب اور ثقافت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں لیکن وہ کتنی دیر اور جڑے رہیں گے یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ اور پھر وہ کروڑوں سیاہ فام جن کے خون پسینہ سے یہ جنت تعمیر کی گئی۔ جن پر ہونے والے ظلم کی تصویر امریکہ کے ہر بڑے شہر میں آویزاں ہے۔ جن کی زخمی اناؤں کی شکست خوردہ آواز ابھی تک سنائی دیتی ہے۔ سیاہ فاموں پر ظلم کی یہ کہانی پڑھنی ہو تو ان چھوٹی چھوٹی بستیوں میں جانا پڑتا ہے جہاں یہ لوگ آباد ہیں۔ ہر بڑے شہر کے عین وسط میں موجود یہ بستیاں پورے امریکہ کا منہ چڑاتی ہیں۔ اگر ان بستیوں کی طرف گذر نہ ہو تو پھر مشہور سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر یا میلکم ایکس جیسے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جن کے باغیانہ خیالات کی وجہ سے انہیں جوانی میں قتل کر دیا گیا۔

میلکم ایکس امریکی تاریخ کا سربستہ راز ہے۔ اس کی خودنوشت سوانح عمری ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے جو ظلم سے نفرت کرتا ہے اور اچھے سماج کے خواب دیکھتا ہے۔ یہ کتاب روٹس Roots نامی کتاب کے مشہور مصنف ایلکس ہیلی Alex Haley کی مدد سے لکھی گئی۔ اس کتاب کا ایک ایک لفظ بغاوت کے علاوہ درد اور غم کی تصویر بھی ہے۔ صد ہا برس کے آنسو اور آہیں۔ میلکم ایکس کہتا ہے کہ کروڑوں سیاہ فام افراد کو افریقہ سے غلام بنا کر امریکہ لایا گیا۔ ''کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ میں سمندروں کی گہرائی میں بکھرا ہوا خون، انسانی گوشت کے لوتھڑے، ٹوٹی ہوئی ہڈیاں اور کچلی ہوئی کھوپڑیاں دکھا سکتا۔ یورپی تاجروں کے بحری جہاز افریقہ جاتے اور غلاموں سے بھر کے آتے۔ شارک مچھلیاں ان جہازوں کا پیچھا کرتیں۔ انہیں علم ہوتا تھا کہ ان جہازوں سے انسانی گوشت کھانے کو ملتا ہے۔ ایک صدی کے عرصہ میں گیارہ کروڑ سیاہ فام یا تو غلام بنا لیے گئے یا پھر قتل کر دیے گئے''۔ آبائی امریکی باشندے اور سیاہ فام......امریکہ کی اولین تاریخ پہ لگے ہوئے دو دھبے......شرمندگی، خجالت، پشیمانی۔ اب تو وہ دور نہیں۔ اب تو جنت بس چکی۔ اب یہ کہانی کیوں دہرائی جاتی ہے۔ فلسطین، عراق، افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقے۔ آنسو، آہیں اور بے گور و کفن لاشیں۔ افسوس صد افسوس! کہ طاقتور تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھتا۔

3.5۔ گئے دنوں کا سراغ لے کر

جہاز کے قدم رکے۔ مسافروں کو سامان اٹھانے کی جلدی تھی۔ میں نے بھی چند کتابوں پر مشتمل بیگ اٹھایا اور ہم سب باہر کی طرف چل دیئے۔ مسافروں کی آمد اور روانگی کے سارے منظر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ شور،

شرابہ، ہلچل، گہما گہمی ۔ بس چہروں کا فرق ہوتا ہے۔ خوبصورت چہروں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے ہم کنو یئر بیلٹ پر پہنچے۔ ابھی سامان نہیں پہنچا تھا کہ وہ تین لوگ نظر آئے جن سے ملاقات کی کشش ہمیں یہاں لائی تھی ۔ فتح خان، سپنا اور دولت ۔ تینوں بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئے ۔ فتح خان ۔ چالیس سال پرانا دوست ۔ یہ وہ دوستی ہے جسے وقت سونا بنا دیتا ہے۔ آج اس سے سات آٹھ برس بعد ملاقات ہو رہی تھی ۔ میاں محمد بخش کی بات یاد آئی ''جہناں باجوں جھٹ نئیں سی لنگدا' اوشکلاں یاد ناں رہیاں'' (جن کے بغیر ایک لمحہ گذارنا مشکل تھا ان کے نقوش تک یاد نہ رہے)۔ چالیس برس بالکل سامنے پڑے تھے۔ وہ غالباً ستمبر 1972 کے دن تھے جب ہم نے گورنمنٹ کالج میں قدم رکھا۔ اس صبح جب میں اقبال ہوسٹل کے کمرہ نمبر ساٹھ میں پہلی بار داخل ہوا تو وہاں ایک لڑکا کرسی پہ بیٹھا قرآن پاک پڑھ رہا تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ توقف کے بعد قرآن پاک بند کیا اور اپنا تعارف کروانے لگا۔ فتح خان بندیال ۔ وہ معذرت خواہ تھا کہ اسے ایک رات عارضی طور پر ہمارے کمرے میں ٹھہرنا پڑا۔ پہلی ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں ڈھل گئی۔

اگلے پانچ سال، جب تک کہ وہ آکسفورڈ نہیں چلا گیا اسی رفاقت میں گذر گئے ۔ پاکستان سے انگلینڈ، انگلینڈ سے برونائی اور برونائی سے امریکہ۔ اس کا سفر بہت طویل تھا۔ اسی سفر کے دوران جب وہ برونائی میں مقیم تھا اس کی ملاقات سری لنکا کی ایک خاتون سے ہوئی اور وہ دونوں اپنے اپنے راستے بھول کر ایک نئی ڈگر پر چل پڑے۔ محبت کے بعد اگر کچھ اور یاد رہے تو وہ محبت نہیں ہوتی کچھ اور ہوتا ہے۔ سپنا پریرا کے والد برونائی میں سری لنکا کی جانب سے سفارت کار تھے۔ دونوں خاندانوں کی شدید مخالفت بھی محبت کی اس یلغار کو نہ روک سکی۔ کئی اور لوگوں نے بھی اسے شادی سے روکنا چاہا لیکن اس کی دیوانگی اور جنون دیکھ کے چپ ہو گئے ۔ وہ ہر کام سچائی کے ساتھ کرتا ہے۔ ساری کشتیاں جلانے کے بعد۔ کچھ کہنا، کچھ سمجھانا بے سود تھا۔ شادی کے بعد وہ امریکہ چلا آیا۔ جہاں وہ اور اس کی بیگم سپنا بندیال وکیل ہیں ۔ ان کی ایک دس سالہ بیٹی ہے جس کا نام دولت حفیظ بندیال ہے۔ یہ نام اس نے اپنی والدہ اور والد کے نام پر رکھا۔ اس کی والدہ انتہائی مہربان اور باوقار خاتون تھیں ۔ وہ ہم دونوں سے محبت کرتی تھیں ۔ یہ محبت بھی ہمارا مشترکہ اثاثہ ہے۔ دس سالہ دولت مجھے گلے ملی تو یوں لگا جیسے گئے دنوں کی خوشبو نے گھیرے میں لے لیا ہو۔ ڈیلس کا ایئرپورٹ گاؤں کی اس قدیم حویلی میں بدل گیا جہاں ہم ایک ماں کی محبت سے سرفراز ہوتے تھے۔

3.6۔ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

جونہی ہم ایئرپورٹ سے باہر نکلے' امریکی شہروں کے وہی مانوس منظر دکھائی دینے لگے۔ ہائی ویز' ٹریفک' بلندوبالا عمارتیں۔ میں اور ایف کے جلد ہی خاموش ہونے لگے۔ پرانی دوستی میں یہی تو خوبی ہے۔ خاموش رہتے ہوئے بھی بات نہیں رکتی۔ البتہ اس کی بیٹی دولت چاہتی تھی کہ اجنبیت کے فاصلے چند لمحوں میں عبور کر لے۔ ایف کے اور سپنا نے اسے میرے بارے میں بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ راستے میں ہم کچھ دیر کے لئے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں رکے اور پھر گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچتے ہی دولت نے میرا گھیراؤ کر لیا۔ ''میں امریکہ کیوں آیا ہوں''۔ ''اخوت کیا ہے''۔ مجھے دولت کے ان سوالوں کا تفصیلی جواب دینا پڑا۔ بچپن کا تجسس چھوٹے چھوٹے سوالوں میں ڈھلتا رہا۔ ''کیا پاکستان میں اب بھی بجلی بند ہوتی ہے؟'' چند سال پہلے وہ پاکستان آئی تو اسے اپنے گاؤں میں سخت لوڈ شیڈنگ میں رہنا پڑا۔ میں اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ ہاں! بجلی اب بھی بند ہوتی ہے۔ میں نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''یہ لوڈ شیڈنگ کب ختم ہوگی؟'' اس نے اگلا سوال پوچھا۔ جب تم پاکستان واپس آ کر ہماری لیڈر بنو گی۔ یہ جواب سن کے وہ مسکرانے لگی۔ دولت کے سوال ختم نہیں ہو رہے تھے بالآخر سپنا اور ایف کے میری مدد کو پہنچے۔ ان کے کہنے پہ اس نے اکتفا کیا۔ کھانے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ کھانے میں پاکستان اور سری لنکا دونوں کی خوشبو شامل تھی۔ کھانے کے بعد چائے اور پھر گفتگو کا ایک طویل دور۔ جب ہم لڑکپن سے نکل کر یونیورسٹی کے دور میں داخل ہوئے۔ گورنمنٹ کالج کی یادیں امڈ کر آنے لگیں۔ یوں لگا جیسے ساون کی کوئی رُت ہو۔ وہ استاد جو ہمیں پڑھاتے رہے۔ وہ کتابیں جو مشعلِ راہ بنیں۔ وہ دوست جو ہمارا اثاثہ تھے۔ واقعے' حادثے' سانحے' خوشیاں' مسرتیں۔ ان چند برسوں میں جو کچھ ہوا ان کو دہرانا بھی ایک تجربہ تھا۔

ہم ساری رات ان خوابوں کی باتیں کرتے رہے جو ہم نے دیکھے۔ ہم ان دنوں زندگی کو بدلنا چاہتے تھے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم ہمیں اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ نظریاتی کش مکش کا دور بھی تھا۔ لیکن کوئی ایسی بڑی تبدیلی رونما نہ ہو سکی۔ ہم سمجھتے تھے کہ شاید تبدیلی نعرے لگانے سے آتی ہے یا پھر یہ کہ انقلاب کا سورج طلباء کی سیاست کے افق سے طلوع ہوگا۔ انتشار اور ابہام تھا۔ لیکن جذبوں کی شدت بھی تھی۔ گورنمنٹ کالج کا سب سے بڑا انعام وہاں ملنے والے دوستوں کو کہا جاتا ہے۔ بہترین ساتھی' بہترین

رفیق۔ ان میں سے کچھ ملک چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ کچھ ڈاکٹر بن گئے۔ کچھ نے کاروبار یا سول سروس میں پناہ لی' کچھ عملی سیاست میں داخل ہونے لگے۔ اپنی اپنی زندگی میں کامیاب و کامران۔ سب کے دن بدل گئے لیکن پاکستان کے دن نہیں بدلے۔ غربت' افلاس' دکھ' درد۔ یہ ویسا ہی رہا۔ انفرادی تبدیلی' نظام کی تبدیلی کا نعم البدل تو نہیں ہوسکتی۔ ہم نے ان بے شمار لوگوں کو یاد کیا جواب دنیا میں نہیں۔
''تم نے سول سروس چھوڑ کے بہت اچھا کیا''۔ ایف کے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ واحد شخص تھا جس نے میرے سول سروس میں جانے کے فیصلے کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ جب میں مقابلے کا امتحان دینے لگا تو اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ'' تم اس امتحان میں پہلی دوسری یا تیسری پوزیشنز میں سے کوئی پوزیشن لو گے اور یہ بھی کہ بہت جلد تم یہ ملازمت بھی چھوڑ دو گے''۔ یہ دونوں باتیں سچ ثابت ہوئیں۔ 2003 میں جب میں نے سول سروس سے استعفیٰ دیا تو سب سے زیادہ خوشی اسی کو ہوئی۔

''ہم تبدیلی نہیں لا سکے لیکن جن لوگوں کو تم غربت کی دلدل میں گرنے سے بچا رہے ہو وہ تبدیلی ضرور لائیں گے''۔ ایف کے نے رات کے آخری پہر پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب میں نے آواز دی تو وہ دوبارہ میری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔ ''شاید تم یہ تبدیلی دیکھ سکو لیکن میں یہ سب نہ دیکھ پاؤں گا''۔ اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی میں ایک عجیب طرح کا سناٹا تھا۔ میرا دوست فتح خان۔ جس کی مسکراہٹ میں زندگی کھنکتی تھی۔ اس طرح اداس اور پژمردہ تو میں نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی۔ گہرا سکوت اور سناٹا۔ اچانک وہ صوفے سے اٹھا اور الماری سے ایک فائل نکال کر مجھے تھمانے لگا۔ یہ فائل اس کی بیماری کی رپورٹس پر مشتمل تھی۔ وہ ایک انتہائی مہلک اور جان لیوا مرض کا شکار ہو چکا ہے۔ فائل پڑھ کر میں دکھ کے گہرے سمندر میں جا گرا۔ گلین بیری سنڈروم۔

3.7۔ شعلہ جس نے مجھے پھونکا میرے اندر سے اٹھا

گلین بیری سنڈروم کی پہلی نشانی اعصابی نظام کی شکست و ریخت ہے۔ اس بیماری کا آغاز عضلات کی کمزوری اور ٹانگوں میں چبھن سے ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بیماری تمام جسم کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سارے بدن میں کانٹے سے چبھ رہے ہوں اور پھر پورا جسم مفلوج ہو کے رہ جاتا ہے۔ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا

یہاں تک کہ کھانا پینا مفقود ہو جاتا ہے۔ مصنوعی تنفس کے بغیر مریض کا بچنا محال ہوتا ہے۔ یہ بیماری بہت عام نہیں ہے۔ وجوہات کا بھی کسی کو علم نہیں اور علاج بھی دریافت نہیں ہو سکا۔" شعلہ جس نے مجھے پھونکا میرے اندر سے اٹھا،" جسم کا مدافعاتی نظام Immun e System خود ہی جسم پر حملہ آور ہو کر توڑ پھوڑ کرنے لگتا ہے۔ چونکہ یہ بیماری اچانک حملہ آور ہوتی ہے اس لیے فوری علاج نہ ملنے پر زندگی کا بچنا بہت محال ہوتا ہے۔ ایف کے کو اب تک اس بیماری کے کئی حملے ہو چکے ہیں۔ مرض کے شکار تین فیصد افراد کو اس کا حملہ بار بار ہوتا ہے اور یہی تین فیصد انتہائی خطرے کی زد میں ہوتے ہیں۔ پہلے حملے کے موقعہ پر اس کا بچنا کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔ کئی ہفتے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں پڑا رہا۔ سپنا نے اس کی جس طرح دیکھ بھال کی وہ محبت کی معراج تھی۔ ان تین ہفتوں میں وہ کئی بار موت کے منہ میں گیا۔ لیکن ہر بار زندگی کی شمع گل ہونے سے بچتی رہی۔ اس نے اپنی بیماری کی کسی کو خبر نہ کی۔ یہ ساری اذیت خود ہی اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے مجھے اشارۃً بتایا لیکن تفصیل کا علم اب آ کے ہوا۔ یہ بیماری کئی بار اس پر حملہ آور ہو چکی ہے۔ چند ہفتے قبل بھی ایک ہلکا سا حملہ ہوا تھا۔ اس بیماری میں اعصابی نظام کی خرابی کا اثر دماغ تک نہیں پہنچتا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی متاثر نہیں ہوتیں۔ لیکن جسم کے اور حصے ساتھ نہ دیں تو ذہن رسا کیا کر سکتا ہے۔ میں بیماری کی رپورٹس دیکھ کے اور ایف کے کی باتیں سن کے سن ہو کے رہ گیا۔ وہ شخص جو گفتگو کرتا تو جادو سا بکھر جاتا، قلم اٹھاتا تو لفظ جگمگا اٹھتے، جس کی ذہانت کے سامنے کسی کا دیا نہ جلتا...... میرا وہ دوست آج کتنا بے بس اور لاچار لگ رہا تھا۔ ہم نے شاید زندگی کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں...... وہ جو مہاتما بدھ نے کہا کہ حیات دکھ ہے ممات دکھ ہے۔ یہ ساری موہوم و بے نشاں کائنات دکھ ہے.......... میں نے اور ایف کے نے دکھ سے لڑنے کے خواب دیکھے لیکن آج ہم میں سے ایک، خود دکھ کی تصویر بنا بیٹھا ہے۔ رنج والم، بے بسی اور مجبوری۔ میں نے اسے دلا سا دینے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنے الفاظ بے معنی نظر آئے۔ ہم دونوں نے خاموش ہونا ہی مناسب سمجھا۔ گریباں چاک کیے بغیر بھی تو گریہ ہوتا ہے۔

"جب میری انگلیاں لکھ نہیں پاتیں، جب میرے ہاتھ پاؤں جواب دے جاتے ہیں، جب میرے لیے حرکت بھی ممکن نہیں رہتی......وہ لمحے اذیت کے لمحے ہوتے ہیں۔" سونے سے پہلے بہت دیر تک یہ فقرے میرے کانوں میں گونجتے رہے۔

3.8۔ کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

ہم سب چھوڑی ہوئی منزلوں کو یاد کرتے ہیں۔

مشہور کالم نگار عرفان صدیقی کا کہنا ہے کہ جو پاکستانی کسی اور ملک کی شہریت اختیار کر کے نئی سرزمین سے عہدِ وفا باندھتا ہے وہ اپنے اندر ایک لکیر ڈال دیتا ہے۔ اس لکیر کے ایک طرف اس کا دل ہوتا ہے۔ اس کے عزیز، اس کے رشتہ دار، اس کے دوست، اس کا گھر، اس کی یادیں، اس کے بڑوں کی قبریں اور دوسری طرف حصولِ رزق، آسودگی، خوشحالی، بہتر مستقبل کی تعمیر، بچوں کے لئے تعلیم و تربیت کے مواقع اور جدید سہولتوں سے آراستہ شب و روز کا ایک جہان .... وطن کسی عشقِ لاحاصل، متاعِ گم گشتہ یا خوابِ پریشاں کی طرح سلگتا رہتا ہے۔ تقسیم شدہ انسان کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ اپنا وطن محض ایک چھوڑی ہوئی منزل ہو کر رہ گیا ہے............ یہ منزل یاد تو ضرور آتی ہے لیکن اس شدت کا غم نہیں بن پاتی کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر وطن واپس آجائے۔ ایسا کم کم ہوتا ہے۔ عرفان صاحب کی یہ باتیں غلط نہیں۔ میں امریکہ میں بہت سے لوگوں سے ملا۔ ان میں سے کئی ایک اپنوں کے لئے پریشان بھی رہتے ہیں، روتے بھی ہیں لیکن واپس آنے کا ارادہ نہیں کرتے۔ دیارِ غیر کا حسن ہے، بہتر زندگی کی آرزو ہے یا پھر یہ پاکستان سے مایوسی ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ بجا لیکن جب کچھ لوگ اس چھوڑی ہوئی منزل کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ مجھے یہ سب باتیں اس وقت یاد آئیں جب ہم اگلے روز، دو پرانے دوستوں کو ملنے گئے۔ رات سونے سے پہلے میں اور ایف کے یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ہم اس کی بیماری کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ وہ میری موجودگی کے ان دو دنوں کو مکمل خوشی میں گذارنا چاہتا تھا۔ میں بھلا اس حالت میں اسے کیا کہتا۔ یوں بھی میں نے ہمیشہ اس کی ہر خواہش کا احترام کیا ہے۔ میرے پاس کچھ دوستوں کے فون نمبر تھے جن کو میرے یہاں آنے کی خبر تھی۔ ہم نے فون کیا ملاقات کا وقت دوبارہ طے ہوا اور ہم ان سے ملنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ میں، ایف کے اور سپنا۔ دولت تو سکول جا چکی تھی۔ جب ہم شہر کے باہر ہائی وے پہ پہنچے تو اچانک مجھے یاد آیا کہ ہم تینوں اس سے پہلے بھی ایسا ہی ایک سفر اکٹھے طے کر چکے تھے۔

یہ 2001 کی بات ہے جب ہم بالٹی مور سے پٹس برگ جا رہے تھے۔ سپنا وہاں یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ میں امریکہ آیا تو وہ دونوں مجھے ملنے بالٹی مور پہنچ گئے۔ مجھے بہت سے کام کرنا تھے لیکن انہوں نے میرا سامان

اٹھایا، گاڑی میں پھینکا اور اپنے ساتھ چپس برگ لے گئے۔ وہ ان کی محبت کے ابتدائی دن تھے۔ ایک عجب سی وارفتگی، ایک عجب سا بے ساختہ پن۔ محبت کے اولین دن بھی کیا دن ہیں۔ مگر یہ ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے۔ میں نے ایک نظر ان دونوں کو دوبارہ دیکھا۔ گیارہ برس گزرنے کے باوجود ابھی تک وہی وارفتگی اور بے ساختہ پن موجود تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میرا دوست بیماری کے باوجود غم کے ہاتھوں مغلوب نہیں ہوا۔ محبت کی اولین خوشبو ان کے ساتھ تھی۔ ہم سب سے پہلے جس دوست کے پاس پہنچے وہ ٹیکساس میں ہی ڈاکٹر تھا۔ ہاتھ ملاتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ یہ شخص وہ نہیں جسے میں جانتا تھا۔ اس کے رویئے میں سرد مہری تھی۔ ہمیں کچھ دیر کے لئے وہاں بیٹھنا پڑا لیکن اپنائیت کا ماحول پیدا نہ ہو سکا۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ تان ہر بار اسی پہ آ کے ٹوٹتی کہ پاکستان کے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ تو ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اجازت لینے میں ہی عافیت سمجھی۔ اگلا پڑاؤ بھی ایسے ہی ایک اور مہربان کے پاس تھا۔ ان کے رویے میں بھی وہی تنقید اور بے گانگی نظر آئی۔ شاید آج کا دن ہی ایسا تھا۔ ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ آپ کس گاڑی میں آئے ہیں اور پھر وہ اپنے گھر کی تصویریں دکھانے لگے جو انہوں نے چند ہی روز پہلے ڈیڑھ ملین ڈالرز میں خریدا تھا۔ تھیٹر، جمنیزیم، سوئمنگ پول۔ نہ جانے کیا کیا۔ سپنا کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب! باقی سب تو اچھا ہے لیکن کیا آپ اپنے گھر میں کچھ اجنبی سے نہیں لگتے''۔ اس نے ایک تصویر پہ انگلی رکھ کے کہا۔ ڈاکٹر صاحب یقیناً بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ البم سمیٹ کے ایک طرف رکھ دی۔ ہم نے جلدی جلدی چائے پی اور اجازت طلب کرنے کے بعد باہر نکل آئے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہم بڑی دیر تک ہنستے رہے۔ ظاہر ہے ان دو واقعات کے بعد تیسرے صاحب کے پاس جانے کی ہمت کون کرتا۔ یوں بھی سپنا کا خیال تھا کہ اس تھوڑے وقت میں مجھے ڈیلس کی سیر کرنی چاہئے۔ چلئے میں آپ کو اس جگہ لے کے چلتی ہوں جہاں مشہور امریکی صدر جان ایف کینیڈی کو گولی لگی تھی۔ وہی جان ایف کینیڈی جس کا ایک مشہور قول ہے کہ یہ مت پوچھو تمہارے وطن نے تمہیں کیا دیا، ہاں یہ ضرور پوچھو کہ تم اسے کیا دے سکتے ہو۔

"Ask not what your country can do for you, ask what you can do for your country"

یہ کہتے ہوئے اس کے ذہن میں یقیناً یہی دو افراد ہوں گے۔ جن سے ملنے کے بعد ہمیں اپنا وطن یاد آیا۔ ڈاؤن ٹاؤن اس جگہ تک پہنچنے میں ہمیں ایک گھنٹہ اور لگ گیا۔ اس ایک گھنٹہ میں ہمارا موضوع یہی تھا کہ ہم سب نے

اپنے اپنے وطن کو کیا دیا۔'' .... دنیا سمٹ رہی ہے لیکن اس دنیا میں وہ رومانویت ابھی نہیں مری جو وطن کے لفظ سے وابستہ ہے۔'' میرے کانوں میں عرفان صدیقی کا یہ فقرہ گونجتا رہا اور میں ان لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا جو وطن چھوڑ کے دیارِ غیر میں آ بسے۔ ان میں سے کچھ اپنے وطن کو بھول چکے تھے۔ اس وطن کو جہاں انہوں نے جنم لیا۔ جس نے انہیں پروان چڑھایا اور جس کی مٹی ان کی رگوں میں لہو بن کے دوڑتی ہے۔

3.9۔ ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

سپنا کا خیال تھا کہ آج کے دور میں کینیڈی کی کہانی کسی یونانی ہیرو کی المناک کہانی سے کم نہیں۔ جان ایف کینیڈی۔ امریکہ کا جواں سال صدر۔ خوبرو، ہردلعزیز۔ 1963 میں وہ ڈیلس کے وزٹ پہ تھا کہ ہاروے اوسوالڈ نامی قاتل نے اپنی بندوق سے ایسا نشانہ لگایا کہ کینیڈی موقعہ پر ہی دم توڑ گیا۔ اوسوالڈ نے یہ کام کیوں کیا۔ یہ بھی ایک راز ہے۔ کینیڈی کی عمر اس وقت صرف چھیالیس برس تھی۔ صدر بننے سے پہلے وہ سات برس تک سینیٹ کا رکن رہا اور پھر 1960 میں ری پبلیکن امیدوار رچرڈ نکسن کو شکست دے کر امریکہ کا صدر بنا۔ وہ واحد امریکی صدر تھا جسے ایک بہترین کتاب لکھنے پر پلٹزر ایوارڈ Pulitzer Award بھی ملا۔ Profiles in Courage نامی یہ کتاب ان امریکی لیڈرز کے تذکرے پہ مشتمل ہے جنہوں نے سیاست کے لئے اپنے نظریات کو قربان کرنے سے انکار کر دیا۔'' ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق''۔ تین سال کے دورِ صدارت میں کینیڈی کو کئی ایک قومی اور بین الاقوامی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوبا کا کرائسس، برلن کی دیوار، خلائی دوڑ، سول رائیٹس کی تحریک اور ویت نام میں جنگ کی ابتدا۔ کینیڈی ایک مقبولِ عام رہنما تھا۔ اس کے خاندان کو امریکی سیاست میں خصوصی مقبولیت حاصل رہی۔ اس کا ایک بھائی اٹارنی جنرل تھا اور ایک سینیٹر۔ کینیڈی کی بیوی جیکولین بھی ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اسے کینیڈی سے گہری محبت تھی۔ اس امر کے باوجود کہ اس کا خاوند ہالی وڈ کی مشہور ایکٹریس مارلن منرو کے علاوہ کئی اور بدنام خواتین کے ساتھ وقت گذارتا تھا۔ جیکولین کینیڈی کا پاکستان کا وزٹ بھی ایک یادگار واقعہ ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے میزبانی کی بہترین روایات کا مظاہرہ کیا۔ بشیر ساربان نامی ایک شخص نے اسے اپنے اونٹ پہ بٹھا کر کراچی کے ساحل کی سیر کروائی۔ کینیڈی کی موت کے کئی سال بعد جیکی نے مشہور یونانی ارب پتی اوناسس سے شادی رچالی۔ اپنی موت کے بعد جیکی بھی کینیڈی کے پہلو میں دفن ہوئی۔ کینیڈی کو ایلن سیگر Alan Seeger کی مشہور نظم "I have

"a randezvous with death بے حد پسند تھی۔ اب نہ تو کینیڈی ہے اور نہ ہی جیکولین کینیڈی۔ لیکن ایک امریکی بینڈ ان دونوں کی قبروں پر کبھی کبھار یہ نظم دہراتا ہے۔

کینیڈی نے 1963 میں امیریکن یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی میں ''دنیا میں امن'' کے موضوع پر ایک یادگار تقریر کی تھی۔ کینیڈی کی اس تقریر کے کچھ حصے میں نے وہاں پڑھے۔ گو اس یادگار تقریر کے الفاظ اور امریکہ کی موجودہ حکمتِ عملی میں کھلا تضاد نظر آتا ہے لیکن کینیڈی کے چند فقرے دہرائے جانے کے قابل ہیں:

"World peace, like community peace, does not require that each man love his neighbour... it requires' only that they live together in mutual tolelrance...Our problems are man-made. Therefore, they can be solved by man. And man can be as big as he wants"

کینیڈی کے کہنے کے مطابق انسان جس قدر چاہے عظیم بن سکتا ہے......انسان پر ہی کیا موقوف کوئی قوم بھی جتنا چاہے بلند ہوسکتی ہے۔ ترقی، عظمت اور اوجِ کمال۔ یہ ستاروں کی فتنہ گری نہیں یہ سب عمل کے تابع ہے۔ عمل ہوتو زندگی جنت ہے، نہ ہوتو جہنم سے بھی بُری۔ بڑے لوگ کون ہوتے ہیں۔ بڑی قوم کیسے بنتی ہے۔ نشیب وفراز کا فلسفہ کیا ہے۔ مجھے اپنے سوال کا جواب مل رہا تھا۔

3.10۔ شام کے کچھ مہمان

ڈیلس شہر میں کچھ دیر گھومنے کے بعد ہم سہ پہر تک گھر واپس پہنچ گئے۔ رات کو ایف کے نے چند دوستوں کو ڈنر پہ مدعو کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کا تعلق منگولیا اور ایک کا بھارت سے تھا جبکہ باقی سب امریکی تھے۔ بھارت سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون ڈاکٹر بھی تھیں۔ انہوں نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ مشرق کے وقار کا نمونہ۔ ان کی گفتگو میں بھی مٹھاس تھی اور لہجے میں بھی۔ ان کا نام گیتا تھا۔ انہیں امریکہ آئے بارہ سال ہو چکے تھے لیکن اردو ادب اور شاعری سے لگاؤ ابھی تک برقرار تھا۔ ان کی باتوں سے سات سمندر پار دلی کی یاد تازہ ہوگئی...... یہ دلی کی یاد نہیں اس تہذیب کی یاد تھی جس کا نام اردو ہے۔ چاندنی چوک، درگاہ حضرت نظام الدین اور مرزا غالب......اور پھر داغ اور فراق کے اچھے اچھے شعر:

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

امریکی مہمانوں کو اشعار کا مفہوم سمجھانا بہت مشکل کام تھا۔ شعر کوئی لفظ تو نہیں کہ ان کا ترجمہ کر دیا جائے۔ شعر تو واقعہ ہیں' کیفیت ہیں۔ شعر تو ایک تہذیب ہیں۔ ان کی باتوں سے شام بہت خوبصورت ہو گئی۔ پاکستان کے بارے میں لوگوں کے بہت سے سوال بھی تھے۔ کئی ایک دلچسپ' کئی ایک مشکل۔ غربت' افلاس اور محرومی۔ عالمی تناظر میں بات ہونے لگی۔ ہم دوارب لوگ پیچھے کیوں رہ گئے۔ انہیں بنیادی ضروریات کیوں میسر نہیں۔ صحت' تعلیم' گھر' ماحول...... یہ سب بالائی طبقوں تک کیوں محدود ہے۔ کیا ان دکھوں کا کوئی حل بھی ہے۔ ''اخوت'' کا مختصر تعارف بھی ہوا۔

ایک صاحب نے اسلام کے تصورِ مؤاخات کو مارٹن لوتھر کنگ کے بھائی چارے Brotherhood کے پیغام سے جوڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ انسانی حقوق کے لیے مارٹن لوتھر کنگ کی جدوجہد زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ جس مواخات کا ذکر ہم کرتے ہیں وہ کوئی اجنبی تصور نہیں۔ میں نے جب یہ بتایا کہ پاکستان میں ہزاروں لوگ' اس تصور کے تحت' ضرورت مندوں کو اپنانے کی خواہش رکھتے ہیں تو وہ لوگ حیران بھی ہوئے۔ ہم نے اپنے معاشرے کی اچھی باتیں لوگوں کو بہت کم بتائی ہیں۔ کھانا' کھانے کے بعد گفتگو کی ایک اور نشست۔ مجھے بہت کچھ جاننے کو ملا۔ ڈاکٹر گیتا کی گفتگو سب پہ بھاری تھی۔ اس گفتگو کے سارے لفظ اور استعارے اپنائیت کی خوشبو لیے ہوئے تھے۔ میں خواہش کے باوجود گیتا سے کچھ دیر اور رکنے کیلئے نہ کہہ سکا۔ اچھے لمحے بھی ریت کی طرح ہیں۔ بند مٹھی سے بھی سرک جاتے ہیں۔ مہمانوں نے رخصت ہونے کا ارادہ کیا۔ ان میں سے ایک دو کو چالیس کلومیٹر دور جانا تھا۔ ہم انہیں الوداع کہہ کے واپس ڈرائینگ روم میں پہنچ گئے۔ ایف کے کے چہرے پہ تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ رنج سے خوگر ہونا بھی تو رنج کا ایک علاج ہے۔ ہم نے کچھ دیر کیلئے پھر سے کالج کی یادوں میں پناہ ڈھونڈی۔ گورنمنٹ کالج کا اوپن ائیر تھیٹر اور بخاری آڈیٹوریم۔ یادوں کے موتی کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ہم نے بہت سے اچھے دنوں اور بہت سے اچھے لوگوں کو یاد کیا۔ میری والدہ کا ذکر ہوا تو ایف کے کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ انہیں بہت چاہتا تھا۔ وہ ان کے آخری لمحوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ یکدم ماضی کے بند کواڑ کھلے اور وہ

منظر دکھائی دینے لگا جب میں اپنی ماں کو دنیا سے رخصت کر رہا تھا۔ اس منظر میں بھی اخوت کی تصویر جڑی ہوئی ہے۔ آٹھ سال پہلے یہی اپریل کا مہینہ تھا۔

3.11۔ آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

17 اور 18 اپریل 2004۔

میری زندگی میں یہ دن غم سے بھرپور تھے۔ 17 اپریل' شام کا وقت جب میری ماں کے حصارِ جاں پہ موت نے دستک دی۔ وہ کچن میں کھڑی پانی پی رہی تھیں کہ زمین پہ گریں اور اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ یہ سب اچانک ہوا۔ نہ کوئی دکھ نہ تکلیف۔ نہ کوئی طویل بیماری۔ فوری طور پر انہیں ہسپتال پہنچایا گیا لیکن وہ تو کب کی رخصت ہو چکی تھیں۔ یکا یک محرومی کی سیاہ رات نے مجھے اپنی آغوش میں گھیر لیا۔ یوں لگا جیسے میں بے یارومددگار کھڑا ہوں اور غم کی منہ زور لہریں امڈی چلی آتی ہیں۔ ماں بہت سادہ اور دردمند انسان تھیں۔ مذہب سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ نرم رو' نرم خو۔ ہمہ وقت قربانی' ہمہ وقت ایثار۔ کاش ان اوصاف کا کچھ حصہ ہمیں بھی ودیعت ہو جاتا۔ سترہ اپریل کی وہ رات دکھ کی رات تھی۔ اٹھارہ کو انہیں قبر کی آغوش میں لٹانا تھا۔ عجب اتفاق کہ اسی روز سہ پہر کے بعد ''اخوت'' کی ایک تقریب بھی تھی جس میں صدرِ پاکستان مہمانِ خصوصی تھے۔ یہ تقریب گورنر ہاؤس میں منعقد ہو رہی تھی۔ گورنر' وزیر اعلیٰ' کور کمانڈر اور بیسیوں دیگر مہمان جن میں بے شمار ڈونرز بھی شامل تھے اور پھر وہ بہت سے بہادر خاندان جنہوں نے اخوت سے قرضے لے کر اپنی خوشحالی کے راستے تعمیر کیے۔ تین سو افراد پہ مشتمل یہ تقریب اخوت کے لیے ایک اہم سنگِ میل تھی۔ دو امتحان سامنے تھے۔ والدہ کی آخری رسومات میں شامل رہوں یا اس فرض کو نبھاؤں جو اخوت نے کندھوں پہ ڈالا ہے۔ ایک عجب سی کشمکش اور اضطراب۔ اپنی ذات کا دکھ یا ایک بڑا دکھ۔

فیصلہ ہوا کہ اپنے دکھ کے حصار سے نکلنا ہی اصل زندگی ہے۔ ماں کو اپنے ہاتھوں مٹی کے سپرد کیا۔ کپڑے جھاڑے اور تقریب میں جا پہنچا۔ دو گھنٹے ضبط کی ناقابلِ بیان کیفیت میں گذرے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ماں میرے ساتھ ہے اور خوش بھی ہے کہ میں نے اس کے غم کو ایک بڑے غم کے سامنے سرنگوں کر دیا۔ میرے کپڑوں پہ پڑی گرد دیکھ کر کچھ لوگ حیران بھی تھے لیکن کسی کو یہ علم نہ ہو سکا کہ میں قبرستان سے سیدھا یہاں پہنچا ہوں۔ ماں کو منوں مٹی تلے سلا کے سٹیج پر میں پاکستان کے صدر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ رنج و الم کا ایک

کوہِ گراں لیے۔ گورنر پنجاب اور صدرِ پاکستان نے اخوت کے تصور اور خدمات کو سراہا۔ اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ بہت سے لوگوں نے عطیات کا اعلان کیا جس میں صدر اور ان کی والدہ کے تین لاکھ بھی شامل تھے۔ میں نے مختصر الفاظ میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس دوران مجھے ماں کا شگفتہ اور مہربان چہرہ یاد آتا رہا۔ دکھ کی لہریں دل کی نازک رگوں سے ٹکرا کر دل میں ہی جذب ہوتی رہیں۔

ان دو گھنٹوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ بے ثباتی ' خود اختیاری ' بے نیازی...... مجھے اس روز علم ہوا کہ اخوت سے میرا عشق کتنا گہرا ہے اور یہ بھی کہ اپنے دکھ کو بھول جانے میں کتنی لذت ہے۔ کچھ لوگوں نے میرے اس طرزِ عمل پہ حیرت کا اظہار کیا۔ کچھ لوگوں نے کہا آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ یہ لوگ مجھے بہت اچھے لگے کہ وہ اس دیوانگی کو پہچان چکے تھے جس کا نام اخوت ہے۔ تقریب ختم ہوئی۔ میں واپس گھر پہنچا۔ لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے۔ میں مطمئن تھا کہ دردمندی کا جو تحفہ ماں نے دیا اللہ نے اس تحفہ کو غم کی نذر ہونے سے بچالیا۔ یہ اللہ ہی تو ہے جو سیدھے راستے پہ چلاتا ہے' گرنے سے بچاتا ہے اور اندھیری رات میں روشنی بکھیر دیتا ہے۔ میں نے ایف کے کو یہ ساری کہانی سنائی۔ چند آنسو اور طویل خاموشی۔ غم کے اظہار کے سو طریقے ہیں۔

3.12۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

صبح ہوئی اور ہم اگلی منزل کی تیاری کرنے لگے۔ آج مجھے نارتھ کیرولینا کے شہر ہائی پوائنٹ جانا تھا۔ ذکی الدین خلیفہ کے پاس۔ اخوت کے بہت بڑے مداح اور ساتھی۔ ذکی صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو سراپا نیکی ہیں۔ سامان تو ہم نے رات کو ہی باندھ لیا تھا۔ علی الصبح رخصت ہوتے وقت سپنا اور دولت کو الوداع کہا۔ دولت گلے لگ کے جھولنے لگی۔ اس کی خوبصورت اور معصوم گفتگو دل کو بھا رہی تھی۔ اس نے بہت پیار سے کہا ایک دن اور رک جائیں لیکن یہ شاید ممکن نہ تھا۔ اسے کیا علم کہ مجھے یہاں سے اتنی جلدی جانے کا کتنا غم تھا۔ ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈیلس انٹرنیشنل کی وسیع و عریض عمارت۔ میں اور ایف کے باتوں میں اتنے محو تھے کہ دو بار غلط ٹرمینل میں جا نکلے۔ بالآخر صحیح راستہ مل ہی گیا۔ تلاشی در تلاشی اور جہاز میں بیٹھنے کے مرحلے۔ چھوٹا سا جہاز لیکن نہایت نفیس اور خوبصورت۔ کچھ ہی دیر میں ہم فضا میں تھے۔ ہائی پوائنٹ تک ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ مسافر بھی زیادہ نہ تھے۔ میں گذشتہ دو دنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

ڈیلس میں گذرا ہوا وقت عجیب کیفیت سے ہمکنار کر گیا۔ ایک کسک' ایک بے چینی۔ ماضی کی بازیافت انتہائی خوش کن تھی۔ تیس پینتیس سال پہلے کے واقعات دل کو مسرت سے لبریز کرتے رہے۔ لڑکپن کی بے فکری اور پھر پرانے خواب اور اس آئیڈلزم کا تذکرہ جو نوجوانی کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ یوں لگا جیسے اخوت ان تمام خوابوں کا نقطۂ ارتکاز ہے۔ دوسری جانب ایف کے کی علالت کی خبر بجلی کی طرح گری۔ خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ دنیا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ اس کی بیماری نے جان نثار اختر کا ایک پرانا شعر یاد کروا دیا:

سا ری د نیا کے مر یضوں کو شفا د ے یا ر ب
آ ج معلو م ہو ا ہے کہ علا لت کیا ہے

دکھ صرف اس بات کا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے انصاف نہ کر پایا۔ اس کی خوبیاں ایک موذی مرض کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس نے بہت بھرپور زندگی گذاری اور پھر سپنا کی رفاقت میں زندگی کے بہترین دن لیکن وہ افسردہ تھا کہ اس زندگی میں وہ لازوال خوشیاں شامل نہ ہو سکیں جن کا تعلق دوسروں کی ذات سے ہے۔ وہ تبدیلی چاہتا تھا۔ وہ سیاست کے خارزار میں اترنا چاہتا تھا لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ فضائی میزبان نے آگے بڑھتے ہوئے پانی پیش کیا تو مجھے اس کیفیت سے نکلنے میں مدد ملی۔ مسکراہٹ کا ایک ہلکا سا دِیا روشن ہوا۔ سوچ کا رخ کسی اور طرف مڑنے لگا۔ ان لوگوں کی طرف جو تبدیلی کیلئے سیاست کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شخص کا نام ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ہے۔ جو سیاست دان بھی تھا' دانشور بھی اور ایک بڑا انسان بھی۔

3.13۔ ایسی چنگاری

کتنے لوگ ہیں جنہیں خلیفہ شجاع الدین کا نام یاد ہوگا۔

انیسویں صدی کے ڈھلتے ہوئے سائے۔ 1887۔ لاہور کے مشہور موچی دروازہ میں آباد ایک معروف علم دوست ''خلیفہ خاندان'' کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ والد محکمہ تعلیم کے افسر اور دادا انجمن حمایتِ اسلام کے بانی صدر۔ اس سے معتبر نسبت اور کیا ہوگی۔ علمی اور دینی ماحول۔ پہلے قرآن پاک حفظ ہوا پھر سنٹرل ماڈل سکول' اسلامیہ کالج' گورنمنٹ کالج' پنجاب یونیورسٹی' کیمبرج' لنکن ان' اور پھر کینٹبری سے قانون میں پی ایچ ڈی۔ یہ سب کچھ اٹھائیس سال کی عمر میں مکمل ہو گیا۔ وہ جو میر نے کہا:

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

وطن واپسی پر قانون کی پریکٹس۔ سماجی اور سیاسی سرگرمیاں۔ علمی اور فکری جہاد۔ لاہور کے میونسپل کمشنر سے لے کر پنجاب اسمبلی کا سپیکر بننے تک۔ کامیابی و کامرانی کی کونسی ایسی منزل تھی جو خلیفہ شجاع الدین نے طے نہ کی۔ دولت بھی کمائی اور نام بھی لیکن عزت کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ سیاست کے جوہڑ میں کنول کے پھول کی طرح تروتازہ' پاک صاف اور منفرد۔ ان کو زندگی میں جو چار عہدے حاصل ہوئے ان پر کوئی بھی فخر کرسکتا ہے۔ اسلامیہ کالج کے اعزازی پرنسپل (1942-43) 'لاہور ہائی کورٹ بار کے صدر (1946-50) 'انجمن حمایت اسلام کے صدر (1947-55) اور پنجاب اسمبلی کے سپیکر (1951-55)۔ یہ عہدے ان کی علمی' سماجی اور سیاسی خدمات کا حاصل تھے۔ ان عہدوں پہ انہوں نے خدمت کی جو روایات قائم کیں وہ آج بھی مشعلِ راہ ہیں۔ وہ پنجاب اسمبلی کے غالباً واحد سپیکر تھے جنہوں نے نہ سرکاری گاڑی لی اور نہ ہی تنخواہ قبول کی۔ اس عہدے پہ رہتے ہوئے ان کے گھر میں جو بھی تقریبات ہوئیں ان کا خرچ بھی ان کی اپنی جیب سے ادا ہوا۔ ان کی سفارش پہ کسی نااہل کو نوکری نہیں ملی اور نہ کسی کا ناجائز کام ہوا۔ نہ پلاٹ اور پرمٹ' نہ ذاتی تشہیر' نہ ہٹو بچو کی صدائیں۔ جب وہ جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تو پنجاب اسمبلی کے سپیکر تھے۔ رات بارہ بجے سینے میں درد اٹھا۔ بیگم کو بلایا اور کہنے لگے'' اب میں چلتا ہوں''۔ اگلے ہی لمحے آنکھیں بند کیں اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ دنیا کی متاع کو ہیچ سمجھنے والے ایسے ہی رخصت ہوتے ہیں۔ صداقت' امانت' دیانت۔ کسی کو یہ تصویر دیکھنا ہو تو خلیفہ شجاع الدین کو دیکھ سکتا ہے۔ نڈر بھی تھے اور انتھک بھی۔ زندگی کے آخری سال انجمن حمایتِ اسلام کے لئے وقف کر دیئے۔ یہ اعزاز بھی ان کے گھرانے کو حاصل ہے کہ دادا بھی انجمن کا صدر تھا اور پوتا بھی۔ مولانا صلاح الدین احمد نے کہا'' خلیفہ شجاع کا عہدِ صدارت انجمن کا عہدِ جہاں کشائی ہے......انہوں نے نہ صرف انجمن کی بگڑی ہوئی حالت کو سنبھالا بلکہ اس میں نئی روح پھونک دی۔ دیکھتے دیکھتے انجمن کی خدمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ زخم خوردہ بیواؤں' بے کس بچیوں' بے سہارا یتیموں کی کفالت سے لے کر نو جوانوں کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل تک بے شمار کام انجامِ نیک تک پہنچتے چلے گئے............انجمن کے جادۂ حیات پر ان کے یادگار نقوش تا اَبد رواں دواں رہیں گے''۔ اس

سے بڑھ کر معتبر گواہی اور کیا ہوگی۔ رہی سیاسی زندگی کی کہانی تو وہ پنجاب اسمبلی کے ایوان میں محفوظ ہے۔ ایک بار قائدِ ملت لیاقت علی خان نے گلہ کیا کہ پاکستان میں قابل اصحاب نہیں ملتے۔ خلیفہ شجاع الدین کا جواب تھا............ ''آپ نے اور آپ کے رفقاء نے قابل اشخاص کا ایک تنگ دائرہ بنا رکھا ہے۔ آپ کی نظر اس سے باہر نہیں جاتی۔ پھر آپ کو قابل اشخاص کیسے نظر آئیں''۔ راست گوئی' خود داری' بے نیازی اور توکل۔ وہ ان تمام خوبیوں کا مرقع تھے۔ اب یہ خوبیاں خال خال نظر آتی ہیں۔ جب سیاست کا مقصد دولت اور خدمت کا محور اپنی ذات بن جائے تو خلیفہ شجاع الدین پیدا نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ صرف ان قوموں کو ملتے ہیں جو شکر گذار ہوں' انصاف پسند ہوں اور حکمرانوں کے احتساب کی جرات رکھتی ہوں۔ سر محمد شفیع' سر فضل حسین' سر محمد اقبال' سر عبدالقادر' سر شہاب الدین۔ لیکن ایسے لوگ تو امتحان کے طور پر دیئے جاتے ہیں اور پھر سزا کے طور پر واپس لے لئے جاتے ہیں۔ ملک بھر میں کوئی گلی' کوئی سڑک کوئی شہر خلیفہ شجاع الدین کے نام سے منسوب نہیں۔ جب اہلِ شہر مغنیوں کو محسنوں پہ ترجیح دیں تو کچھ یہی ہوتا ہے۔ کئی ہزار فٹ بلندی پر سوچ کا رخ خلیفہ شجاع الدین کی طرف کیوں مڑا۔ بے داغ سیرت اور بے غرض خدمت کا حامل یہ شخص کیوں یاد آیا۔ اس لئے کہ ہمارے اگلے پڑاؤ ہائی پوائنٹ میں' ہمارے میزبان کا نام خلیفہ ذکی الدین تھا اور ذکی الدین خلیفہ شجاع الدین کے پوتے ہیں۔

3.14۔ خلیفہ ذکی الدین

سو پشت سے ہے پیشہء آبا سپہ گری۔

جہاز نے آہستگی سے زمین کو چھوا اور ہم چند لمحوں بعد اپنا سامان اٹھا رہے تھے۔ ایئر پورٹ پہ ذکی الدین اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھے۔ وہی گرم جوشی' تپاک اور انکساری۔ انہوں نے آگے بڑھ کے میرا سامان اٹھانا چاہا۔ انہیں روکنے کیلئے بہت اصرار کرنا پڑا۔ چند ہی لمحوں میں ہم گاڑی میں بیٹھے ان کے دفتر کی طرف رواں دواں تھے۔ ''1976 کا وہ کوئی ایسا ہی دن تھا جب میں اس ایئر پورٹ پہ اترا۔ ایک نیا خواب لے کر۔ میری جیب میں صرف چالیس ڈالر تھے اور چالیس ڈالر اس خواب کی تعبیر کے لئے بہت کم تھے''۔ ذکی صاحب نے مجھے بتایا۔ لیکن انہوں نے یہ نہ بتایا کہ ان چالیس ڈالرز کے علاوہ بھی ان کے پاس بہت کچھ تھا۔ محنت کا جذبہ اور وہی ایمانداری جوان کے بزرگوں کا خاصہ تھا۔ ذکی صاحب کام پہ جُت گئے۔ نہ دن دیکھا' نہ

رات۔ محنت رنگ لے آئی اور راستے کشادہ ہونے لگے۔ چھوٹے چھوٹے کئی کام کرنے کے بعد بالآخر قالینوں کا کاروبار شروع کیا۔ تیس برسوں پہ محیط یہ کہانی چند لفظوں میں کہاں بیان ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ امریکہ میں قالینوں کے بہت بڑے تاجر بن چکے تھے۔ جس دکان سے کام شروع کیا رفتہ رفتہ اس سے ملحق ساری دکانیں خرید لیں۔ 2001 میں اچانک ایک خیال آیا اور وہ دکانیں جن کی مالیت اس وقت تین ملین ڈالر کے قریب تھی شہر کے ایوانِ تجارت کو عطیہ کر دیں۔ پورا شہر حیران کہ یہ کیسا تاجر ہے۔ کروڑوں روپے کی جائیداد اجنبی شہر میں یہ کہہ کے بانٹ دی کہ ''میں نے جو کمایا اسی شہر کی مٹی سے کمایا۔ اب اس شہر کی ترقی میں میرا ہاتھ بھی تو ہونا چاہیے''۔ ہائی پوائنٹ شہر نے ذکی صاحب پر اپنی محبت کے دروازے کھول دیئے۔ ایوانِ تجارت کی کتاب میں لکھی ہوئی یہ عبارت اہلِ امریکہ کا ایک پاکستانی کو خراجِ عقیدت ہے:

Everyone in High Point knows that their city indeed improved because a special person came from Pakistan on July 4,1976 and now calls High Point his home. His gift has provided and will continnue to provide, an example for each of us to follow. He is a true citizen of the world, a prime example of a wonderful corporate citizen who cares about his community and is taking action to validate his belief.

میں نے ان دو دنوں میں ذکی صاحب کے لئے اس شہر میں بہت عزت دیکھی۔ وہ کسی چوراہے پہ بھی کھڑے ہوں تو لوگ ذکی' ذکی کہہ کے امڈ آتے ہیں۔ ہائی پوائنٹ ایوانِ تجارت کے صدر ٹام والٹ کا کہنا تھا کہ وہ پچیس سال سے اس ایوان سے منسلک ہے لیکن ایوان کو اتنا بڑا عطیہ آج تک کسی نے نہیں دیا۔ میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ مجھے لگا ذکی الدین نے تنِ تنہا ان پاکستانیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا جو جعلی کاغذات بنا کے امریکہ جاتے ہیں اور پھر کریڈٹ کارڈز اور ہُنڈی کے نام پر لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ وہ کیا جذبہ تھا جس نے انہیں اس طرف مائل کیا۔ انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا:

" I feel that everyone has a responsibilty to try to leave world a better place than they found it".

ذکی صاحب کوامریکہ کے پچاس بہترین ایشیائی تاجروں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ذکی صاحب کا کاروبار آج اس عروج پرنہیں جہاں کبھی تھا لیکن ان کا موجودہ شوروم بھی ایک لاکھ مربع فٹ پر مشتمل ہے۔میں اس کی آرائش اوروسعت دیکھ کے حیران رہ گیا۔اس میں میں نے ایسے کئی ایرانی قالین بھی دیکھے جن کی قیمت دو سے تین کروڑ روپے ہوگی۔ایسی چیزیں جمع کرنا امیروں کا محبوب مشغلہ ہے۔یہ سب دولت کی فراوانی اور شوق کی بات ہے۔جولوگ انسانی ہاتھوں سے بُنے ہوئے نادر قالینوں میں سرمایہ کاری کرتے ہیں خلیفہ ذکی الدین ان کے لئے ایک قابلِ بھروسہ نام ہے۔یہ نام امریکہ میں ہی نہیں دنیا بھر میں ایک معتبر حوالہ ہے۔خلیفہ شجاع الدین کے پوتے کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ایک پاکستانی کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔فیاض، دردمند اور دیانت دار۔

3.15۔ہائی پوائنٹ شہر میں

ہمیں ائیر پورٹ سے ہائی پوائنٹ پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگا۔سب سے پہلے ایوانِ تجارت کے دفتر۔یہ وہی عمارت تھی جہاں ذکی صاحب نے اپنا کاروبار شروع کیا اور پھر عروج پر پہنچنے کے بعد اسے اہلِ شہر کو پیش کر دیا۔ایوانِ تجارت کے صدر اور سٹاف سے ملاقات ہوئی۔ان سب کی آنکھوں میں ذکی صاحب کے لیے بہت احترام تھا۔ایوان کا صدر ٹام ڈے والٹ بچھا جا رہا تھا۔دوپہر کے کھانے کے لئے وہ ہمیں شہر کے سب سے خوبصورت کلب میں لے گیا۔یہ لاہور جمخانہ کی طرز کا کلب تھا۔شہر کے معتبر لوگ وہاں موجود تھے۔ذکی صاحب کو دیکھ کر بہت سے لوگ اپنی نشست سے اٹھ کر ملے۔ان کی پذیرائی دیکھ کے میری مسرت میں اضافہ ہوتا رہا۔مجھے لگا یہ پورے پاکستان کی پذیرائی ہے۔کھانے کے دوران ٹام سے خوب بات چیت ہوئی۔میں نے ایک گھنٹہ میں اسے اخوت کا پورا فلسفہ پڑھانے کی کوشش کی۔''فیاضی اور ایثار یہ کہانی سن کے مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی۔ثبوت پہلے سے میرے سامنے موجود ہے''۔اس نے ذکی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔میں نے ٹام کو یہ بھی بتایا کہ اخوت کا آغاز لاہور کے ایسے ہی ایک کلب میں کھانے کی ایک دعوت پہ ہوا۔ذکی صاحب جیسے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم دنیا کو پہلے سے اچھا بنانا چاہتے ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ جب اللہ کے حضور پیش ہوں تو یہ سروبالِ دوش نہ ہوں۔کھانے کے بعد ہم نے ''ذکی اورینٹل رگز'' کے دفتر اور شوروم کا رخ کیا۔ذکی صاحب نے بہت شوق سے پورا شوروم دکھایا۔اپنے کچھ گاہکوں سے ملوایا۔مجھے ان کا کام دیکھ کے حیرت ہورہی تھی۔محنت تو بہت لوگ کرتے ہیں لیکن قبولیت کسی کسی کو ملتی ہے۔یہ سب ان کی نیک نیتی

کا صلہ تھا۔ان کی اہلیہ کاتعلق بھارت سے ہے۔انتہائی مہذب' باسلیقہ اور دیندار خاتون۔وہ خود بھی کاروبار میں ذکی صاحب کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ہم نے کچھ دیر اور شوروم میں گزارا۔ذکی صاحب نے اپنے دادا کی چند یادگار تصاویر دکھائیں۔خلیفہ شجاع الدین ایک بار امریکہ میں ایک کانفرنس میں شرکت کرنے آئے تو انہیں وائیٹ ہاؤس میں خصوصی دعوت دی گئی۔

شوروم سے نکل کر ہم نے اس شہر کی سیر کی جہاں ایک پاکستانی کو اَن داتا سمجھا جاتا ہے اور پھر چند خوبصورت سڑکوں سے گذرتے ہوئے ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔درختوں' بیلوں اور پھولوں میں گھرا چھوٹا سا خوبصورت گھر۔میں نے کچھ دیر آرام کی اجازت مانگی اور ذکی صاحب واپس دفتر چلے گئے۔کئی دنوں کی نامکمل نینداور مسلسل تھکاوٹ۔ایک گھنٹے کے آرام نے پھر سے تازہ دم کردیا۔ذکی صاحب کی واپسی میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میں نے جوگرز پہنے اور سیر کیلئے نکل کھڑا ہوا۔یہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔صاف ستھری اور کھلی سڑکیں۔شام کا وقت' ڈھلتے ہوئے سائے' پرندوں کا شور۔راستہ یاد کرتے ہوئے میں دور تک نکل گیا۔سارا وقت تاہم یہی سوچتا رہا کہ امریکہ آنے والے ہر پاکستانی نے ذکی الدین جیسی عزت کیوں نہیں کمائی؟ کیا اصل عزت اور عظمت کردار میں نہیں۔واپس پہنچا تو بشاشت اور تازگی میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ذکی صاحب بھی پہنچ گئے۔ انتہائی لذیذ کھانا ہمارا منتظر تھا۔کھانے کے بعد گفتگو اور اخوت کی کہانی کا اگلا باب شروع ہونے لگا۔

3.16۔قالینوں کے سوداگر

ذکی صاحب سے میری پہلی ملاقات پانچ سال قبل ہوئی۔وہ ان دنوں امریکہ سے پاکستان آئے ہوئے تھے۔وہ پاکستان میں کئی لوگوں سے ملے' بہت سے اداروں کو دیکھا۔غربت کے بڑھتے ہوئے اندھیرے۔ وہ کوئی شمع جلانا چاہتے تھے۔پھر انہوں نے سوچا کہ وہ بنگلہ دیش جاکر گرامین بنک کے بانی ڈاکٹر محمد یونس سے ملیں اور ان سے کہہ کر پاکستان میں بھی ایسے ہی کسی بنک کا آغاز کریں۔اسی دوران ان کی ملاقات اخوت کے دیرینہ ساتھی ڈاکٹر عبدالرزاق سے ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں اخوت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہا کہ وہ بنگلہ دیش ضرور جائیں لیکن جانے سے پہلے ایک بار اخوت والوں سے مل لیں۔شاید ان کے خواب یہیں پورے ہو جائیں۔یوں اخوت سے ذکی صاحب کی دلچسپی کا آغاز ہوا۔ہماری ذکی صاحب سے پہلی ملاقات لاہور چیمبر آف کامرس میں ہوئی۔مجھے وہاں ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔ذکی صاحب بھی

وہاں مدعو تھے۔ تقریب ختم ہوتے ہی مصافحہ ہوا اور اگلی ملاقات کا وقت طے ہونے لگا۔ انہوں نے ہمارے دفتر میں آنے کا وعدہ کر لیا۔ مقررہ دن وہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ اخوت کے دفتر پہنچے۔ طویل بریفنگ ' سٹاف سے گفتگو ' سوال جواب۔ ذکی صاحب نے بنگلہ دیش جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ روشنی کی کرن یہیں نظر آنے لگی۔ اس بات کو تقریباً پانچ سال ہونے کو ہیں۔ اخوت سے ان کا رشتہ ہر دن مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ انہوں نے اخوت کو بہت سے اچھے لوگوں سے متعارف کروایا۔ شاہد حسن شیخ ' ندیم ملک ' عابد حسن شیخ ' امتیاز احمد بٹ ' اعجاز بٹ ' حافظ افتخار القمر اور عثمان اشرف۔ یہ سب قالینوں کے کاروبار سے منسلک پاکستان کے مشہور لوگ ہیں۔ ان سب نے اخوت سے بھرپور تعاون کیا۔ ہزاروں لوگوں کیلئے قرضِ حسن اور پھر سیلاب سے متاثرہ گھرانوں کیلئے کوٹ مٹھن میں ''اخوت بستی'' کی تعمیر۔ اس بستی میں اسّی گھرانوں کو ان کی طرف سے نئے گھر بنا کے دیئے گئے۔ کمال فرید کی نگرانی میں بننے والے ان گھروں کی ہر اینٹ پر محبت کا لفظ درج ہے۔ شاہد حسن اور ندیم ملک جب ان گھروں کی چابیاں دینے لگے تو ان کے چہرے پہ بھی صرف محبت تھی۔ ندیم نے ایک بار اپنے گھر میں اپنے والد سے بھی ملایا۔ ہم ان کے قریب آئے تو یوں لگا جیسے کوئی خوشبو سی بکھر گئی ہو۔ اسّی برس کی عمر اور اتنے ہی حج اور عمرے۔ ان کی دعا ہے کہ وہ ہر سال روضہ رُسولؐ پہ حاضری دیں۔ خدا ہر سال یہ دعا مان لیتا ہے۔ میں حیران ہو کے انہیں دیکھنے لگا۔ لوگ کیسے کیسے نصیب لے کے آتے ہیں۔ یہ سب لوگ بھی ذکی صاحب کی طرح ہی ہیں۔ اس اصول کے پیرو کہ اللہ کی راہ میں ایسے دو کہ کسی اور کو خبر نہ ہو۔ مقصود صرف اور صرف اللہ کی رضا ہونا چاہیے۔ ذکی صاحب اور ان کے دوستوں کا یہ تذکرہ بھی ان کی مرضی کے خلاف ہے۔ وہ کب کہتے ہیں کہ شور ہو یا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ میں نے ان کے بارے میں کچھ مزید کہا تو ہمارے اس عہد کی خلاف ورزی ہونے لگے گی جو ہمارے اور ان کے درمیان قائم ہے۔

3.17۔ ڈاکٹر اجمل نیازی

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش۔

ذکی صاحب جیسے لوگ بھی انسانی سماج کو انعام کے طور پر ملتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں ''ایک بار ایک تقریب میں میری ملاقات ذکی الدین خلیفہ سے ہوئی جو امریکہ میں رہتے ہیں اور پاکستان ان کے دل میں رہتا ہے۔ ان کے دادا خلیفہ شجاع الدین پنجاب اسمبلی کے پہلے سپیکر تھے اور دادا

کے دادا انجمن حمایت اسلام کے پہلے صدر تھے۔ ذکی الدین کہتے ہیں کہ میں نے امریکہ میں رہ کر بہت دولت کمائی اس لیے مجھ پر امریکیوں کا بھی حق ہے۔ وہ پاکستان میں بھی کئی اداروں کو امداد دیتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر یونس کے ادارے کو ڈونیشن دینے کیلئے جارہے تھے کہ انہیں ''اخوت'' کا پتہ چلا۔ انہوں نے بنگلہ دیش جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ''اخوت'' کے تحت لاکھوں لوگوں کو قرضے دیئے جا چکے ہیں۔ اس قرض پر کوئی سود نہیں لیا جاتا۔ یہ بلاسود بنک کاری کی طرف ایک شاندار ابتدا ہے۔ ہمارے ملک میں کروڑوں اربوں کا قرض آسان ہے ہزاروں لاکھوں کا مشکل ہے۔ یہ قرض قوم کے لیے مرض بن گیا ہے۔ کچھ لوگ قرض کی خیرات کو ایک فرض سمجھتے ہیں۔ فرض اور قرض میں ایک نقطے کا فرق ہے۔ یہ بات ذکی الدین خلیفہ کو پسند آئی۔ اس ایک نقطے کو سمجھانے ڈاکٹر امجد ثاقب اور ان کے ساتھی بہت دور نکل آئے ہیں۔ منزل سے پہلے بھی تو منزلیں ہوتی ہیں۔ راستوں اور مسافروں سے محبت کرنے والے منزلوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ منزلیں خود ان کی راہ دیکھتی ہیں۔ امجد ثاقب اور اس کے ساتھی ایسے ہی شخص ہیں۔ انہوں نے ذکی الدین خلیفہ سے ملوایا تو بڑا لطف آیا۔ وہ بے نیاز آدمی ہیں۔ ایک قلندرانہ نیاز کے بغیر یہ ادا آدمی کو نہیں ملتی۔ ناز و نیاز اکٹھے ہوں تو پتہ دیتے ہیں۔

امریکہ میں ذکی الدین خلیفہ جیسے لوگ پاکستان کی عزت بھی بڑھاتے ہیں۔ جان و مال کی قربانی میں جان کی قربانی کا مرتبہ زیادہ ہے مگر مشکل مال کی قربانی ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنا دل والوں کا کام ہے۔ دل والے دل والوں کو تلاش کرتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو مل جاتے ہیں۔ چیمبر آف کامرس کے شاہد حسن نے اس روز بہت اچھی باتیں کی۔ ہمایوں احسان، ڈاکٹر اظہار ہاشمی اور کئی ساتھیوں کا ذکر کیا۔ ''اخوت'' کے حوالے سے ڈاکٹر امجد ثاقب کو یا اخی کہنے کو دل کرتا ہے۔ بھائی چارے کا یہ انداز بے مثال ہے۔ ''اخوت'' کے حوالے سے جو قرضے دیئے جاتے ہیں وہ قرضِ حسن ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان قرضوں کی واپسی میں نہ مشکل پیش آتی ہے اور نہ دیر ہوتی ہے۔ معروف شاعر برادرم ناصر بشیر شہر بھر میں دوستوں کے لیے آوارہ گردی کرتا ہے۔ ایک دن موٹر سائیکل پر میرے پاس آیا اور بتایا کہ اخوت سے قرض لے کر موٹر سائیکل لے لی ہے۔ میں نے امجد ثاقب سے قرض نہیں لیا مگر میں ان کا مقروض ہوں۔ مرزا غالب کے گھر کا سودا لانے والی خاتون سے دکاندار نے کہا کہ مرزا تو سارے شہر کا مقروض ہے۔ خاتون نے کہا کہ یہ بھی تو دیکھو کہ آئندہ

نسلیں مرزا غالب کی مقروض ہوں گی۔''

ڈاکٹر اجمل نیازی درویش صفت انسان ہیں۔ذکی الدین خلیفہ کے علاوہ انہوں نے اخوت پر بھی ایک کالم لکھا تو ہزاروں لوگوں کو رلا دیا۔رلانا ہنسانے سے مشکل کام ہے۔ڈاکٹر اجمل نیازی ایسے ہی مشکل کام کرتا ہے۔یہ کالم اخوت کے تصور میں پوشیدہ بہت سے بھید بھی کھولتا ہے۔

3.18۔غریبی کی بجائے امیری ختم کرو

ایسی اسرار بھری بات بھی اجمل نیازی ہی کہہ سکتا ہے۔

اس کا کہنا تھا کہ ''اخوت سے وابستہ یہ غریب لوگ کیسے ہیں جو خیرات نہیں لیتے' زکوٰۃ نہیں لیتے' بھیک نہیں مانگتے' مگر قرض لیتے ہیں اور پھر قرض ادا کرتے ہیں۔وہ لوگ کیسے ہیں جو صرف غریبوں کو قرض دیتے ہیں۔ ''اخوت'' کی تقریب میں شریک ہو کر میں حیران ہوا۔حیرت جیسی کیفیت اور کوئی نہیں۔آج کل ہماری قسمت میں پریشانی ہی پریشانی ہے' حیرانی نہیں ہے۔ڈاکٹر امجد ثاقب غریب نہیں لیکن غریبوں سے پیار کرتا ہے۔ہمارے سیاستدان' افسران اور حکمران غریبی ختم کرنے کے وعدے تو کرتے ہیں' دعوے بھی کرتے ہیں مگر کرتے کچھ نہیں۔ان کے سارے منصوبے امیروں کے لئے ہوتے ہیں۔ان کی طرف سے قرضے بھی امیروں کو ملتے ہیں' کروڑ پتی' کھرب پتی لوگوں کو قرضے کی کیا ضرورت ہے۔ہمارے ہاں عجب معاملہ ہے کہ امارت بڑھانے کے لئے غربت بڑھانا ضروری ہو گیا ہے۔غربت کی سطح کے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور امارت کی سطح سے اوپر زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔

میرا اسوہنا ابا ایک دعا مانگا کرتا تھا۔اب اس کی معنویت ایک آسمان کی طرح میرے سر پہ کھڑی ہے۔''اے خدا مجھے غریبی سے بچا''۔اس کے ساتھ ہی کہتے ''اے خدا مجھے امیری سے بچا''۔حد سے زیادہ غریبی جرم ہے اور حد سے زیادہ امیری ظلم ہے۔جرم اور ظلم دونوں کو ختم کرنا ہوگا۔ہم نہ جرم ختم کر سکے اور نہ ظلم ختم کر سکے۔کچھ لوگ ہیں جو غریبی ختم کرنے کا ارادہ تو رکھتے ہیں۔ہماری حکومتیں تو ہمارے لوگوں کو بھکاری بنا رہی ہیں۔ میرے آقا و مولا محسنِ انسانیت رسولِ کریم حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ زکوٰۃ دینے والے سے زکوٰۃ نہ دینے والا اچھا ہے۔لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیسے یا رسول اللہؐ! آپ نے فرمایا کہ آدمی کو اتنا امیر ہونا ہی نہیں چاہیئے کہ اس پر زکوٰۃ لاگو ہو۔ایسا معاشرہ آئیڈیل ہے جہاں نہ کوئی امیر ہو' نہ کوئی غریب ہو۔میرا خیال ہے کہ

ڈاکٹر امجد ثاقب ان لوگوں میں سے ہے جو ایسے معاشرے کی تعمیر کا خواب زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اس کی تعبیر غریبوں میں بانٹنا چاہتے ہیں۔ مولا علیؑ نے فرمایا تھا کہ اے لوگو! تم سے ابو طالب کا بیٹا سب کچھ چھین لے گا تو تم کہو گے کہ میں نے تم سے ناحق کیا۔ میں نے تو تمہیں اصل حق کی طرف لوٹایا۔ حضرت علیؑ کی یہ بات قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہے ''تم دے دو اللہ کی راہ میں جو تمہاری ضرورت سے زائد ہے''۔

مجھے دولت مند پسند نہیں مگر وہ دولت مند جو درد مند بھی ہو۔ کیا وہ بھی انسان ہیں جن کے پاس نہ دل ہے نہ دماغ ہے۔ جن کے پاس صرف پیسہ ہے۔ دولت کے ساتھ دل کی دولت بھی ہو تو کمال ہے۔ غربت کے ساتھ غیرت بھی ہو۔ دونوں جہانوں کے سردار رسول کریمؐ نے غریب ہونا پسند کیا۔ آپؐ نے فرمایا میں چاہوں تو بدر اور احد کے پہاڑ سونے کے ہو جائیں مگر میں اللہ کی بارگاہ میں عاجز اور غریب کے طور پر جانا چاہتا ہوں۔ غریبی کبھی بدنصیبی نہ تھی تو پھر کون لوگ ہیں جنہوں نے اسے ایک الزام اور ایک طعنہ بنا دیا۔ میں نے ایک بار سرمایہ داروں کی محفل میں کہا تھا کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم اپنی امیری سے ہاتھ دھو بیٹھو اور ہمیں بھی ''امیری'' سے نواز و مگر تم ہم سے غریبی تو نہ چھینو۔ تم نے ہم پر ظلم کیا ہے کہ ہم سے ہماری غریبی چھین لی ہے۔ ہم اپنی غریبی کو خوش نصیبی جانتے تھے۔ آسودگی اور عزت مندی سے زندگی گزارتے تھے۔ اب تم نے زندگی کو شرمندگی اور درندگی کے درمیان ایک عذاب بنا دیا ہے۔ ہم درندہ نہیں بن سکتے تو ہمارے لیے یہی کچھ بچا ہے کہ ہم شرمندہ ہو جائیں۔ ہم زندہ نہیں ہیں شرمندہ ہیں!

ڈاکٹر محمد امجد ثاقب نے ''اخوت'' کے ذریعے لوگوں کو یہی غریبی لوٹانے کا جتن کیا ہے اور یہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ دس پندرہ ہزار کے قرضے سے ایک بیوہ خاتون اپنی زندگی کا سفر شروع کرے، بچوں کو پڑھائے، بچیوں کی شادی کرے اور قرض بھی واپس کر دے۔ اب تک دو لاکھ گھرانے اپنی زندگی کو ایک اور زندگی بنا چکے ہیں۔ یہ کیسے مقروض ہیں جو اس قدر معزز ین ہو چکے ہیں۔ تقریباً سو فیصد لوگ قرض واپس کرتے ہیں ورنہ ہمارے ہاں اربوں کروڑوں کے قرضے معاف کروائے جاتے ہیں۔ غریبوں کے لیے قرض حاصل کرنا مصیبت ہوتی ہے، واپس کرنا زیادہ مصیبت ہوتی ہے۔ چند لاکھ روپے کے قرضے کے لیے غریبوں، کسانوں اور عام انسانوں کو پولیس کے ذریعے ذلیل وخوار کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنے گھر میں بے گھر ہو جاتے ہیں۔ اپنے وطن میں بے وطن ہو جاتے ہیں۔

قرضہ لینا سنت ہے۔حضورؐ نے قرضہ لیا بھی اور قرضہ دیا بھی......مگر یہ قرضِ حسن ہے۔ بلاسود معاملے نے اخوت کو عزت مندی اور کامیابی دی۔قرض واپس کرنے اور قرض ادا کرنے کی روایت بھی اب ہمارے ہاں نہیں۔وہ لوگ کتنے بڑے لوگ ہیں کہ خدا جن کا مقروض ہے۔جس نے خدا کے بندے کو قرضہ دیا اس نے خدا کو قرضہ دیا۔ یہ مقروض اور محبوب برابر ہوگئے ہیں۔میرے لیے اورینٹل کالج میں ایک اچھی لڑکی نے داخلہ فیس دی تھی۔ پھر میں اس قابل ہوگیا کہ یہ قرض اتار دوں۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہارا قرض ادا کرسکتا ہوں مگر ''میں تیرا مقروض رہنا چاہتا ہوں''۔اس نے کہا کہ تم اربوں روپے بھی دے دو تو بھی یہ کیفیت بھاری ہے۔میں آج بھی اس کا مقروض ہوں''۔

کسی کا مقروض رہنے میں جو اسرار ہے یہ اسرار اجمل نیازی ہی سمجھ سکتا ہے۔یا پھر وہ اچھی لڑکی سمجھ سکتی ہے جو چندروپوں کے قرضے کو اربوں روپے سے بھاری خیال کرتی ہے۔

3.19۔تیری آواز مکے اور مدینے

غربت اور فقیری میں بھی ایک زعم ہے۔

مجھے یہ بات اجمل نیازی کا یہ کالم پڑھنے کے بعد سمجھ آئی کہ قوموں کی سربلندی کا راز بھی فقر اور غنا میں پوشیدہ ہے۔مختار مسعود نے ایسے کچھ راز اپنی کتاب آوازِ دوست میں افشاء کیے ہیں۔انہوں نے نے ایک بار اخوت کے بارے میں کہا ''اچھا کام' اچھے لوگ' اچھا مستقبل۔ یہ رائے بھی ہے اور دعا بھی۔'' مختار مسعود صاحب نے جب وزٹرز بک میں یہ کلمات لکھے تو وہ بابا شاہ جمالؒ کے دربار پہ اخوت کے دفتر میں بیٹھے تھے۔یہ دفتر کیا ہے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔عام سی فرشی نشست۔لکڑی کی تپائی' چند گدیاں اور تکیے۔ اس دفتر میں کئی لوگ آئے اور فرش نشیں ہوئے۔سٹیٹ بنک کے گورنر' وزیر' بیوروکریٹ' ناروے کے سابق وزیراعظم' ادیب' شاعر' صحافی' سیاستدان۔فرش نشینی میں جو کمال ہے وہ تخت نشینی میں نہیں۔اس دفتر میں بیٹھ کے کئی اہم فیصلے ہوئے۔اسی دفتر میں بیٹھ کے یہ عزم کیا گیا کہ سود کا متبادل نظام استوار کرنا ہے۔اچھا کام' اچھے لوگ' اچھا مستقبل! مختار مسعود کی یہ دعا اس کمرے میں رچ گئی ہے۔کاش اتنی اچھی دعا پورے وطن کو اپنی آغوش میں لے لے۔اچھا کام' اچھے لوگ' اچھا مستقبل۔رات کے گیارہ بج رہے تھے۔میں بظاہر ذکی

الدین کے پاس بیٹھا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں وہاں نہیں تھا۔ کئی بار ہم کہیں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔ ذکی صاحب نے سونے کی بات کی تو مجھے خیالوں سے واپس لوٹنا پڑا۔ صبح چھ بجے ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔ ذکی صاحب نے پانچ بجے جگانے کا وعدہ کیا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ راست گوئی، خودداری، بے نیازی اور توکل۔ مجھے وہ تمام خوبیاں یاد آنے لگیں جو خلیفہ شجاع الدین میں تھیں۔ لیکن ہم میں نہیں۔ اسی لیے ہم بڑے نہیں بن سکے۔ جارج واشنگٹن، ابراہام لنکن اور بہت سے اور بڑے لوگ...... پھر تحریک پاکستان کے اولین رہنما۔ ہر طرف چھائے گہرے اندھیرے اور کہیں دور پھوٹتی ہوئی روشنی۔ کیا سماج میں تبدیلی اچھی قیادت کے بغیر ممکن ہے۔ وہ قیادت کہاں سے آتی ہے۔ کیا ہم بلندی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ سوال طویل تھے اور رات مختصر!

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

4

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

واشنگٹن۔ورجینیا۔بالٹی مور

باب چہارم

4.1۔ لیلیٰ بھی ہم نشیں ہوتو محمل نہ کر قبول

کشمکش' سوز وساز' پیچ وتاب۔

''کسی قوم کی تقدیر کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے اندر کس قسم کی شخصیات پیدا کر سکتی ہے''۔ جو عقدہ ساری رات نہ کھلا وہ عین صبح کے وقت وا ہونے لگا.....''زوال کو روکنے کیلئے خود شناس افراد کی ضرورت ہوتی ہے''۔ذکی صاحب علی الصبح جگانے آئے تو شاعرِ مشرق کے یہ مشہور فقرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مجھے لگا گویا چمن سا کھِل گیا ہو۔ ان کے اصرار کے باوجود ناشتے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور ہم تیار ہو کر ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہونے لگے۔

صبح کی روشنی کتنے ہی رازوں کو فاش کرتی ہے۔ہائی پوائنٹ سے واشنگٹن تک کا سفر صرف ایک گھنٹے کا تھا۔ایک عدد چائے کا کپ اور کچھ دیر اخبار کا مطالعہ۔اخبار کے اندرونی صفحے میں فلوریڈا کی ایک خبر چھپی تھی۔فلوریڈا کا نام پڑھ کر روشنی کا ایک جھما کا سا ہوا۔ یوں لگا جیسے سردیوں کی نرم دھوپ نے آغوش میں لے لیا ہو۔فلوریڈا نارتھ کیرولینا سے بہت دور نہیں۔ چند گھنٹوں کا سفر ہوگا۔اپیرل کو ملنے کیلئے تو بہت دور جایا جا سکتا ہے۔ امریکہ سے واپسی کے بعد بھی میرا اس سے رابطہ قائم رہا۔جس سال بھی اس کا نیو ائیر کارڈ ملا وہ سال بہت اچھا گذرا۔ وہ آجکل ایک بہت بڑی کمپنی میں وائس پریذیڈنٹ ہے۔میری نگاہوں میں امیریکن یونیورسٹی کے روز وشب اترنے لگے۔ گہری نیلی آنکھوں میں حیرت اور ستائش کا وہ لمحہ جو کئی لمحوں پہ بھاری تھا۔اسی لمحے کیلئے لوگ تیشہ اٹھاتے ہیں......منزلیں سر کرتے ہیں۔ میں نے ایک گھڑی کیلئے کچھ سوچا اور پھر اس خیال کو جھٹک دیا۔ نا آسودگی اور خلش۔ان کا اپنا حسن ہے۔اتنے میں واشنگٹن کے مناظر نظر آنے لگے۔ مسافر بھی کم تھے اور رش بھی زیادہ نہ تھا۔ ایئر پورٹ سے نکلنے میں دیر نہ لگی۔ قدیر حسبِ وعدہ ہمارا منتظر تھا۔سامان اس کی گاڑی میں منتقل ہوا اور ہم ایئر پورٹ سے نکل کر اس کے گھر کی طرف چل پڑے۔ جارج واشنگٹن پارک وے کے وہی مانوس موڑ' وہی سبزہ اور پھول نظر آنے لگے۔ ماؤنٹ ورنن سے اترتی ہوئی وہی

گذرگاہ۔ ایک گھنٹہ سے کم وقت میں ہم قدیر کے گھر پہنچ چکے تھے۔ اگلے پانچ روز ہمیں اسی کے پاس گزارنا تھے۔ قدیر کے گھر میں کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ رہنا سہنا اور آمد ورفت سب اسی کے ذمہ تھا۔ اس نے اپنے کام سے بھی رخصت لے لی اور ہر لمحہ ہمارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ جو لوگ امریکہ سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہاں کسی کو وقت دینا کس قدر مشکل کام ہے۔ سب سے پہلے ہم نے آئندہ چار روز کا پروگرام بنایا۔ پانچ اپریل یعنی اگلے روز واشنگٹن ڈی سی اور نیشنل مال کا وزٹ، مائیکروفنانس کے مشہور ادارے ''فنکا'' کے صدر سے ملاقات اور بالٹی مور کے اسلامی مرکز میں اخوت پہ گفتگو۔ چھ اپریل کو پہلے ڈاکٹر اختر اوران کے بعد ڈاکٹر اکبر ایس احمد سے ملاقات اور پھر شام کو پاکستانی کمیونٹی کے ساتھ ڈنر، سات تاریخ کی صبح ورجینیا میں آرگنائزیشن آف انٹر پرنیورز آف نارتھ امریکہ اور شام کو ورجینیا میں ہی پاکستانی میڈیا سے ملاقات۔ آٹھ تاریخ کو ایک ویڈیو انٹرویو، ایک امریکی صحافی سے ملاقات، ڈاکٹر عبید کے گھر ریسیپشن اور اسلامی مرکز ہیگرز ٹاؤن میں لوگوں سے ملاقات اور پھر نو اپریل کی صبح بوسٹن کے لیے روانگی۔

4.2۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ائیر پورٹ سے واپسی اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ قدیر نے بتایا کہ چھ تاریخ کو ڈنر کے انتظامات تقریباً مکمل تھے تاہم ان کے مختصر جائزے کے لیے ہم نے منٹگمری مسلم کونسل کے دفتر جانے کا فیصلہ کیا۔ طفیل صاحب سے، جو کونسل کے کرتا دھرتا ہیں ہم پہلے بھی مل چکے تھے۔ انہوں نے اسی خوشدلی سے خوش آمدید کہا اور تقریب کی تفصیلات پہ بات ہونے لگی۔ یونیورسٹی آف میری لینڈ میں ڈنر کیلئے جگہ مل چکی تھی۔ صومالیہ سے تعلق رکھنے والے قاسم ولید نے مہمانوں کی فہرست مکمل کر کے دعوت نامے بھی بھجوا دیئے تھے۔ دوبارہ کنفرمیشن کے سلسلے کا آغاز ہونے لگا۔ یہ کام قاسم اور ثمن قدیر نے اپنے ذمے لے لیا۔ اخوت کی ایک خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ اسے ہر جگہ رضا کار میسر آ جاتے ہیں۔ مجھے پاکستان کی وہ بیسیوں تقریبات یاد آنے لگیں جو رضا کاروں کے تعاون سے منعقد ہوئیں۔ سید حسین حیدر، مظفر اور ان کے نوجوان طالب علم ساتھی۔ انہوں نے ان تقریبات کو اپنی محنت سے یادگار بنا دیا اور ثابت کر دیا کہ نیکی کیلئے معاوضہ نہیں محبت درکار ہے۔

طفیل صاحب ان تمام انتظامات پہ مطمئن نظر آئے۔ سٹیج، نشستیں، کھانا اور ساؤنڈ سسٹم۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں

بھی ان کی نظر سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک یادگار تقریب ہوگی۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر امتیاز نور بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی انتظامات کے ضمن میں کئی مشورے دیئے اور مدعوئین کی فہرست میں چند لوگوں کا اضافہ ہوا۔ مسلم کونسل کا دفتر بھی امتیاز کے کلینک کے ایک حصہ میں قائم ہے۔ طفیل بھائی نے ہمیں اپنے پاس بٹھا لیا اور پچھلے ایک ہفتے کے دوران ہمارے سفر کی کہانی بہت دلچسپی سے سنی۔ واشنگٹن سے لاس اینجلس، شکاگو، ڈیلس اور ہائی پوائنٹ۔ اخوت کا یہ سفر کیسا رہا؟ اخوت کے بارے میں لوگوں کے کیا تاثرات تھے؟ کس طرح کے سوال پوچھے گئے؟ Reaching One Thousand Americans کے ضمن میں ہم نے جو اہداف مقرر کیے تھے وہ کہاں تک پورے ہوئے؟ طفیل بھائی کی گفتگو میں متانت بھی تھی اور دردمندی بھی۔

4.3۔ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

سہ پہر کے بعد قدیر کے ایک دوست خالد صاحب سے ملاقات کا ارادہ تھا۔ طفیل بھائی سے اجازت طلب کی اور مسلم کونسل کے دفتر سے ہم سیدھے اسی طرف چل پڑے۔ خالد انجینئر ہیں اور سولر انرجی کے شعبہ میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کاروبار کے بارے میں ہمیں بہت تفصیل سے بتایا اور اخوت کے ساتھ مل کر کام کرنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ پاکستان کے دور دراز دیہی علاقوں میں سولر انرجی ایک اہم متبادل بن سکتی ہے۔ لاس اینجلس کے وزٹ کے دوران ایک مشہور پاکستانی بزنس مین پرویز لودھی نے بھی اپنی ایک کوشش کے بارے میں بتایا تھا۔ ان کے ادارے نے سولر انرجی سے چلنے والے خصوصی بلب اور پنکھے تیار کر کے سندھ کے دیہاتوں میں فراہم کیے ہیں جن کی بدولت وہاں ایک خوشگوار تبدیلی آنے لگی ہے۔ اس کام کی وجہ سے نہ صرف بچوں کی تعلیم ممکن ہوئی بلکہ رات کے وقت عورتیں اور بچیاں اب سلائی کڑھائی کا کام بھی کرتی ہیں۔ ''حکومت کو اس سلسلے میں نہ صرف مراعات دینی چاہئیں بلکہ تحقیق کے خصوصی شعبے قائم کرنا چاہئیں۔'' خالد صاحب نے بڑے اصرار سے یہ بات کہی۔ ان کی بیگم ڈاکٹر ہیں لیکن اپنے خاوند کے کاروبار میں بھی ان کی مدد کرتی ہیں۔ انہوں نے چائے پیش کی اور کچھ دیر گفتگو میں شریک رہیں۔ ان کی زیادہ دلچسپی خواتین کی ترقی اور بہبود میں تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ اخوت کے فراہم کردہ سرمائے سے جو کاروبار شروع ہوئے ان میں تیس فیصد سے زائد کاروبار خواتین چلا رہی ہیں۔ ان قرضوں نے خواتین کو اپنی صلاحیتیں

آزمانے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔خالد صاحب اوران کی اہلیہ سے ملنے کے بعد ہم باہر نکلے تو بہت سے نئے پہلو ہمارے سامنے تھے۔سولرانرجی یقیناً ایک ایسا شعبہ ہے جسے اپنانے کی ضرورت ہے۔اقبال نے عرصہ پہلے کہا تھا کہ لہوخورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں' لیکن اب ذروں کونہیں سورج کو گرفت میں لینے کا موقعہ ہے۔ اخوت کے مرکزی دفتر میں سولرانرجی کی سہولت اسی سوچ کی غماز ہے۔

4.4۔آپچوں رل یار

شام کے سائے آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ ہوا کے جھونکے اور خوشگوار موسم۔ ہم خالد صاحب کے دفتر سے نکلے اور ایک خوبصورت سڑک سے ہوتے ہوئے ایک بڑے سٹور کی طرف چل دیئے۔ مجھے کچھ سامان خریدنا تھا۔ایک چھوٹا بیگ اور چند تحفے۔سٹور میں داخل ہوئے تو ایک عجب دنیا سامنے تھی۔وسیع وعریض سٹور اور چیزوں کا انبار۔ ہمارے لیے انتخاب مشکل ہونے لگا۔ بہتات بھی عذاب سے کم نہیں۔سٹور میں گھومنے' چیزیں پسند کرنے اور ادائیگی میں ایک گھنٹہ صرف ہوگیا۔ یہاں سے کچھ ہی دور واقع ایک ریسٹورنٹ میں ڈاکٹر امتیاز نور نے رات کے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ میں قدیر اور امتیاز۔ہم ریسٹورنٹ پہنچے تو امتیاز ہمارا منتظر تھا۔ یہ راک ویل میں حلال فوڈ کا مشہور ریسٹورنٹ تھا۔کئی ایک مسلم فیملیز بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔ کچھ خواتین حجاب میں' کچھ حجاب کے بغیر۔ ہم بھی ایک نکڑ میں جا بیٹھے۔انتہائی سادہ اور لذیذ کھانا۔ گفتگو کا موضوع صرف اخوت تھا۔ وہ دونوں اپنے آبائی شہروں میں اخوت کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ان دونوں کا تعلق جنوبی پنجاب سے ہے جو اخوت کا بڑا مرکز بن چکا ہے۔جنوبی پنجاب میں کام کا آغاز جہانیاں نامی شہر سے ہوا۔ یہ شہر امتیاز کے آبائی ضلع وہاڑی سے زیادہ دور نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ 8 اکتوبر 2007 کی بات ہے جب ہم غلہ منڈی جہانیاں کی سادہ مگر پروقار مسجد میں پہنچے۔ دوسو کے لگ بھگ مہمان جو صرف بھائی چارے کی روایت کیلئے اکٹھے ہوئے۔ جہانیاں کے رہنے والے ہمارے دوست راؤ سعادت ہمارے میزبان تھے۔راؤ سعادت کچھ عرصہ پہلے لاہور میں اخوت کی ایک تقریب میں شریک ہوئے اور پھر اخوت کے ہو کے رہ گئے۔ان کی پرخلوص دعوت کے بعد اخوت جہانیاں کے آغاز کی تیاری ہونے لگی۔شاہد صفدر کیلئے یہ ذمہ داری ایک اہم مرحلہ تھا۔اس نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔منیر احمد مقامی ٹیم کا لیڈر منتخب ہوا۔تربیت کے مرحلے طے ہوتے ہی مقررہ تاریخ کو آٹھ افراد کو مختلف کاروباروں کیلئے اسی ہزار

روپے کے قرضے پیش کیے گئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کیا تھے۔ جہانیاں کے ایک بازار میں دو ریڑھیاں، دوچھوٹے جنرل سٹور، سلائی کے تین مرکز اور ایک پنساری کی دوکان۔لیکن بات آٹھ قرضوں پہ نہ رک سکی۔آج پانچ سال بعد اس چھوٹے سے شہر میں چار ہزار قرضے تقسیم ہو چکے ہیں۔اڑھائی ہزار سے زیادہ گھرانے چھ کروڑ سے زیادہ رقم، سو فیصد شرح واپسی۔ جہانیاں اخوت کی اور اخوت جہانیاں کی پہچان بن گیا۔امتیاز اس کارکردگی پہ محوِ حیرت تھا۔

دوسری کہانی جو میں نے انہیں سنائی وہ راجن پور کی تھی۔ جنوبی پنجاب کا آخری ضلع جس کے ساتھ بلوچستان اور سندھ کی سرحدیں ہیں اور خیبر پختونخواہ بھی زیادہ دور نہیں۔ چاروں صوبوں کا سنگم۔راجن پور کے ساتھ ایک چھوٹا سا شہر ہے، مٹھن کوٹ! سرائیکی زبان کے مشہور شاعر خواجہ غلام فریدؒ کا مسکن۔ خواجہ غلام فریدؒ صوفیانہ شاعری کے سلسلہ کی اہم کڑی ہیں۔ان کا کلام سوز وگداز کا مرقع ہے۔ہجر کا درد، وصال کی لذت اور عشق حقیقی۔خواجہ غلام فرید کی دردمندی اور دریا دلی کے قصے پورے علاقے میں مشہور ہیں۔ بہاول پور کے مشہور حاکم اور نواب سرمحمد صادق ان کے مرید تھے۔ کہتے ہیں نواب نے ایک بار کسی سائل سے بے اعتنائی برتی تو وہ حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے در پہ آ پہنچا۔آپ نے محبت کے پیرائے میں بہاولپور کے نواب کو مکتوب تحریر کردیا:

''صادق! زیر تھی۔زبر نہ بن۔متاں پیش پوندی ہووی''

''اے صادق زیردست رہو۔زبردست نہ بنو۔کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کے روبرو پیشی ہو جائے۔'' یہ سرزنش اختصار اور بلاغت کا شاہکار ہے۔ اردو کی علامات یعنی زیر، زبر اور پیش کے ذریعے کتنے بڑے اخلاقی اصول بیان کر دیئے۔ پٹھانے خان کی آواز نے ان کے کلام کو چار چاند لگا دیئے۔ان کی ایک نعت میں عشقِ رسولؐ اپنے جوبن پر ہے:

میڈا عشق وی توں میڈا یار وی توں   میڈا دین وی توں ایمان وی توں
میڈا جسم وی توں میڈا روح وی توں   میڈا قلب وی توں جند جان وی توں
میڈا کعبہ قبلہ، مسجد، منبر   مصحف تے قرآن وی توں

میڈے فرض فریضے حج زکاتاں　صوم صلوٰت اذان وی توں
میڈا زہد عبادت طاقت تقویٰ　علم وی توں عرفان وی توں
میڈا ذکر وی توں میڈا فکر وی توں　میڈا ذوق وی توں وجدان وی توں
میڈا سانول مٹھڑا شام سلونا　من موہن جانان وی توں
میڈا دھرم وی توں میڈا بھرم وی توں　میڈا شرم وی تو میڈا شان وی توں
میڈا دکھ سکھ رووں کھلن وی توں　میڈادرد وی توں درمان وی توں
میڈا خوشیاں دا اسباب وی توں　میڈے سولاں دا سامان وی توں
میڈاحسن تے بھاگ سہاگ وی توں　میڈا بخت تے نام و نشان وی توں
میڈی مہندی کجل مساگ وی توں　میڈی سرخی' بیڑا' پان وی توں
میڈی وحشت جوش جنون وی توں　میڈا گریہ آہ و فغان وی توں
میڈا شعر عروض قوافی توں　میڈا بحر وی توں اوزان وی توں
میڈا اول آخر' اندر باہر　ظاہر تے نہان وی توں
جے یار فرید قبول کرے　سرکار وی توں سلطان وی توں
نہ تاں کہتر کمتر احقر ادنیٰ　لا، شے لا امکان وی توں

یہ نعت عقیدت کا بحرِ بےکراں ہے۔ جب بھی سنیں ایک سرشاری کیفیت جنم لیتی ہے۔ میں نے میزبان کو بتایا کہ اسی نعت کی کشش اخوت کو مٹھن کوٹ لے گئی۔ وہ دو سال پہلے' 30 مئی 2010 کی ایک تپتی دوپہر تھی۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ پچاس سے زائد درجہ حرارت اور کوٹ مٹھن کی مشہور مسجد میں اخوت کا پہلا اجتماع۔ مسجد کی عمارت میں نیلی ٹائیلیں بہت کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ عمارت کے دائرے' زاویے اور نیلگوں گنبد' نیلے آسمان کا ہی حصہ لگتے ہیں۔ گویا نیلے رنگ نے ساری کائنات کو یکجا کر دیا ہو۔ اس خوبصورت مسجد میں جگہ ملنا بھی ایک اعزاز تھا۔ جو کام اس روز سات لوگوں سے شروع ہوا رفتہ رفتہ غیر معمولی مقام پہ جا پہنچا۔ اب صورت یہ ہے کہ گیارہ ہزار خاندان۔ تیرہ کروڑ کی رقم۔ حسنِ سلوک اور خدمت کی وہی بنیادی اقدار۔ کوٹ مٹھن کی کہانی تین افراد کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ خواجہ کلیم کوریجہ' ملک کمال فرید اور

حاجی عبدالغنی گوپانگ۔ جب یہ تینوں افراد ہمیں ملنے لاہور آئے تو کچھ اور تھے لیکن اخوت سے وابستہ ہوئے تو بس کایا ہی پلٹ گئی۔ کہاں شک اور شبہ' کہاں یقین کی دولت ۔خواجہ غلام فریدؒ کی روایت کے یہ امین' بہت دردمند نکلے۔کوٹ مٹھن سے پھوٹتی ہوئی اس روشنی میں پورا علاقہ جگمگانے لگا۔ڈیرہ غازی خاں سے جعفر خان لغاری'اویس خان لغاری اور محمد محسن لغاری کیسے پیچھے رہتے ۔ چوٹی زیریں میں انہوں نے بھی ایثار کی ایک نئی کہانی رقم کردی۔ ملتان' مظفر گڑھ' بہاولپور' لودھراں ۔جعفر خان کی بیگم مینا لغاری کی تو خواہش تھی کہ ان کی قدیم تاریخی حویلی میں ہی اخوت کا دفتر بنالیا جائے اور پھر پاکستان کے سابق صدر سردار فاروق خان لغاری اور علاقے کی دو اور معتبر سیاسی شخصیات سردار ذوالفقار خان کھوسہ اور سردار نصر اللہ دریشک ۔انہوں نے کئی کئی گھنٹے اخوت کی کہانی سنی۔ ''لیکن یہ سب تو سیاسی طور پر مخالف ہیں'' ۔قدیر نے سوال کیا۔سیاست پر اختلاف ہوسکتے ہیں لیکن اخوت پہ کسی کو اختلاف نہیں۔نہ یہ سیاست ہے' نہ کاروبار' نہ شہرت۔ یہ تو ہمارا مشترکہ ورثہ ہے۔جنوب کی یہ کہانی اختتام کے قریب تھی کہ راک ویل میں چینی ہوٹل کی مالکہ نے بل پیش کیا۔قہوہ کا دور بھی ختم ہوچکا تھا۔قدیر اور امتیاز کا تعلق چشتیاں اور وہاڑی سے ہے۔میرا جی چاہا ان سے کہوں کہ اخوت کا سفینہ اگلی منزلوں کیلئے بے قرار ہے۔کانوں میں حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی ایک مشہورِ عالم کافی کا مشہورِ عالم شعر گونج رہا تھا:

پیلھوں پکیاں نی وے
آ چنوں رل یار

مفہوم کچھ اس طرح ہے............پیلھوں (صحرا کا ایک پھول) کے پھول کھل چکے ہیں۔ ہر طرف بہار کا سماں ہے۔اے میرے دوست! آؤ مل جل کر مسرت کے یہ لمحے سمیٹ لیں......آؤ اگلی منزل کا سفر شروع کردیں۔چشتیاں' وہاڑی' جنوبی پنجاب' پورا پاکستان......ساری کائنات ایک نقطۂ آرزو میں سمٹ گئی۔

4.5۔واشنگٹن ڈی سی

واشنگٹن کو کچھ لوگ دنیا کا صدر مقام بھی کہتے ہیں۔

کھانا ختم ہونے کے بعد ہم سیدھے قدیر کے گھر پہنچے۔اگلی صبح ہمارا پروگرام واشنگٹن جانے کا تھا۔واشنگٹن شہر جسے ڈسٹرکٹ آف کولمبیا یا ڈی سی بھی کہتے ہیں امریکہ کی کسی ریاست کا حصہ نہیں۔اس کا انتظام وانصرام

براہِ راست امریکی کانگریس کے پاس ہے۔ جمہوریت کے تینوں ستون یعنی مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کا مرکز یہی شہر ہے۔ ایک سو چھہتر ممالک کے سفارت خانے اور لاتعداد بین الاقوامی اداروں کے مرکزی دفاتر...... یہاں آپ کو بھانت بھانت کا شخص نظر آئے گا۔ سیاستدان، ادیب، دانشور، پروفیشنلز، بنکرز، وکیل، صحافی، تاجر اور پھر وہ لوگ جو آپ کے نقطۂ نظر کو کانگریس تک پہنچا سکتے ہیں۔ آپ کے مفاد کے فروغ کے لئے کمر بستہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ خدائی خدمت گار نہیں بلکہ یہ سارا کام معاوضہ کے عوض کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کے ذریعے ممبران کانگریس سے لے کر ہر انتظامی عہدیدار تک پہنچ سکتے ہیں اور قانون سازی کے عمل پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں............ ان لوگوں کو عرفِ عام میں Lobbyist کہا جاتا ہے۔ یہ کام اب دنیا کی بہت بڑی صنعت بن چکا ہے۔ اس کا صدر مقام بھی واشنگٹن ہے۔ Lobbyist اپنے کام کو Networking کہتے ہیں جو سفارش اور اقربا پروری کا دوسرا نام ہے۔ واشنگٹن ابتدا میں جارج ٹاؤن اور الیگزینڈریہ نامی دو قصبوں پہ مشتمل تھا۔ اس وقت اس شہر کی کل آبادی سات لاکھ ہے لیکن اردگرد کے وہ علاقے جو ورجینیا اور میری لینڈ کا حصہ ہیں بھی شامل کریں تو یہ آبادی پچاس لاکھ کے لگ بھگ بن جاتی ہے۔ اس شہر کو دو مرتبہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا...... 1812 میں ہونے والا برطانوی حملہ اور 1860 میں ہونے والی امریکن سول وار۔ اوول آفس میں ہونے والے بین الاقوامی واقعات کے علاوہ امریکی تاریخ کے کئی اہم واقعے یہیں رونما ہوئے۔ ابراہام لنکن کا قتل اور مارٹن لوتھر کنگ کا عظیم اجتماع۔ انیسویں صدی میں غلامی کے خاتمہ کا اعلان بھی یہیں ہوا اور اس پر ابراہام لنکن نے دستخط بھی اسی شہر میں کئے۔ شہر کا نقشہ اور ڈیزائن ایک فرانسیسی انجینئر نے 1790 میں بنایا۔

فنِ تعمیر کے اعتبار سے امریکہ کی دس مقبول عمارتوں میں سے چھ عمارتیں اس شہر میں واقع ہیں۔ وائٹ ہاؤس، نیشنل کیتھڈرل، تھامس جیفرسن میموریل، یو۔ ایس کیپیٹل، لنکن میموریل اور ویت نام کے سپاہیوں کی یادگار............ ان پُرشکوہ عمارتوں میں یونانی، رومن، گوتھک، جارجین اور جدید طرزِ تعمیر کے سارے رنگ مخفی ہیں۔ رونالڈ ریگن کے نام پر بنی ایک عمارت شہر کی سب سے بڑی عمارت ہے۔ اس کا رقبہ تیس لاکھ مربع فٹ سے بھی زائد ہے۔ شہر کی نصف سے زائد آبادی سیاہ فام افراد پہ مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک منفرد شہر ہے۔ کسی زمانے میں واشنگٹن قتل و غارت کا بہت بڑا مرکز تھا اور اسے مرڈر کیپیٹل آف دی ورلڈ بھی کہا جاتا تھا

لیکن اب جرائم میں نا قابلِ یقین حد تک کمی ہو چکی ہے۔ چھ لاکھ کی آبادی میں آج بھی ساٹھ ہزار افراد ایسے ہیں جو مختلف جرائم میں سزا پا چکے ہیں۔ گویا اس شہر کا ہر سولہواں آدمی سزا یافتہ ہے۔ اس شہر کے قانون کے مطابق ایک ہی جنس کے لوگ آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ ایسے جوڑوں کو با قاعدہ لائسنس جاری کیا جاتا ہے۔ اس وقت ایسے جوڑوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ شہر کے جن علاقوں میں غربت اور منشیات کا دور دورہ ہے وہاں جرم بھی زیادہ ہے اور ان علاقوں میں زیادہ تر سیاہ فام آباد ہیں...... گویا غربت اور جرم ابھی تک انہی کا مقدر ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی لائبریری جس میں پندرہ کروڑ کے لگ بھگ کتابیں اور اہم دستاویزات رکھی گئی ہیں اسی شہر میں واقع ہے۔ لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری' قائداعظم لائبریری' دیال سنگھ لائبریری اور کراچی کی مجیٹھیہ لائبریری۔ وہاں سنا ہے اب خاک اڑتی ہے اور کتابیں لوگوں کی راہ تکتی ہیں۔ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

4.6۔ وائٹ ہاؤس اور کیپیٹل ہل

جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ واشنگٹن امریکہ کا صدر مقام بھی ہے اور دنیا کا صدر مقام بھی اور ہم ابھی تک منزل کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ میں واشنگٹن میں ان تمام جگہوں کو پھر سے دیکھنا چاہتا تھا جہاں امنِ عالم کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس روز اتنا وقت نہ تھا کہ ہم ہر جگہ جا سکتے۔ اس لیے ہمارا وزٹ صرف نیشنل مال جسے سمتھ سونین مال بھی کہتے ہیں تک محدود رہا۔ وہاں جاتے ہوئے ہم سب سے پہلے وائٹ ہاؤس کے سامنے سے گذرے۔ ہر طرف سکیورٹی کا شور۔ بیس سال پہلے جب میں یہاں سے گذرا تو اکا دکا گارڈ نظر آتے تھے۔ وائٹ ہاؤس کا ایک حصہ مہمانوں کیلئے کھلا رہتا۔ یہاں آنے والے ہر شخص کو تہہ دل سے خوش آمدید کہا جاتا۔ بیرونی اور اندرونی صحن میں' جہاں امریکی صدر پریس کانفرنس سے خطاب کرتا ہے' گھومنے پہ کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ کمرہ بھی کھلا رہتا جو لنکن کی خواب گاہ تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں ہمفری فیلوز کے ہمراہ پہلی بار اس کمرے میں آیا تو ہم بہت دیر تک یہاں بیٹھے رہے۔ اس کمرے کی زیبائش اس وقت بھی وہی تھی جیسی لنکن کے وقت میں تھی۔ اسی طرز کے پردے' صوفے اور قالین۔ لنکن کا بیڈ انتہائی بے ڈھب' سخت اور

کھر درا تھا۔ روزویلٹ نے ایک بار چرچل کو اس کمرے میں ٹھہرایا۔لیکن ایک گھنٹے کے بعد ہی وہ اپنے سٹاف کو برآمدے میں ٹہلتا ہوا ملا اور اس کیلئے دوسرے کمرے کا بندوبست کرنا پڑا۔ چرچل کا کہنا تھا کہ ''اتنا سخت بیڈ! لنکن کے بیڈروم میں سونا ایک بڑا اعزاز ہے لیکن میں یہ اعزاز حاصل کرنے کیلئے اپنی رات کی نیند نہیں گنوا سکتا''۔ کچھ لوگ بڑے لوگوں کے ساتھ اس لیے منسوب ہونے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا نام بھی زندہ رہ سکے لیکن وہ لوگ چرچل نہیں ہوتے۔

لنکن اور چرچل۔انیسویں اور بیسویں صدی کے بڑے انسان۔بہترین مقرر' مصنف اور مدبر۔اور پھر بہت سے اور یادگار کمرے جہاں تاریخ ساز فیصلے ہوتے رہے۔لیکن یہ سب پرانی باتیں ہیں۔اب تو یہاں پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں۔دنیا کس طرح بدلتی ہے۔اس کا اندازہ گذشتہ دس سال کے واقعات سے ہوتا ہے۔جب نفرت اور تعصب عام ہو جائے تو در و بام پر اسی طرح کے پہرے کھڑے ہوتے ہیں۔
وائٹ ہاؤس سے کیپٹل ہل بھی بہت دور نہیں۔وائٹ ہاؤس امریکی صدر کی رہائش گاہ اور دفتر ہے جبکہ کیپیٹل ہل امریکی کانگرس' سینٹ اور سپریم کورٹ کی آماجگاہ۔کیپٹل ہل کا گنبد جو امریکہ کی تصاویر میں کروڑوں لوگوں نے دیکھا ہوگا' 1863 میں تعمیر ہوا۔لائبریری آف کانگرس بھی یہیں پر ہے۔امریکی کانگرس کے ممبران کی بڑی تعداد اجلاس کے دوران یہیں مقیم ہوتی ہے۔کیپیٹل ہل کے مغرب میں وسیع و عریض نیشنل مال ہے۔کچھ لوگوں کے مطابق یہ مال امریکی تاریخ کا ایک نادر خزانہ ہے جبکہ کچھ لوگوں کے مطابق امریکہ کی کوئی تاریخ ہی نہیں۔ان کا کہنا ہے کہ کیا تین سو سال کو بھی تاریخ کہتے ہیں۔کہاں مصر' بابل اور نینوا' کہاں وادی سندھ' کہاں یہ تین سو سال۔اس مال کی تعمیر کا اعزاز ایک برطانوی شہری جیمز سمتھ سن کے سر ہے۔

4.7۔نیشنل مال

جیمز سمتھ سن اپنے وقت کا مشہور سائنسدان تھا۔دولت مند بھی اور فیاض بھی۔ایک ہی شخص میں یہ دونوں خوبیاں کم کم ملتی ہیں۔جیمز نے اپنی وفات سے چند روز پہلے وصیت کے ذریعے اپنی جائیداد ''علم کی ترویج'' کے لیے مخصوص کر دی۔اس وقت اس کی مالیت نصف ملین امریکی ڈالر تھی۔جیمز سمتھ سن نے یہ شرط بھی عائد کی کہ یہ دولت صرف امریکہ میں خرچ ہوگی۔سمتھ سن کی وفات 1929 میں ہوئی۔امریکی کانگرس نے اس

رقم سے کوئی سکول یا یونیورسٹی بنانے کی بجائے عجائب گھر بنانے کا فیصلہ کیا اور یہ رقم Smithsonian Trust کو پیش کر دی گئی۔ٹرسٹ کا مقصد تاریخی ورثے کا تحفظ تھا۔ ٹرسٹ نے اس منصوبے کا اعلان کیا تو ملک بھر سے لوگوں نے اپنی قیمتی اشیاء یہاں بھیجنا شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک دنیا بھر میں پھیل گئی۔ انیسویں صدی میں امریکہ کے بحری جہاز دنیا میں جہاں جاتے ان عجائب گھروں کے لیے اشیاء اکٹھی کرنے لگتے۔ سمتھ سن کا خواب پورا ہونے لگا۔ امریکی کانگرس نے لنکن میموریل اور کیپیٹل ہل کے درمیان پھیلا ہوا ایک قطعہ زمین بھی ٹرسٹ کے حوالے کر دیا جس نے یہاں چھوٹے بڑے گیارہ عجائب گھروں کی بنیاد رکھ دی۔ یہ عجائب گھر امریکی تاریخ کی پوری کہانی سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس کہانی میں صرف ماضی ہی نہیں مستقبل بھی ہے۔ یوں بھی عجائب گھر بنائے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ ان کے افق سے مستقبل کا سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آئے۔ کم نگاہ انہیں ماضی کا مزار سمجھ کے نوحہ خوانی کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ ان عجائب گھروں کی وجہ سے نیشنل مال کو سمتھ سونین مال بھی کہا جاتا ہے۔ ٹرسٹ کا سالانہ بجٹ ایک بلین ڈالر کے قریب ہے۔ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں امریکہ کا چیف جسٹس، امریکی نائب صدر اور ملک کی چند اور نمایاں شخصیات شامل ہوتی ہیں۔ ہر سال اڑھائی کروڑ سے زیادہ افراد ان عجائب گھروں کا وزٹ کرتے ہیں۔ یہ وزٹ بے حد Inspiring ہوتا ہے۔ اس وزٹ کے بعد ہر شخص یہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے جاتا ہے۔ کوئی خلش، کوئی خواب، کوئی آرزو۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص یہاں آئے اور اس کے اندر تبدیلی کی لہر جنم نہ لے۔

نیشنل میوزیم آف امیریکن ہسٹری، نیشنل میوزیم آف ایفریقن ہسٹری، نیشنل میوزیم آف نیچرل ہسٹری، نیشنل میوزیم آف امیریکن انڈینز، نیشنل میوزیم آف آرٹ، نیشنل ائیر اینڈ سپیس میوزیم۔ قدم قدم حیرت اور قدم قدم استعجاب۔ دیدۂ بینا ہو تو یہاں سبق ہی سبق ہیں۔ سمتھ سونین مال میری پسندیدہ جگہ تھی۔ میں نے یہاں کئی بار بہت طویل وقت صرف کیا۔ اس روز اتنا وقت تو نہ تھا کہ ہم یہاں بکھرے ہوئے عجوبوں کو پھر سے دیکھتے۔ اس لیے ہم نے یہاں سے محض گذر جانا ہی غنیمت جانا۔ امیریکن یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کا کہنا تھا کہ سمتھ سونین پہنچ کر انسان ماضی میں نہیں مستقبل میں قدم رکھتا ہے۔ اس مال کے بنانے کا

مقصد بھی یہی ہے۔ غالب نے بھی تو یہی کہا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا' پایا

4.8۔ مارٹن لوتھر کنگ ۔ لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

دشتِ امکاں اور تمنا کا دوسرا قدم۔

سمتھ سونین میں ایک باغیانہ آواز کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ اس آواز کا نام مارٹن لوتھر کنگ جونیئر ہے۔ مارٹن لوتھر ایک مشہور مذہبی اور سماجی رہنما تھا۔ اس نے امریکی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ شہری حقوق کا علمبردار اور گاندھی کے فلسفہء عدم تشدد کا پیروکار۔ اس کو امن کا نوبل پرائز بھی ملا۔

اس کی مشہور عالم تقریر "I have a Dream" کو بیسویں صدی کی بہترین تقریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس روز یہ تقریر ہوئی اس روز سمتھ سونین مال میں دو لاکھ افراد جمع تھے۔ مارٹن لوتھر نے سترہ منٹ تک ان سے خطاب کیا۔ وہ خطاب نہیں کوئی جادو تھا جس نے پہلے تو ان دو لاکھ افراد کو اور پھر پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس تقریر کی گونج اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک اس روز دیکھا گیا خواب پورا نہیں ہوتا۔ یہ خواب کیا ہے...... برابری اور انصاف کا خواب' بھائی چارے اور مساوات کا خواب! مجھے اس خواب اور اخوت کے خواب میں زیادہ فرق دکھائی نہیں دیتا۔

مارٹن لوتھر کنگ 1929 میں پیدا ہوا۔ لڑکپن میں وہ بہت مذہبی نہ تھا لیکن آہستہ آہستہ اس طرف راغب ہونے لگاا اور پھر اس نے مذہب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ 1955 میں اس نے بوسٹن یونیورسٹی سے مذہبی علوم میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لی۔ مارٹن کی زندگی انسانی حقوق کی سربلندی کیلئے وقف تھی۔ وہ دنیا کا سب سے کم عمر نوبل پرائز ونر ہے۔ عدم تشدد اور بھائی چارہ' یہ دو اصول تھے جن کے گرد اس کی زندگی گھومتی رہی۔ لیکن خود اس کی موت ایک بندوق سے نکلی ہوئی گولی سے ہوئی۔ گاندھی سے لے کر مارٹن لوتھر تک! عدم تشدد کے ہر علمبردار کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ نظریات میں حقیقت کا رنگ شاید اسی طرح بھرا جاتا ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کو نوبل پرائز کے ساتھ امریکہ کا ہر بڑا اعزاز پیش کیا گیا۔ اس کی یاد قومی تہوار کے طور پر منائی

جاتی ہے۔امریکہ کے سات سوتیس شہروں کی مختلف سڑکیں اس کے نام سے منسوب ہیں۔اسے امریکہ کے عظیم مقرر کا خطاب بھی ملا۔ مارٹن لوتھر جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی عمر صرف انتالیس سال تھی۔ اس مختصر عمر میں اتنا کام اور اتنا نام۔ایک معمولی گولی نے ایک ایسی زندگی کا خاتمہ کر دیا جس نے لوگوں کو حقیقی آزادی سے روشناس کر دیا۔

کنگ کو شاید علم تھا کہ وہ جواں عمر میں ہی دنیا سے چل بسے گا۔اس کی خواہش تھی کہ اس کے مرنے پر جب لوگ آخری رسومات میں شرکت کیلئے آئیں تو ان میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ کنگ یہاں پیدا ہوا' اس سکول میں پڑھا اور پھر اس نے نوبل پرائز جیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ صرف اس جدوجہد کی بات کریں جو اس نے انسانیت کی بھلائی کیلئے کی۔اس نے اس موقعہ پر جو الفاظ کہے وہ کچھ یوں ہیں:

"I'd like somebody to mention that day that Martin Luther King Jr. tried to give his life serving others. I want you to say that day that I tried to be right on the war question. I want you to be able to say that day that I did try to feed the hungry. I want you to be able to say that day that I did try in my life to clothe those who were naked. I want you to say on that day that I did try in my life to visit those who were in prison. And to say that I tried to love and serve humanity.

Yes, if you want to say that I was a drum major. Say that I was a drum major for justice. Say that I was a drum major for peace. I was a drum major for righteousness. And all of the other shallow things will not matter."

مارٹن لوتھر کنگ کی عمر سیاہ فاموں کے حقوق کے لیے لڑتے ہوئے گذری۔ وہ اخوت کا داعی تھا۔اس نے اپنی انتالیس سالہ عمر میں امریکی تاریخ پہ بہت گہرے اور پائیدار نقوش ثبت کیے۔"I have a Dream" نامی تقریر اس کی زندگی کی خوبصورت تقریر تھی۔اس تقریر میں پوشیدہ انقلاب کی گھن گرج انسان کو ہلا کے رکھ دیتی ہے۔الفاظ کی سادگی اور تکرار نے اس تقریر کو لازوال بنا دیا۔ مارٹن لوتھر کنگ نے جو خواب دیکھا وہ

خواب صرف اسی کا خواب نہیں رہا۔ بعض لوگ اپنے غم کو دنیا کا غم بنا دیتے ہیں۔

4.9۔انسان خسارے میں ہے

سمتھ سونین مال اور وہاں بکھری ہوئی کہانیاں بہت دلنشیں اور خوبصورت ہیں لیکن اس تصویر کا ایک اور رخ بھی ہے۔ یہ عجائب گھر امریکہ کے خلاف ایک فردِ جرم بھی ہیں۔ یہ فردِ جرم بہت کم لوگوں کو نظر آتی ہے۔ کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی اس فرد جرم کے کئی عنوان ہیں۔ ایک عنوان آبائی باشندوں کی موت اور دوسرا سیاہ فاموں کی نسل کشی ہے۔ کولمبس کی امریکہ آمد کے وقت امریکہ کے طول وعرض میں مقامی باشندوں، جنہیں کبھی ریڈ انڈینز کہا جاتا تھا، کی تعداد کروڑوں میں تھی۔ آج ان کی تعداد صرف اڑھائی لاکھ ہے۔ افزائش آبادی کی شرح کے مطابق ان کی موجودہ آبادی ستر کروڑ سے زائد ہونی چاہیے تھی۔ یعنی امریکہ کے یہ اصل باسی اگر گاجر مولی کی طرح کاٹے نہ جاتے تو شاید چین اور بھارت کے بعد آج دنیا کی تیسری بڑی قوم ہوتے۔ لیکن یورپ سے آنے والے بحری قزاقوں، لیٹروں اور جنگجوؤں نے ان کو صفحہ ہستی سے تقریباً مٹا کے رکھ دیا۔ یہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ کروڑوں نہتے اور بے گناہ لوگ۔ جو اپنی اپنی تہذیبی روایت میں مگن، لاتعداد قبائل میں تقسیم تھے۔ وہ خود ایک دوسرے کے دشمن بھی تھے لیکن ایک روز ایک طوفان بلاخیز، ان کو ہمیشہ کیلئے بہا کے لے گیا۔ نہ کوئی مرثیہ، نہ کوئی شہر آشوب۔ یہ دلی تو نہ تھی کہ شاعر آنسوؤں سے لٹنے کی داستان لکھتے اور نہ ہی یہ قرطبہ کی مسجد تھی کہ کوئی اپنے لہو کی تسبیح میں اشعار کے دانے پروتا۔ بہت ڈھونڈا تو ایک مشہور ریڈ انڈین شاعر کی درج ذیل نظم میں ان معصوم لوگوں کے قتل اور اس سے منسلک المیہ کا تذکرہ ملا:

میں دیکھتا ہوں
اور روتا ہوں
اس یخ بستہ اور ویران راستے کو
جس کے قدم قدم پر
بھوک سے بلکتے ہوئے
میرے معصوم بچوں کی چیخیں ایستادہ ہیں

لاغر ولاچار ماؤں کے آنسو بکھرے ہیں
اس راستے پر ایک ایک جھاڑی تلے
میری نسل اور قبیلے کے بے گناہ
قتل ہونے والے
بچوں، عورتوں اور مردوں کی
قبریں پوشیدہ ہیں
میں یہ دیکھتا ہوں اور روتا ہوں
کہ میرے اجداد کی وسیع زمینوں میں
ہماری قبروں کے نشان بھی باقی نہیں رہیں گے

قبروں کی یہ بے نشانی اور آسمان کو چیرتی ہوئی چیخیں۔ یہ سب کسی لوحِ محفوظ پہ لکھا جا چکا ہے۔ ایک روز جب زمین شق ہوگی اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے تو ہر مدعی کو آواز ملے گی۔ یہ آوازیں دوبارہ بلند ہوں گی۔ آبائی باشندوں کے بعد اگلا نشانہ سیاہ فام بنے جنہیں تحقیر سے نیگرو کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کم از کم اڑھائی سے تین کروڑ سیاہ فام غلامی کا سفر یا غلامی کی مشقت سہتے سہتے دنیا سے چل بسے۔ بے صدا، بے نوا۔ پھر بھی بیسویں صدی تک امریکی قانون ان کو کم تر مخلوق سمجھتا رہا۔ امریکہ کے پہلے بارہ صدور غلاموں کے مالک تھے۔ بھوکے، پیاسے، تہی دست، تہی دامن سیاہ فام، جنہیں بھیڑیوں کے سامنے پھینکا گیا، درختوں پر پھانسی دی گئی، جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا، ماؤں سے جدا کیا گیا، زبانیں کاٹی گئیں، برہنہ کر کے نیلام کیا گیا، جنسی اعضاء کاٹے گئے، برف پہ لٹایا گیا، تپتی ریت پر گھسیٹا گیا، شکاری کتوں کی خوراک بنایا گیا، مرد وزن کو تلوار کے ایک ہی وار سے دو ٹکڑے کر دینے پر شرطیں لگائی گئیں۔ یہ خونچکاں داستانیں زیادہ پرانی نہیں۔ یہ سارا ظلم صرف کچھ عرصہ پہلے تک روا تھا۔ افسوس ظلم کی یہ کہانی اب بھی جاری ہے۔ دنیا نے رنگ بدلا ہے ڈھنگ نہیں۔ ماضی کی اس فردِ جرم میں ہر روز نئے جرائم کا اضافہ ہوتا ہے۔ طاقتور کمزوروں کے خلاف ہر روز جارحیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہر طرف پھیلی توپ وتفنگ اور بارود کی بُو۔ آج بھی گریہ کے ہزاروں مقام ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان پر ظلم وستم کا یہ پہاڑ پہلی بار نہیں ٹوٹا۔ یہی زنداں ہیں، یہی زنجیریں، یہی صلیبیں۔ صرف زمان ومکان بدلتے

ہیں۔کبھی مغرب کبھی مشرق۔انسان نہیں بدلتا۔وہی بے بسی وہی کج روی۔اسی لیے تو خالقِ کائنات نے زمانے کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ انسان خسارے میں ہے۔انسان خسارے میں ہے۔انسان خسارے میں ہے۔

4.10۔جیفرسن......مدبر صدر

سمتھ سونین مال امریکی تاریخ کی گذرگاہ ہے۔

اس کے ایک کنارے پہ جیفرسن میموریل نامی خوبصورت یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ یہ یادگار ایک سابق امریکی صدر تھامس جیفرسن کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے۔اس یادگار کے اردگرد کھلے چیری بلاسم کے دلکش درخت جاپان نے 1912 میں امریکہ کو تحفہ کے طور پر پیش کئے۔اہلِ جاپان کو کیا خبر تھی کہ ان پھولوں کا جواب 1945 میں ہیروشیما اور ناگا ساکی کی تباہی کی صورت میں ملے گا۔اعلانِ آزادی کے مصنف' تیسرے امریکی صدر' یونیورسٹی آف ورجینیا کے بانی' تھامس جیفرسن کا شمار امریکہ کے فاؤنڈنگ فادرز Founding Fathers میں ہوتا ہے۔ پانچ ہزار ایکڑ پر پھیلی ہوئی جاگیر کا مالک تھامس جیفرسن کئی طرح کی خوبیوں کا حامل تھا۔پانچ زبانوں پہ مکمل عبور' کئی کتابوں کا مصنف' ماہرِ تعمیر' سائنس' مذہب اور فلسفہ کا شیدائی۔ مذہبی آزادیوں کا علمبردار لیکن نسلی امتیاز کا پروردہ۔اس کی جاگیر پر سیکڑوں سیاہ فام اس کے اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے۔انہی میں ایک سیاہ فام عورت سیلی ہیمنگ بھی تھی۔جیفرسن کا حکم امریکہ پہ چلتا اور سیلی ہیمنگ کا جیفرسن پر۔دوسو سال بعد 1998 میں ڈی این اے ٹیسٹ نے ثابت کیا کہ اس سیاہ فام عورت کے بطن سے جنم لینے والے تمام بچوں کا باپ جیفرسن تھا۔ایک طرف نفرت اور دوسری جانب دادِ عیش۔جنسی بے راہروی امریکی قیادت کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔جیفرسن سے لے کر بل کلنٹن تک اور سیلی ہیمنگ سے لے کر مونیکا لیونسکی تک۔وائٹ ہاؤس کئی بار ایسی ناکام محبتوں کا مرکز بنا ہے۔جان لاک' فرانسس بیکن اور آئزک نیوٹن' جیفرسن کی محبوب شخصیات تھیں۔اس کی لائبریری میں ہزاروں کتابیں اس کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کرتیں۔ کہتے ہیں اس لائبریری میں قرآن پاک کا ایک نسخہ بھی موجود تھا جو 1764 میں شائع ہوا۔ جیفرسن کا کہنا تھا کہ کتابوں کے بغیر اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔یہی اس کیلئے روشنی ہیں' یہی خوشبو۔اس نے اپنی رہائش کے لئے ایک خوبصورت مینشن بنایا۔مونٹی چیلو (Monte Cello) کے نام سے مشہور یہ مینشن طرزِ تعمیر کا خوبصورت شاہکار تھا۔اس میں یونانی' رومن اور فرنچ عمارتوں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

جیفرسن امریکہ کا پہلا وزیرِ خارجہ' دوسرا نائب صدر اور تیسرا صدر تھا۔ بطور صدر (1801 سے 1809) اس کا سب سے بڑا کارنامہ Lusiana Purchase تھا۔ اس معاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ دولت ہو تو کبھی کبھی ملک بھی خرید لیے جاتے ہیں۔ اس معاہدہ سے پہلے امریکہ' تیرہ ریاستوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک تھا جس کا عالمی سیاست میں کوئی قابلِ ذکر کردار ہی نہ تھا۔ اس وقت کے سامراج برطانیہ اور فرانس تھے۔ اتفاق سے یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف حالتِ جنگ میں تھے۔ جیفرسن نے یہ موقعہ غنیمت جانا۔ امریکی بنکوں سے رابطہ کیا۔ پیسے اکٹھے کیئے اور نپولین بوناپارٹ کو جسے اس وقت جنگ کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی فرانس کے زیرِ تسلط کچھ علاقے خریدنے کی پیش کش کردی۔ یہ علاقے امریکہ کی اولین تیرہ ریاستوں سے ملحق تھے۔ جیفرسن ایک ماہر سفارت کار تھا۔ کئی لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل یہ رقبہ خرید کر اس نے پوری دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ مؤرخ نپولین کو اس فیصلہ پہ شاید معاف نہ کرے کہ اس نے صرف پندرہ ملین ڈالر کے عوض کرۂ ارض کی سب سے زرخیز زمین جیفرسن کے ہاتھ فروخت کردی۔ 20 دسمبر 1803 ۔ فرانس کی کالونی نیو آرلین پہ امریکہ کا جھنڈا بلند ہوا اور فرانسیسی جھنڈا ایک خوبصورت چوبی صندوق میں لپیٹ کر پیرس روانہ کر دیا گیا۔ جب اقتدار کی ہوس نگاہوں کو اندھا اور دلوں کو مردہ کر دے تو سرحدیں اسی طرح سکڑ جاتی ہیں۔ امریکہ کا رقبہ چشمِ زدن میں دوگنا ہو گیا۔ Lusiana Purchase محض اتفاق تھا یا جیفرسن کی عیاری اور دوراندیشی۔ تاریخ ابھی تک محوِ حیرت ہے۔ اگر نپولین کو یہ پندرہ ملین ڈالر کہیں اور سے مل جاتے تو شاید آج امریکہ یورپ کے ممالک کی طرح محض ایک چھوٹا سا ملک ہوتا۔ امریکہ کی تاریخ میں بہت کچھ مستور ہے۔ جرأت' ہمت' ذہانت' عیاری' بے رحمی' قتل و غارت گری' سودے بازی' آہیں' آنسو' خون' قربانیاں' حب الوطنی اور سازشیں۔ جیفرسن میموریل کے باہر چیری بلاسم کے سرخ' سفید' نیلے' پیلے' قرمزی پھولوں میں گھرا میں سوچتا رہا کہ کیا ہر بڑا ملک اسی طرح بڑا بنتا ہے۔ کیا ہر بڑی تہذیب کی بنیاد اسی طرح رکھی جاتی ہے۔

جیفرسن کو قدرت نے بہت انعامات سے نوازا۔ کوئی ایسا عہدہ نہ تھا جو اسے نہ ملا ہو۔ گورنر' وزیرِ خارجہ' نائب صدر' صدر لیکن اپنے جس کارنامے پہ اسے سب سے زیادہ فخر تھا وہ یونیورسٹی آف ورجینیا کا قیام تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے اہلِ وطن یہ نہ بھولیں کہ اس نے ایک یونیورسٹی کی بنیاد بھی رکھی۔ اس یونیورسٹی کی

عمارت بھی اس نے خود ڈیزائین کی۔ چرچ کے تسلط سے آزاد اس یونیورسٹی میں داخلے کا معیار مذہب اور دولت کی جگہ صرف اور صرف تعلیمی قابلیت تھی۔ جیفرسن کا دورِ صدارت 1808 میں ختم ہوا۔ اس کے بعد وہ سترہ سال زندہ رہا۔ یہ سارا وقت اس نے یونیورسٹی کے لئے وقف کر دیا۔ کتابوں کی آغوش، گھڑ سواری اور سیاہ فام عورتیں، آخری وقت تک اس کے محبوب مشغلے رہے۔ مجموعۂ اضداد جیفرسن کا لکھا ہوا یہ فقرہ جو امریکہ کے اعلانِ آزادی میں شامل ہے ایک ضرب المثل بن چکا ہے:

''ہم، ہر طرف نظر آنے والی اس صداقت کے امین ہیں کہ تمام انسانوں کو برابر تخلیق کیا گیا ہے۔ ان کے خدا نے انہیں خصوصی حقوق سے نوازا ہے۔ یہ حقوق نا قابلِ انتقال اور نا قابل تفویض ہیں۔ ان حقوق میں زندگی، آزادی اور خوشی کی جستجو شامل ہے۔''

We hold these truths to be self-evident, that all men are created equal, that they are endowed by their Creator with certain inalienable rights, that among these are Life, Liberty and pursuit of Happiness.

جیفرسن کا ایک مقولہ سمتھ سونین مال میں واقع اس کے میموریل پہ بھی درج ہے۔ یہ مقولہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت کا ترجمان ہے۔ علم کی اہمیت کا اس سے خوبصورت اظہار اور کیا ہوگا:

"If a nation expects to be ignorant and free, in a state of civilization, it expects what never was and never will be."

جیفرسن کا یہ کہنا کہ انسانوں کو برابر تخلیق کیا گیا ہے صرف اسی سے مخصوص نہیں......ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں۔ اگر فوقیت ہے تو بس کردار کو اور تقویٰ کو۔ ایک عام انسان کی نصیحت ملکی آئین کا حصہ بن گئی لیکن محسنِ انسانیت کا حکم اس کے پیروکاروں نے فراموش کر دیا۔ زوال کی وجہ ڈھونڈنا کچھ مشکل نہیں۔ چیری بلاسم کے پھولوں نے مسکراتے ہوئے یہ کہا اور میں چشمِ نَم لئے وہاں سے رخصت ہونے لگا۔ سمتھ سونین مال پر بنے یہ عجائب گھر اور یادگاریں ماضی کی گذرگاہ ہی نہیں، مستقبل کا راستہ بھی ہیں اور یہ سبق صرف امریکہ کیلئے نہیں تمام اہل عالم کیلئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نگاہیں اندھی نہیں ہوتیں وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

4.11۔ یہ شفق رنگ لہو

جیفرسن میموریل سے کچھ ہی فاصلہ پر لنکن میموریل واقع ہے۔ سمتھ سونین کی سب سے بارعب عمارت! جہاں پر بڑا لنکن کا عظیم الشان مجسمہ امریکی تاریخ میں اس کی اہمیت کا اعتراف ہے۔ خوبصورت حروف میں لکھی ہوئی یہ تحریر لنکن کی عظیم خدمات کا احاطہ کرتی ہے:

In this temple, as in the hearts of the people for whom he saved the Union, the memory of Abraham Lincoln is enshrined forever.

مجسمہ کے روبرو ایک وسیع چبوترہ ہے جہاں کھڑے ہو کر مارٹن لوتھر کنگ نے اپنی یادگار تقریر کی۔ میموریل کے عین قدموں میں ایک جانب ویت نام کے شہداء کی یادگار تعمیر کی گئی ہے اور دوسری جانب کوریا کی جنگ اور جنگِ عظیم دوم کی یادگاریں ہیں۔ ویت نام کے شہداء کی یادگار پتھر کی ایک طویل دیوار ہے جس پر ان اٹھاون ہزار سپاہیوں کے نام درج ہیں جو بہت دور ویت نام میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ کبھی کبھی اس یادگار کے اردگرد سیکڑوں لوگ نظر آتے ہیں۔ کوئی پھول پیش کرنے آتا ہے۔ کوئی دعا کرتا ہے' کوئی آنسوؤں کے موتی چھوڑ جاتا ہے۔ آنے والے دوست اور عزیز ہی ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں روشن' انتظار کے دیئے کب کے بجھ چکے لیکن ان بجھتے ہوئے دیوں کو ابھی ان کے سوال کا جواب نہیں ملا.................. کیا مائیں بچوں کو اس لیے جنم دیتی ہیں کہ انہیں بارود کی نذر کر دیا جائے۔ یہ جنگ ان سیکڑوں جنگوں میں سے ایک ہے جو امریکہ نے ''امنِ عالم کی عظمت'' کیلئے لڑیں۔ کیا اس جنگ کا کوئی اخلاقی جواز تھا۔ کیا کسی بھی جنگ کا کوئی اخلاقی جواز ہوتا ہے۔ خود امریکہ میں بہت سے لوگوں نے جنگوں کے خلاف آواز بلند کی لیکن یہ آوازیں وقت کے گنبد میں محض ایک گونج ثابت ہوئیں۔ جنگ کے جنون میں امن کی ہر آواز محض گونج ہی ہوتی ہے۔

بیس سال پہلے مجھے شہداء سے منسوب یہ دیوار بہت اچھی لگی تھی۔ اس پہ لکھے ہوئے نام بڑی دیر تک میرے ذہن میں جگمگاتے رہے۔ آج میں نے اس دیوار کو دیکھا تو مجھے اپنے شہید یاد آنے لگے۔ خیبر سے کراچی۔ گلگت' کوئٹہ' راولپنڈی' اسلام آباد۔ پاکستان میں بھی مزارِ قائد پر ایک دیوار بنی چاہیے جہاں ان بہادر سپاہیوں کے نام لکھے جائیں جو سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے مارے گئے یا پھر اس دہشت گردی کا شکار

ہوئے جو نہ جانے کس جرمِ ضعیفی کی سزا ہے۔گلی کوچوں سے لے کر مساجد تک ہم نے کہاں کہاں قیمت ادانہیں کی۔ یہ قربانی' یہ شفق رنگ لہو بھی ایک درخشاں صبح کا امین ہے۔

4.12۔ہم تو مائل بہ کرم ہیں

چیری بلاسم کے خوبصورت پھول پیچھے رہ گئے۔

ہمیں دو بجے مائیکروفنانس کے ایک گُرو روبرٹ سکوفیلڈ سے ملنا تھا۔ روبرٹ سکوفیلڈ اس ادارے کا سربراہ ہے جس سے مائیکروفنانس کی اولین یادیں وابستہ ہیں۔ ان دنوں کی خوبصورت یادیں جب مائیکروفنانس ابھی ایک کاروبار نہ بنا تھا۔ جیفرسن میموریل سے نکل کر ہم نے نارتھ ویسٹ واشنگٹن کا رخ کیا۔سکوفیلڈ سے یہ ملاقات منال بخش کے توسط سے طے پائی تھی۔ روبرٹ سکوفیلڈ ''فِنکا'' نامی ایک ادارے کا صدر اور چیف ایگزیکٹو ہے۔فِنکا (FINCA - The Foundation for International Community Assistance) کو لوگ غریبوں کا ورلڈ بنک بھی کہتے ہیں۔ دنیا میں مائیکروفنانس کا آغاز گرامین بنک اور فِنکا نامی اس ادارے سے ہی ہوا۔فِنکا کا صدر مقام واشنگٹن میں ہے جب کہ دنیا بھر کے اکیس ممالک میں اس کی شاخیں کام کرتی ہیں۔ واشنگٹن کے سب سے مہنگے علاقے کی ایک بلڈنگ کی بلندو بالا منزل میں قائم اس ادارے کے قرضوں کا حجم 300 ملین ڈالر ہے۔

فِنکا کا آغاز 1984 میں جان ہیچ نامی ایک شخص کے ہاتھوں ہوا۔ جان ہیچ John Hatch کا تعلق امریکہ سے تھا۔ یونیورسٹی آف وسکونسن سے گریجوایشن کرنے کے بعد وہ لاطینی امریکہ کے ایک ملک پیرو جا پہنچا اور غریبوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ وہیں سے اس نے اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کی۔ پیرو کے علاوہ بھی وہ کئی ایک ملکوں میں ترقیاتی پروگراموں سے منسلک رہا لیکن نتائج کے اعتبار سے اسے ہر بار مایوسی کا سامنا ہوا۔ بہت جلد وہ اس نتیجے پہ پہنچا کہ لوگوں کی ترقی کی راہ میں سب سے پہلی رکاوٹ خود حکومت ہے اور دوسری رکاوٹ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے ماہرین ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر حکومت اور یہ ماہرین لوگوں کے راستے سے ہٹ جائیں تو وہ خود ترقی کے راستے پر گامزن ہونے لگیں گے۔ جان ہیچ کی یہی سوچ دیہاتی بینکنگ نظام کی بنیاد ثابت ہوئی۔ سب سے پہلے جس ملک میں دیہاتی بنک نے کام شروع کیا اس کا نام کوسٹاریکا ہے۔ اس کے بعد ایلسیلو اڈور' میکسیکو' ہنڈورس' گوئٹے مالا۔ لاطینی امریکہ کے بعد یوگنڈا'

ملاوی، تنزانیہ، زمبیا یہاں تک کہ یہ کام دنیا بھر کے کئی ممالک میں پھیل گیا۔ اس وقت سات لاکھ سے زیادہ افرادِ فِنکا کے دیہاتی بنکوں سے منسلک ہیں۔ اس نظام کے پانچ اہم مقاصد میں انتہائی غریب افراد تک رسائی، وسعت، استحکام، تنوع اور اپنے گاہکوں سے دوستانہ رویہ شامل ہیں۔

ان مقاصد کا حصول کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ جان ہیچ کی ایک تحریر سے ہوسکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ''میں نے 1984 میں دیہاتی بینکنگ سے منسلک فِنکا (FINCA) نامی ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں دیہاتی بینکنگ سے ہی منسلک ہوں۔ جتنی تیزی سے وقت گزر رہا ہے اسی تیزی سے میری حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ میرے دامن میں سوال زیادہ ہیں اور جواب کم۔ دیہاتی بنک کا مقصد انتہائی غریب لوگوں تک پہنچنا تھا لیکن آج بھی ان گنت غریب گھرانے اس سہولت سے مستفید نہیں ہو پا رہے۔ وسعت اور مالی استحکام جیسے مسائل نے بنک کے بنیادی مقاصد کو دھندلا کے رکھ دیا ہے۔ کبھی کبھی میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ استحکام سے ہماری کیا مراد ہے؟ ہم کس کے استحکام کے لئے سرگرداں ہیں۔ دیہاتی بنک کا استحکام یا غریب کسٹمرز کا استحکام؟ اگر ہم یہ دونوں ہدف بیک وقت پورے نہیں کر سکتے تو ایک ہدف کو دوسرے پر فوقیت کیوں دی جاتی ہے۔ اگر ہم صرف اس غریب گھرانے کے استحکام کی بات کریں جو ہمارا کسٹمر ہے تو پھر ہماری ترجیح کیا ہونی چاہیے۔ اس کی جانب سے ماہوار قسط کی بروقت وصولی یا اس کے بچوں کی فیس کی ادائیگی۔ ان دونوں میں سے کس کو اولیت ملنی چاہیے۔ دوسرا معاملہ پروگرام کی وسعت کا ہے۔ وسعت کے معنی کیا ہیں اور اس کی سمت کیا ہونی چاہیے۔ کیا اس سے مراد بہت زیادہ کسٹمر یا بہت زیادہ قرضے ہیں یا ہمیں تھوڑے کسٹمرز کو مستقل بنیادوں پر اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔ اگر ہم اپنے کسٹمرز کی تعداد بڑھاتے ہیں تو ان کی صلاحیتوں اور ان کی آمدنی کو کیسے بڑھائیں گے۔ ان کے کاروبار کو لاحق خطرات اور ان کی صحت و زندگی کو درپیش مسائل کا حل کیسے ہوگا؟ ان تمام باتوں کی اصل صرف ایک ہی سوال ہے۔ کیا ہم دیہاتی بینکنگ اور چھوٹے قرضوں کے ذریعے اپنے بنیادی مقصد کو حاصل کر رہے ہیں؟ استحکام اور وسعت جیسی ترجیحات کو بنیادی مقاصد سے ہٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اگر کسٹمر کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو اس استحکام اور وسعت کا کیا فائدہ۔ اگر انتہائی غریب لوگ ہی غربت سے نہ نکل پائے تو اس سارے گورکھ دھندے سے کیا حاصل؟'' جان ہیچ اب فِنکا سے براہِ راست منسلک نہیں۔ فِنکا کی سربراہی اب روپرٹ

سکوفیلڈ اور کچھ دیگر لوگوں کے پاس ہے۔

سکوفیلڈ سے ملاقات کے دوران فِنکا سے زیادہ ''اخوت'' کی باتیں ہوئیں۔ وہ اخوت کے ماڈل سے آگاہ تھا۔ اس کے سوالوں میں تجسس اور حیرت تھی۔ سکوفیلڈ نے اخوت کے ماڈل کی فراخدلی سے تعریف کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس ماڈل کے لئے تیزی سے وسعت اختیار کرنا مشکل ہو گا لیکن اس کا بلاسود پہلو یقیناً اس قابل ہے کہ اسے سراہا جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ایک حامی کی زبان سے یہ سن کے مسرت ہوئی۔ سکوفیلڈ نے پاکستان آنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ غربت کے خاتمہ کے لئے جان ہیچ' سکوفیلڈ اور فِنکا کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں لیکن بھاری سروس چارجز کی بناء پر انہیں تنقید کا سامنا رہے گا۔ مجھے وہ ساری بحث یاد آنے لگی جو ہارورڈ یونیورسٹی میں پہلے روز ہوئی۔ مائیکروفنانس کاروبار ہے یا ذمہ داری۔ اسے کاروبار بنا کر ہم کروڑوں لوگوں تک تو پہنچ جائیں گے لیکن کیا اس طرح غربت ختم ہو جائے گی۔ منزل تک پہنچنے کیلئے راستہ بھی تو درست ہونا چاہیے۔ سکوفیلڈ کی گفتگو میں گرمجوشی اور تپاک تھا۔ ملاقات کے بعد ہم لفٹ کی طرف جانے لگے تو قدیر نے پوچھا کہ فِنکا کے موجودہ کسٹمر سات لاکھ ہیں اور اخوت کے ایک لاکھ سے بھی کم۔ ہم اس مقام پر کب پہنچیں گے۔ ''اس کا انحصار ہماری دردمندی پر ہے۔ اس عظیم فلسفہ کی پیروی پر جس کا نام مؤاخات ہے۔ اگر پاکستان کے پچاس فیصد خوشحال لوگ پچاس فیصد غریبوں کو اپنا بنالیں......مواخات کے اسی جذبہ کے تحت جس کی تعلیم ہمیں دی گئی ہے تو یہ پچاس فیصد جو غریب ہیں غربت کی دلدل سے نکل سکتے ہیں۔ ایک شخص یا ایک گھرانے نے ایک شخص یا ایک گھرانے کو اپنانا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں''......

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوانہ تھے

4.13۔ بالٹی مور

واشنگٹن ڈاؤن ٹاؤن سے نکل کر ہم نے بالٹی مور کا رخ کیا۔ عام حالات میں یہ سفر کچھ زیادہ لمبا نہیں لیکن رش کے اوقات کی وجہ سے تقریباً اڑھائی گھنٹے لگ گئے۔ بالٹی مور کے اسلامی مرکز میں داخل ہوتے ہی وسعت اور کشادگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بہت بڑا صحن اور پارکنگ۔ یہاں مسجد کے علاوہ' مدرسہ' لائبریری' ڈسپنسری اور ایک وسیع ہال بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ گویا مسجد صرف عبادت گاہ نہیں۔ اسلام نے مسجد کی صورت

میں ایک اہم دینی اور سماجی ادارے کی بنیاد رکھی۔ ہماری بدقسمتی کہ ہم نے اس کی افادیت کو پسِ پشت ڈالا اور گھروں تک محدود ہو گئے۔ امریکہ میں مساجد سے سماجی روابط کی خوشبو آتی ہے۔ ہم نے گاڑی پارک کی اور بڑے دروازے سے مسجد میں داخل ہونے لگے۔ اندرونی آرائش سادہ مگر عبودیت کے ذوق سے عین متصف۔ ہمارے میزبان مقبول پٹیل نے بہت سے لوگوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ یوں بھی مغرب کے وقت نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں اردگرد ہر خطے کے لوگ نظر آئے۔ افریقہ، ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید..... نغمہء توحید دنیا کے کس حصہ میں نہیں گونجا۔ نماز ادا ہوئی اور امام صاحب نے نمازیوں سے کچھ دیر رکنے کی درخواست کی۔ سب سے پہلے میرا اور ڈاکٹر قدیر کا تعارف کروایا گیا اور پھر ہمیں گفتگو کی دعوت ملی۔ یہ ایک خوبصورت موقعہ تھا۔ ارضِ غیر میں حاصل ہونے والا ایک منفرد اعزاز۔ اخوت کا وہی تصور، وہی اصول، وہی کارکردگی اور پھر لوگوں کی وہی مسرت اور وہی استعجاب۔ کچھ لوگ مائیکرو فنانس کے نظام سے آگاہ تھے۔ ایک دو نے گرامین بنک کا نام بھی سن رکھا تھا۔ لیکن ان کو اس امر کا علم نہیں تھا کہ گرامین بنک کے قرضوں پر سود بھی لیا جاتا ہے۔ کئی ایک نے پوچھا کیا اخوت بھی گرامین کی ہی تقلید ہے۔ ہمیں وضاحت کرنا پڑی کہ اخوت کا ماخذ بھائی چارے کی اسلامی روایت ہے اور ہمارا طریقہ گرامین سے مختلف ہے۔ بہت سے سوال ہوئے۔ کئی ایک جواب تو انہی سوالوں میں مخفی تھے۔ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ کیا یہ کام ان کے ہاں بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے بتایا کہ اخوت کے دائمی اصول تو سب کیلئے ہیں۔ ہم نے اس ادارے کے ذریعے کوئی نئی شے پیش نہیں کی۔ اخوت کا تصور، قرضِ حسن کی روایت، سود کی حرمت، مسجد سے رشتہ اور رضا کاریت۔ یہ ساری باتیں تو اللہ کے اس رسول ؐ کی ہیں جو غریبوں کا سب سے بڑا دوست اور ہمدرد تھا۔ بالٹی مور کا اسلامی مرکز عشقِ رسول ؐ سے معمور نظر آیا۔ ہم نے مقبول پٹیل اور ان کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا۔ پاکستان میں ملاقات کا وعدہ ہوا اور ہم معانقوں کے بعد باہر نکلے۔ باہر بہت سے نوجوان اور کم سن بچے نظر آئے جو کھیلنے میں مصروف تھے۔ مسجد کو سماجی سرگرمیوں کا محور بنا کر ہم ایک بڑی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ مجھے مقبول صاحب کی بات یاد آئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں جگہ جگہ مسجدیں آباد ہو رہی ہیں۔

بالٹی مور سے ہم نے قدیر کے گھر کا رخ کیا۔ سمتھ سونین مال، مارٹن لوتھر کنگ، تھامس جیفرسن، چیری بلاسم کے خوبصورت پھول اور فنکا کا دفتر۔ دن کا اختتام اسلامی مرکز پہ ہوا۔ گویا، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

کھانا کھا کر اگلے روز کے پروگرام کا جائزہ لیا گیا۔ کل صبح ایک اور مصروف دن تھا۔ ایک مشہور پاکستانی ڈاکٹر محمد اختر، جو واشنگٹن میں کئی ایک اہم عہدوں پہ فائز رہے، سے ملنے کے بعد امیریکن یونیورسٹی کا وزٹ اور وہیں پر ڈاکٹر اکبر ایس احمد سے ملاقات اور پھر شام کو ایک اور اہم تقریب یعنی یونیورسٹی آف میری لینڈ میں ہونے والا ڈنر۔

4.14۔ اگلا روز: کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

قدیر دفتر سے مکمل رخصت لے چکا تھا۔ اس کے گھر آج تیسرا روز تھا۔ اس کے علاوہ بھی گھر کے سب لوگ مہمان نوازی پہ کمر بستہ تھے۔ جب وہ میڈیکل کالج میں تھا تب بھی اس کا گھر مہمانوں سے بھرا رہتا۔ خدمت کچھ لوگوں کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے گھر ہونے والی کھانے کی دعوتیں ہمیں اب تک یاد تھیں۔ سردیوں میں ساگ، مکھن، مکئی کی روٹی، لسی اور گنے کے رس کی کھیر کا خصوصی انتظام ہوتا۔ یہ ساری چیزیں اس کے گاؤں سے آتیں۔ لسی کو اس نے ''گوجر کولا'' کا نام دے رکھا تھا۔ پوٹومک ویلی کے ایک خوبصورت گھر میں چشتیاں کی خوشبو پھیلنے لگی۔

ہم نے علی الصبح ناشتہ کیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد تیار ہونے لگے۔ قدیر کے ذمہ رات کے ڈنر کی تیاری تھی اس لئے دن کا پہلا حصہ مجھے چوہدری اللہ بخش کے ساتھ گذارنا تھا۔ جونہی مقررہ وقت پر چوہدری صاحب نے گاڑی کا ہارن دیا ہم باہر نکلے۔ پہلا پڑاؤ ڈاکٹر محمد اختر کا دفتر تھا۔ ڈاکٹر اختر چالیس سال سے واشنگٹن میں مقیم ہیں۔ صحت کے شعبہ میں ان کا بڑا کام ہے۔ سابق صدر کلنٹن کے عہد میں کئی اہم عہدوں پہ فائز رہے۔ آج کل پبلک ہیلتھ کے ایک غیر سرکاری ادارے کے سربراہ ہیں۔ 1993 میں میں نے ان کے توسط سے واشنگٹن سٹی گورنمنٹ کے صحت کے شعبہ میں انٹرن شپ بھی کی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک دو بار پاکستان آئے تو مختصر ملاقات ہوتی رہی۔ بہت طویل عرصے کے بعد انہیں دیکھا لیکن کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ انہوں نے اپنے دفتر کے چند سینئر افراد کو بھی اس میٹنگ کے لیے بلا لیا اور بہت دلچسپی سے اخوت کی کہانی سنی۔ ہماری گفتگو کے دوران ان کے ایک عمر رسیدہ ساتھی مسلسل سر ہلاتے رہے اور آخر میں صرف ایک بات کہی...... ''ناقابلِ یقین''...... ان کی ایک اور ساتھی نے کہا کہ یہ بہت خوبصورت کہانی ہے۔ اگر اس کہانی کو کوئی داستان گو مل جائے تو یہ Instant Hit ہے۔ ڈاکٹر اختر بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے میٹنگ ختم

ہونے کے باوجود اٹھنے نہ دیا اور ہم ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھے رہے۔ ڈاؤن ٹاؤن میں ان کا دفتر بھی کئی ایک تاریخی مقامات کے قریب واقع ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں اور پھر پرتپاک رخصتی......ساتویں منزل سے نیچے اترنے میں چند ہی لمحے صرف ہوئے۔ کچھ ہی دیر میں ہم میسا چوسٹس ایونیو پہ تھے جو سیدھی امیریکن یونیورسٹی کو جاتی ہے۔ امیریکن یونیورسٹی......میری یادوں کا ایک اہم سنگم جہاں کم و بیش ڈیڑھ سال کا عرصہ گذرا تھا۔ ڈاکٹر اختر کے دفتر سے نکل کر یونیورسٹی پہنچنے میں کوئی ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ میرے لیے یہ یونیورسٹی بہت یادگار ہے۔ اسلامیہ پرائمری سکول کمالیہ سے جو سفر شروع ہوا اسکا اختتام یہیں پہنچ کر ہوتا ہے۔

4.15۔امیریکن یونیورسٹی

امیریکن یونیورسٹی کا آغاز 1892 میں ہوا۔ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی خواہش تھی کہ دارالحکومت میں ایک ایسی درس گاہ ہونی چاہئے جہاں ساری دنیا سے طالب علم پڑھنے کیلئے آئیں۔ ہر خواب جو دوسروں کیلئے دیکھا جائے پورا ہوتا ہے۔ آج یہ یونیورسٹی دنیا کی بہترین یونیورسٹیز میں شمار ہوتی ہے۔ دس ہزار کے لگ بھگ طلباء کا تعلق ایک سو پچاس ممالک سے ہے۔ امیریکن یونیورسٹی کو بہت زیادہ شہرت اس وقت ملی جب 1963 میں صدر جان ایف کینیڈی نے یہاں خطاب کیا۔ اس خطاب میں امریکی صدر نے دونوں عالمی طاقتوں یعنی امریکہ اور روس کی ذمہ داریوں کا احاطہ کیا۔ اس واقع کو نصف صدی بیت گئی۔ روس کی عظمت کا سورج تو غروب ہوا، امریکہ کا سورج ابھی نصف النہار پہ ہے۔ لیکن ہر عروج کا ایک زوال ہے۔ امریکہ کا آج کا طرزِ عمل کینیڈی کے ان الفاظ کی نفی کرتا ہے۔ گفتار اور کردار میں تضاد افراد کا ہی نہیں اقوام کا بھی المیہ ہے۔ میں 1993 سے لے کر 1995 تک اس یونیورسٹی میں رہا۔ اخوت بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن ہمایوں احسان بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتے رہے۔ میرا داخلہ سکول آف انٹرنیشنل سٹڈیز (SIS) میں تھا لیکن میں نے امریکی تاریخ کے کورس بھی لے رکھے تھے۔ تاریخ کے استاد کے لیے یہ بات بے حد حیران کن تھی کہ پاکستانی سول سروس کا ایک رکن امریکی تاریخ میں اس قدر گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ داخلے کیلئے انٹرویو ہوا تو اس نے بہت عجیب سے سوال پوچھے۔ ظاہر ہے جواب بھی اتنے ہی عجیب دیئے گئے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ اسکی کلاس میں میری دلچسپی کی ایک وجہ اپیرل بھی ہے۔ میں اپیرل کے ساتھ پڑھنا چاہتا ہوں۔ اس کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مجھے داخلہ مل گیا بلکہ ہم آپس میں

دوست بھی بن گئے۔ تاریخ کی وہ ساری کتابیں جو اس نے لکھیں مجھے تحفہ میں مل گئیں۔ امریکی تاریخ کو سمجھنے میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اگر قوموں کے عروج و زوال کو سمجھنا ہو تو ہمیں امریکہ کی تاریخ ضرور پڑھنی چاہیے۔ ایک اضطراب' ایک کشمکش۔ یہ روح کو گرما دینے والا تجربہ ہے۔ ناقابلِ یقین واقعات اور افسانوی کردار۔ نئی دنیا تک پہنچنے کا اس سے آسان راستہ شاید کوئی اور نہ ہو۔

امریکن یونیورسٹی میں میرا پہلا سال ہیوبرٹ ہمفری فیلوشپ کی جانب سے سپانسر تھا۔ انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ میرا خصوصی مضمون تھا۔ ترقی' غربت کا خاتمہ۔ ایک خوبصورت سماج۔ میں نے دنیا بھر میں ہونے والی ترقی کی کوششوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ گرامین بنک سے میرا پہلا تعارف بھی یہیں ہوا۔ آج یہاں پہنچ کر یوں لگا جیسے یہ سب کل کی بات ہے۔ وہی راستے' وہی در و دیوار' وہی ماحول۔ یونیورسٹی کی سب سے خوبصورت جگہ لائبریری تھی۔ اسی لائبریری میں یونیورسٹی کی سب سے خوبصورت لڑکی بیٹھتی تھی۔ وہ یہاں پڑھنے کیلئے آتی اور اسے دیکھنے کیلئے بہت سے لوگ بھی پڑھنے چلے آتے۔ اس کا نام اپریل April تھا۔ اپریل کے مہینے میں کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح نرم و نازک اور خوبصورت۔ اس وقت اس لائبریری میں دس لاکھ کے قریب کتابیں تھیں جن میں سے تین لاکھ کتابیں ہر وقت طالب علموں کے پاس رہتیں۔ میرے کانوں میں یونیورسٹی کا موٹو گونجنے لگا۔ "For God and Country"۔ وہ لمحہ جب سیکڑوں طالب علموں کے ساتھ' ڈگری لیتے ہوئے میں نے عہد کیا کہ میں بھی اپنے خدا اور اپنے ملک کیلئے جیوں گا۔ مجھے فخر ہے مجھے یہ عہد آج بھی یاد ہے۔ گریجوایشن کی اس تقریب میں فرخ' جنید اور فرازین کے علاوہ قدیر اور اس کی بیگم بھی میرے ساتھ تھے۔ میں لائبریری کے سامنے کچھ دیر کھڑا رہا۔ مصطفیٰ پراچندہ' ہائیما' سارا۔ اردن' ملائشیا' نیپال............ مجھے یوں لگا جیسے کچھ پرانے دوست بھی میرے ہمراہ ہیں۔ لائبریری کے ساتھ خالی جگہ جہاں سکول آف انٹرنیشنل سٹڈیز کی نئی عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ جارج واشنگٹن کا یہی خواب ہوگا۔ اسی عمارت میں ہمیں اکبر ایس احمد سے ملنا تھا۔ ہم عین وقت پر ان کے دفتر کے سامنے موجود تھے۔ دستک دینے پر سیکرٹری نے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ اکبر ایس احمد ہمارے منتظر ہیں۔

4.16۔ ایک حلقہ میں ہوں اسکا دوسرا حلقہ ہے تو

اکبر ایس احمد کا شمار پاکستان کے نامور افراد میں ہوتا ہے۔ سول سروس' برطانیہ میں ہائی کمشنر' پرنسٹن' ہارورڈ اور

کیمبرج میں استاد، امیریکن یونیورسٹی میں ابنِ خلدون چیئر۔ ملازمت کے ابتدائی ایام میں انہوں نے بہت سا وقت وزیرستان، اورک زئی اور خیبر ایجنسی میں گذارا اور پھر بلوچستان جہاں لوگ آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ اکبر ایس احمد شاعر بھی ہیں اور دانشور بھی۔ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف، شاعر، ڈرامہ نگار۔ حال ہی میں ان کی شاعری کی ایک کتاب ''درمیاں میں کہیں معلق'' امریکہ میں شائع ہوئی۔ لیکن میں اس کتاب سے زیادہ محظوظ نہ ہو سکا کہ شاعری پڑھنے کا مزا صرف اپنی زبان میں آتا ہے۔ اکبر ایس احمد ان دنوں انسانی حقوق کی جدوجہد میں بھی شریک ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا بھر کی ریاستیں اقلیتوں کے لئے زہرِ قاتل بن چکی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی گروہ قومی دھاروں میں شامل نہیں۔ وہ اپنی شناخت قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن انہیں بزور شمشیر تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے طور پر کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں تشدد اور تباہی جنم لے گی۔ انسانی یکجہتی، بنیادی حقوق، امن وامان اور سماجی انصاف۔ یہ بڑے بڑے تصورات ٹوٹ کے بکھر جائیں گے۔

انہوں نے اپنے کیریئر کا بڑا حصہ بلوچستان میں گذارا۔ نواب اکبر خان بگٹی، میر غوث بخش بزنجو، جام غلام قادر، میر جعفر خان جمالی اور بہت سے اور مقتدر بلوچ رہنماؤں کے ساتھ ان کی رفاقت رہی۔ کچھ عرصہ پہلے بلوچوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس پر انہیں گہرا صدمہ ہے۔ ان کے نزدیک نواب اکبر بگٹی کی موت نے بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک کو ہوا دی ہے۔ یہ فیصلہ سابق صدر پرویز مشرف کی رعونت تھی یا اس کے مٹھی بھر ساتھی واقعتاً یہ سمجھتے تھے کہ دور افتادہ پہاڑوں پہ بیٹھا ایک اسی سالہ بوڑھا اسلام آباد کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ اکبر ایس احمد محقق ہیں اور تاریخ سے آشنا بھی۔ کچھ لوگوں کے نزدیک وہ ایک بکھرے ہوئے، منتشر اور متنازعہ شخص ہیں۔ ان کی علمی اور فکری کاوشوں کو بھی بعض لوگ شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھے ان کی ہر بات میں پاکستان کی محبت دکھائی دی۔ اس محبت میں جذباتیت نہیں ایک گہرائی تھی۔ وہ ہر بات کی تاویل تاریخ سے ڈھونڈتے ہیں۔ بی بی سی (BBC) کے مطابق:

"Akbar S. Ahmad is world's leading authority on contemporary Islam"

لیکن یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ ان کی شاعری کی کتاب (Suspended Somewhere Between) کا بھی بہت شہرہ ہے۔ دیباچے کا مصنف Daniel Futterman کہتا ہے کہ کوئی

تم سے پوچھے کہ سمندر کتنا گہرا ہوتا ہے تو یہ کتاب اسے دینا اور کہنا ''ایسا''۔ سمندروں جیسی گہری اس کتاب کے مصنف نے اخوت کے تصور اور نظام کو سراہا اور پھر کتاب کے سرورق پہ ایک خوبصورت پیغام کے ساتھ کتاب ہمیں پیش کی۔

اس ملاقات کے دوران ان کے کچھ طالب علم بھی موجود تھے۔ ان کے کہنے پر ان کی ایک بھارتی شاگرد نے کتاب میں سے چند نظمیں پڑھ کے سنائیں۔ پاکستان سے محبت کی نظمیں۔ اتنی دیر میں اکبر ایس احمد کی بہو میلوڈی فوکس احمد بھی پہنچ گئیں جو جارج ٹاؤن یونیورسٹی سے منسلک ہیں اور مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے فروغ کے لیے کام کرتی ہیں۔ ان سے میری ملاقات ڈھاکہ کی ایک کانفرنس میں ہو چکی تھی۔ ہجرت' آنسو' امیدیں' دوریاں' ذاتی المیے اور اجتماعی دکھ۔ نظمیں ختم نہ ہوئیں ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ ہمارے میزبان نے بڑے انکسار سے الوداع کہا۔ میں ان کے کمرے سے نکلا تو مجھے سول سروس کے کچھ اور لوگ یاد آنے لگے۔ قدرت اللہ شہاب' مختار مسعود' شیخ منظور الٰہی' مصطفٰے زیدی' مسعود مفتی' اطہر طاہر' طارق محمود' ظفر محمود' اور یا مقبول جان، سید ابو احمد عاکف۔ یہ سب لوگ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ میں خود بھی روایت کی اس طویل زنجیر کا ایک حصہ ہوں۔ مجھے وہ خوبصورت شعر یاد آنے لگا:

ایک حلقہ میں ہوں اس کا دوسرا حلقہ ہے تو
دور تک پھیلا ہوا ہے سلسلہ زنجیر کا

4.17۔ سروری در دینِ ما خدمت گری ست

سکول آف انٹرنیشنل سٹڈیز کی خوبصورت عمارت سے نکل کر میں نے اکبر ایس احمد کی کتاب کھولی۔ جو پہلی نظم نظر آئی اس کا نام تھا ''کینسر''۔ یہ نظم بیوروکریسی کے بارے میں ہے۔ میری پہلی تربیت گاہ۔ جب میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے سول سروسز اکیڈیمی پہنچا تو شوق کا اور ہی عالم تھا۔ مجھے اس خوبصورت عمارت کی پیشانی پر ایک تحریر نظر آئی ''سروری در دینِ ما خدمت گری ست''۔ مجھے یہ تحریر بہت اچھی لگی۔ میں نے اس تحریر کو اسی وقت دل کے ایک گوشے میں رکھ لیا۔ 1985 میں سول سروسز اکیڈیمی کے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ شیخ منظور الٰہی کے پاس تھا۔ وہ بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی بنے۔ ان کی شہرت کی وجہ دردمندی سے لبریز مضامین کا ایک مجموعہ ''درِ دلکشا'' بھی ہے۔ ادبی ذوق کی وجہ سے مجھے ان کا خصوصی قرب حاصل رہا۔ اکیڈیمی کی تربیت کے دوران ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ قانون' حکمرانی' خدمت اور احتساب۔ ہمارے

سامنے بہت بڑے بڑے نام لئے گئے۔لیکن ان لوگوں سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔وقت بہت ستم پیشہ ہے۔مصلحت یا مفاد۔یہ لوگ کسی نہ کسی صلیب پہ لٹک گئے۔جو محفوظ رہے وہ کم تھے۔بہت ہی کم۔دنیا کہتی ہے کہ بیوروکریسی کسی قوم کا مقدر نہیں بدل سکتی لیکن پھر بھی ہمیں یہ امید تھی۔ شاید مستقبل میں اس راکھ سے کوئی چنگاری نکلے اور پھر کوئی الاؤ سا دہک جائے۔بچپن میں ایک کہاوت سنی تھی کہ ''ہر چہ رفت در کانِ نمک' نمک شد''۔جو کوئی نمک کی کان میں گیا وہ نمک ہو گیا۔بیوروکریسی کا رنگ بہت گہرا ہے۔اس میں داخل ہونے کے بعد رفتہ رفتہ ساری دیوانگی موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔وہ جو احسان دانش نے کہا:

کل دھوپ کے میلے سے خریدے تھے کھلونے
جو موم کا پتلا تھا وہ گھر تک نہیں پہنچا

لوگ اکثر یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آپ اس کوچہ سے کیوں چلے آئے اور میں جواباً مختار مسعود کی ایک خوبصورت تحریر کی آڑ میں پناہ لیتا ہوں..........''وہ مقام جہاں خواہشِ قلبی اور فرضِ منصبی کی حدیں مل جائیں خوش بختی کہلاتا ہے۔''اخوت کی بنیاد رکھنے کے بعد یوں لگا کہ یہ تو خواہشِ قلبی ہے' اسی کو فرضِ منصبی بھی ہونا چاہیے۔فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔اکبر ایس احمد کی کتاب ''درمیاں میں کہیں معلق'' میرے ہاتھ میں ہے۔یونیورسٹی کی وسیع وعریض پارکنگ اور' کینسر کے نام سے ایک دلگداز نظم:

I ask why
why has the poetry in me
dried up?
perhaps
my blood is turning to water
a bureaucrat's job is not easy
it coarsens the soul
blunts the mind
kills the heart
and here
dirt, ignorance, disease
and also poverty
surround me like the

quicksands of a forecast doom-
the slow death
of cancer.

یہ نظم بھی ایسے ہی لمحوں کی کہانی ہے جو رائیگاں چلے گئے۔زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔اسے رائیگاں نہیں جانا چاہیے۔افسر شاہی کے زنداں میں آئیڈیل ازم کا چراغ مدھم ہونے لگتا ہے۔

4.18۔خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر بھی میں یونیورسٹی میں ہی رہا۔چار سو پھیلی ہوئی پرانی یادیں۔مجھے یاد آیا کہ اس یونیورسٹی کو امریکہ کے ایک صدر کے کہنے پہ بنایا گیا تھا۔پھر یہ بھی یاد آیا کہ اس یونیورسٹی سے بہت دور ایک ملک ہے' پاکستان۔پاکستان کے ایک دور افتادہ شہر میں ایک چھوٹا سا پرائمری سکول ہے۔اس پرائمری سکول کو کسی صدر نے نہیں بلکہ چند دردمند افراد نے سو سو روپے چندہ جمع کر کے بنایا۔انکے شہر میں تعلیمی ادارے بہت کم تھے۔بچے گلی کوچوں کی خاک چھانتے۔ان لوگوں نے انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔چندہ جمع کیا اور شہر کے گنجان آباد علاقے میں دو گھر کرائے پہ لے لیے۔یوں اپنی مدد آپ کے تحت ایک سکول وجود میں آ گیا جس کا نام اسلامیہ پرائمری سکول کمالیہ رکھا گیا۔سکول کی بنیادیں درد کی دولت پہ تعمیر ہوئیں۔قبولیت کا اعزاز کیوں نہ ملتا۔کچھ ہی عرصہ میں یہ ضلع بھر کا بہترین سکول بن گیا۔شہر کے بچوں میں مقابلے کا امتحان ہوتا۔جو بہترین ہوتے وہ اس سکول کیلئے منتخب ہو جاتے۔جو باقی بچتے وہ حکومت کے سکولوں میں چلے جاتے۔خستہ حال فرش' ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں' ڈھیلی چولوں والے دروازے' رِستی ہوئی چھتیں' پٹ سن کے پھٹے ہوئے ٹاٹ' استادوں کے لیے مختلف ڈیزائین کی کرسیاں۔پانی پینے کے لیے ہینڈ پمپ جسکی ہتھی اکثر غائب رہتی۔بچے ہی استاد کی کرسی اٹھاتے اور بچے ہی کمروں کی صفائی کرتے۔نہ کھیل کا میدان' نہ لائبریری' نہ ٹائلٹ' نہ تختہ سیاہ۔بجلی تو پورے شہر میں ہی نہ تھی۔پانچ استاد جن میں سے اکثر غیر تربیت یافتہ۔استاد غلام محمد' ضمیر حسین' مسکین کمالوی' عبادت علی اور نظامی صاحب۔تین استاد بہترین کردار کے حامل اور فرشتہ صفت جبکہ بقیہ دو محنت سے بھی جی چراتے اور کبھی کبھار گالیاں بھی دیتے۔ایک بار ایک بچے کا کمرہ جماعت میں پیشاب خطا ہو گیا۔استاد سے بہت مار پڑی۔مار کے بعد پوچھا کہ ایسا کیوں کیا تو اس کا کہنا تھا کہ وہ کب تک خود پہ جبر کرتا۔استاد نے بڑی سختی سے کہا ''سکول کے باہر گلی میں جو نالی ہے وہ کس لیے

ہے۔''اس کے باوجود اسلامیہ پرائمری سکول اس قصبے کا بہترین سکول تھا۔ یہاں سے پڑھ کے بچے کسی بھی ہائی سکول میں جا سکتے تھے۔ امیریکن یونیورسٹی میں موجود سہولتیں اور آسائشیں دیکھنے کے بعد مجھے ہزاروں میل دور، یہ سکول کیوں یاد آیا۔ شاید اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی کے دو سال اس سکول میں گذارے تھے۔ پُر پیچ گلیوں میں واقعہ شکستہ در و دیوار۔ یہاں سے نکل کر گورنمنٹ کالج، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، سول سروسز اکیڈیمی، اور امیریکن یونیورسٹی تک کا سفر............امریکہ میں جب بھی یہ سکول یاد آتا دل تشکر سے بھر جاتا اور سر عجز و نیاز سے جھکنے لگتا۔ پھر، کبھی کبھار اسلامیہ سکول کمالیہ میں گذرے ان دو برسوں سے پہلے کے دو برس بھی یاد آتے جب ایک فرشتہ صفت انسان میرے استاد تھے۔ ان کا نام خواجہ عبدالستار تھا۔ خواجہ صاحب مجھے گھر آ کے پڑھاتے تھے۔ انہوں نے ابتدا حروف تہجی اور خوش خطی سے کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جن کا خط اچھا ہوتا ہے ان کی سوچ اور عمل بھی اچھا ہوتا ہے۔ جو پہلا شعر انہوں نے مجھے یاد کروایا وہ یہ تھا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

ایک مدت تک اس شعر کے معنی بھی سمجھ میں نہ آئے اور نہ ہی یہ علم ہوا کہ یہ شعر مجھے کیوں یاد کروایا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کم گو تھے۔ اکثر اوقات خاموش ہو کر کہیں گم ہو جاتے۔ انہیں شاید علم تھا کہ یہ شعر یاد کرنا کیوں ضروری ہے۔ میں ہر روز تین بار یہ شعر لکڑی کی تختی پہ لکھتا اور اتنی ہی بار بآوازِ بلند انہیں سناتا۔ نجانے میں یہ عمل کتنا عرصہ دہراتا رہا۔ ایک سال یا پورے دو سال۔ یہاں تک کہ یہ الفاظ میرے شعور اور لاشعور میں اتر کر خون کی ہر بوند میں سرایت کر گئے۔ مجھے یقین ہے کہ مواخات کے پیغام سے میری محبت اسی شعر کی دین ہے......سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!

4.19۔ جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں

امریکی تاریخ بہت عجب کہانی ہے۔ ایسی کہانی دنیا کی سٹیج پر اس سے پہلے پیش نہیں ہوئی۔ ایک دلنشیں ڈرامہ۔ عزم و ہمت، شجاعت، حسن تدبر۔ کولمبس اور پھر جارج واشنگٹن اور اس کے ساتھیوں سے لے کر ابراہام لنکن اور مارٹن لوتھر کنگ تک۔ نیشنل مال کے جھروکوں میں بڑے بڑے نام آویزاں ہیں لیکن یہ سب فانی انسان ہیں۔

بہت سی خوبیوں کا مرقع، بہت سی خامیوں کے حامل۔ بعض لوگوں کی زندگی میں عظمت کا صرف ایک لمحہ آتا ہے اور باقی زندگی وہ اسی لمحے کی کمائی کھاتے ہیں۔ چرچل نے بھی کوئی ایسی ہی بات کہی تھی It is the brightest hours that fade away the fastest یہ سب ایسے ہی لوگ ہیں۔ ان میں کوئی زندگی ایسی نہیں جس کا ہر لمحہ عظمت کا لمحہ ہو۔ جس کی خاکِ پا کسی کی آنکھ کا سرمہ بن سکے۔ قیادت کا اصل جوہر کچھ اور ہے۔ اس جوہر کو سمجھنا ہے تو کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنا پڑے گا جس کی زندگی کے کسی لمحہ پر بھی تاریکی کا سایہ نہ تھا۔ امیریکن یونیورسٹی، خواجہ عبدالستار، سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف............تاریخ کے ورق کھلتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ اور پھر اس شخص کا تصور ابھرتا ہے جس نے پوری دنیا کے لئے امید کی شمع روشن کر دی۔ اس شخص کا نام محمدؐ بن عبداللہ ہے۔ مائیکل ہارٹ دنیا کے سو عظیم انسانوں کی فہرست بناتا ہے تو محمدؐ بن عبداللہ کو سرِ فہرست کیوں رکھتا ہے۔ چودہ سو سال گذرنے کے باوجود ایک شخص اتنا ہی Relevant کیوں ہے۔ کیا اس لیے کہ وہ ایک مذہبی رہنما تھا یا اس لیے کہ وہ فکر وعمل کی بہترین خوبیوں کا حامل تھا۔ عادل، صادق اور امین۔

سیف الرحمٰن مبارکپوری کہتے ہیں کہ محمدؐ ایک جاہل، اجڈ اور منہ زور معاشرہ میں پیدا ہوئے لیکن اس کے باوجود مہذب اور باسلیقہ تھے۔ گواہی تو وہی ہوتی ہے جو دشمن دیتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے ان سے کہا: ''ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے البتہ آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں بس اسے جھٹلاتے ہیں۔'' اس پر اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی ''یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں''۔ وہ تکبر سے دور تھے۔ وہ مسکینوں کی عیادت کرتے، فقراَ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، غلام کی دعوت منظور فرماتے اور لوگوں میں کسی امتیاز کے بغیر ایک عام آدمی کی طرح تشریف رکھتے۔ اپنے جوتے خود ٹانکتے تھے، اپنے کپڑے خود سیتے تھے اور اپنے ہاتھ سے اس طرح کام کرتے جیسے کوئی عام آدمی اپنے گھر کے کام کاج کرتا ہے۔ اپنی بکری خود دوہتے تھے۔ عہد کی پابندی اور صلہ رحمی فرماتے تھے، لوگوں کے ساتھ شفقت اور رحم ومروت سے پیش آتے تھے۔ ان کا اخلاق سب سے زیادہ کشادہ تھا۔ نہ چیختے چلاتے۔ نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے۔ معافی اور درگذر سے کام لیتے تھے۔ کبھی اپنے خادم کو اُف نہیں کہا۔ نہ اس پر کسی کام کے نہ کرنے پر عتاب فرمایا۔ مسکینوں سے محبت کرتے، ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کسی فقیر کو اس کی مفلسی کی وجہ سے حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ بلاضرورت نہ

بولتے تھے۔ نرم خو تھے۔ نعمت معمولی بھی ہوتی تو اس کی تعظیم کرتے تھے۔ کسی چیز کی مذمت نہیں فرماتے تھے۔ کھانے کی نہ برائی کرتے نہ تعریف۔ اپنے نفس کے لئے نہ غضبناک ہوتے نہ انتقام لیتے۔ لایعنی بات سے زبان روکے رکھتے۔ ساتھیوں کو جوڑتے تھے' توڑتے نہ تھے۔ ہر قوم کے معزز آدمی کی تکریم فرماتے تھے۔ دشمنوں' دوستوں اور اصحاب کی خبر گیری کرتے۔ معتدل تھے' افراط و تفریط سے دور رہتے۔ غافل نہ ہوتے تھے مبادا لوگ بھی غافل یا ملول خاطر ہو جائیں۔ ہر حالت کے لئے مستعد رہتے تھے۔ حق گوئی سے کوتاہی نہ فرماتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر ضرور فرماتے۔ اپنے لئے کوئی امتیازی جگہ مقرر نہ فرماتے۔ مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ حاجت مند کو نوازتے تھے اور اجنبی کو انس عطا کرتے تھے۔ آپ انتہا کے حیادار تھے۔ اپنی نظریں کسی کے چہرے پہ گاڑتے نہ تھے۔ آپ کے چہرے پر ہمیشہ بشاشت رہتی۔ سہل خو اور نرم پہلو تھے۔ جفا جو اور سخت خو نہ تھے۔ نہ زیادہ عتاب فرماتے تھے نہ بہت تعریف کرتے تھے۔ آپ نے تین باتوں سے اپنے نفس کو محفوظ رکھا۔ ریا سے' کسی چیز کی کثرت سے اور لایعنی بات سے۔ آپ نے تین باتوں سے لوگوں کو محفوظ رکھا۔ آپ کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے' کسی کو عار نہیں دلاتے تھے اور کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے۔ بہت زیادہ خاموش رہتے۔ جو شخص نامناسب بات کہتا اس سے رخ پھیر لیتے۔ بردباری' قوتِ برداشت' قدرت پا کر درگذر' مشکلات پر صبر اور اللہ کی یاد۔ رب العزت نے خود آپ کی تعریف میں فرمایا ''یقیناً آپ عظیم اخلاق پر ہیں''۔

کردار کی یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ جارج واشنگٹن سے پہلے اور بعد۔ کوئی ایسا شخص نہیں جس میں اس سے نصف خوبیاں ہی ہوں۔ ایشیا' افریقہ' یورپ...... دنیا بھر میں کہیں بھی۔ کوئی ایسی ہستی جو ایک جاہل' اجڈ اور منہ زور قوم کی سختی کو نرمی میں تبدیل کر دے۔ جو تنگ نظری' تعصب اور جہالت کی جگہ اتفاق' اتحاد اور نظم و ضبط جیسی خوبیوں کو فروغ دے دے۔ جو کمزور کو طاقت اور غریب کو بے نیازی دے دے۔ جو عدل اور انصاف کا علم بلند کر دے اور مساوات کو سکہ رائج الوقت بنا دے۔ جو آدمیت کو انسانیت کا شرف بخش دے۔

اس عظیم ہستی کو دنیا سے رخصت ہوئے سیکڑوں برس بیت گئے لیکن تاریخ کی ساری کتابیں مل کر بھی لیڈر شپ کا ایسا نمونہ پیش نہ کر سکیں۔ نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد۔ بڑے لوگوں کی زندگی کا ایک ایک پہلو دیکھا جاتا ہے۔ اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' ملنا جلنا۔ جنگ اور امن' محبت اور نفرت' گھر اور بازار۔ رچرڈ نکسن نے اپنی کتاب میں ایک سو سے زائد لیڈرز کا تذکرہ کیا اور ان کی چھوٹی بڑی ایک ہزار سے زیادہ خوبیاں گنوائیں۔ ان میں کوئی خوبی ایسی

4.20۔ہم سخن فہم ہیں

کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب عقیدت کا شاخسانہ ہے۔آیئے تاریخ کا ایک اور ورق پلٹتے ہیں۔الفانسوڈی لامرٹین Alphonse de LaMartaine نامی ایک فرانسیسی مورخ کی رائے سنتے ہیں:

Never has a man accomplished such a huge and lasting revolution in the world…**If greatness of purpose, smallness of means, and astounding results are the true criteria of human genius, who would dare to compare any great man in modern history with Muhammad (PBUH)**.

The most famous men created: arms, laws, and empires only. They founded, if anything at all, no more than material powers which often crumbled away before their eyes. This man moved not only armies, legislations, empires, peoples and dynasties, but millions of men in one-third of the inhabited world, and more than that, he moved the altars, the gods, the religions, the ideas, the beliefs, and the souls. On the basis of a Book, every letter of which has become law, he created a spiritual nationality, which blended together peoples of every tongue and of every race. He has left us – as the indelible characteristic of this Muslim nationality – the hatred of false gods and the passion for the One and Immaterial God…The conquest of one-third of the earth to his dogma was his miracle; rather it was not the miracle of a man but that of reason. His life, his meditations, his heroic revilings against the superstitions of his country, and his boldness in defying the furies of idolatry, his firmness in enduring them for thirteen years at Makkah, his acceptance of the role of public scorn and almost of being a victim of his fellow countrymen: all these and finally, his migration, his incessant preaching, his wars against odds, his faith in his success and his super human security in misfortune, his forbearance in victory, his ambition,

which was entirely devoted to one idea and in no manner striving for an empire, his endless prayers, his mystic conversations with God, his death and his triumph after death – all these…(served) to affirm conviction which gave him power to restore a creed…**Philosopher, orator, apostle, legislator, warrior, conqueror of ideas, restorer of rational dogmas, of a cult without images; the founder of twenty terrestrial empires and of one spiritual empire, that is Muhammad. As regards all standards by which human greatness may be measured, we may ask, is there any greatest man than he?**

غربت' افلاس اورمحرومی...... یہ سب قابل علاج ہیں لیکن ان کا حل سمتھ سونین پہ نہیں اس زندگی میں ہے جومحبت اورسخاوت کا سرچشمہ اورفقروغنا کا پیکرتھی۔

4.21۔دعا

امیریکن یونیورسٹی کے بعد ہم سیدھے قدیر کے گھر پہنچے۔ وسکونسن ایونیو' بتھیسڈا اور راک ویل۔ یہ سارا راستہ بہت مانوس سا تھا۔کوئی بہت زیادہ تبدیلی نظر نہ آئی۔ کچھ عمارتیں نئی بن گئیں کچھ اور بلند ہو گئیں۔ چوہدری اللہ بخش ابھی تک ہمراہ تھے اور ابھی شام کے چار بجے تھے۔ رات کے کھانے اور پریزینٹیشن کا وقت آٹھ بجے تھا۔صبح سے لے کر اب تک کا وقت بہت اچھے لوگوں میں گذرا۔ ڈاکٹر محمد اختر' امیریکن یونیورسٹی اور اکبر ایس احمد۔ واپسی کے بعد کچھ دیر انہی لوگوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ہمیں شام کی تقریب کی فکرتھی جہاں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ مہمان مدعو تھے۔ پاکستان کے علاوہ کئی ایک بھارتی باشندوں کو بھی بلایا گیا تھا۔نماز کے بعد تقریب کی کامیابی کیلئے ہاتھ اٹھنے لگے۔مشکل کے وقت دعا ہی انسان کا سب سے بڑا سہارا بنتی ہے۔ دعا بھی ایک انعام ہے۔ یہ انعام بھی نصیب سے ملتا ہے۔ دعاؤں میں ایک بہترین دعا سورہ فاتحہ ہے۔ پہلے تعریف وثنا پھر اقرار واعتراف پھر دعا ومناجات۔ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ سورہ پڑھنے کا جومزہ ایک بار مراکش میں آیا وہ انوکھا تھا۔کہاں واشنگٹن کہاں مراکش۔خیالات کہیں اور پہنچ گئے۔وہ بھی اخوت کا ہی ایک سفر تھا جب مجھے مراکش جانے کا موقعہ ملا۔سول سروس سے استعفیٰ کے بعد میں کچھ عرصہ کے لیے LUMS سے منسلک تھا۔ایک روز ہمارے مہربان داؤد غزنوی نے مراکش میں ایک کانفرنس کا دعوت نامہ دیا۔ یہ 2005 کی بات ہے۔کسی بھی بین الاقوامی فورم میں اخوت

کی یہ پہلی شرکت تھی۔ مراکش کا میرا سفر اصل میں رباط تک محدود تھا۔ مائیکروفنانس کی کانفرنس میں اخوت کی نمائندگی' بین الاقوامی مندوبین سے ملاقات۔ لیکن فیض (Feiz) نامی ایک اور شہر کی محبت بھی دل میں بسی ہوئی تھی۔ جونہی کانفرنس ختم ہوئی میں نے فیض کی راہ اختیار کی۔

سرسبز پہاڑوں کے پس منظر میں تعمیر یہ شہر نویں صدی عیسوی میں آباد ہوا۔ اسے صوفیوں اور علماء کا شہر بھی کہتے ہیں۔ ابنِ خلدون نے اس شہر میں کئی سال قیام کیا۔ ابنِ بطوطہ جب تھک گیا تو اس نے زندگی کے آخری ایام یہیں گذارے۔ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ یہاں کئی سال قیام پذیر رہے۔ ان کا مسکن ابھی تک مرجعٔ خلائق ہے۔ ان کے اس مسکن کو مقامی زبان میں زاویہ کہتے ہیں۔ ابنِ خلدون' ابنِ بطوطہ اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ۔ علم و جستجو' سیر و سیاحت اور تصوف و تقویٰ۔ فیض تک چار گھنٹے کا طویل مگر خوشگوار سفر۔ ہر طرف عربی اور فرانسیسی زبانوں کا شور۔ انگلش سمجھنے والے بہت کم تھے۔ کچھ اشاروں سے' کچھ لکھ کر اور کچھ پوچھ پوچھ کے ایک گائیڈ ڈھونڈا۔ ''مولائے عبدالقادر جیلانیؒ''۔ ''زاویہ''۔ اَن گنت گلیاں' تاریک' گنجان' پیچیدہ۔ سرخ تر کی ٹوپیاں پہنے مرد اور حجاب میں لپٹی دوشیزائیں۔ کھنکتے ہوئے قہقہے' مہندی میں رنگے ہاتھ۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہم ایک نیم روشن مگر دیدہ زیب جگہ جا پہنچے۔ چھوٹی سی مسجد' منقش ٹائلیں' مسجد کی پائنتی میں ایک چبوترہ اور صحن۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں عبدالقادر جیلانیؒ نے فیض میں قیام کیا۔ اس چبوترے پر بیٹھ کر وہ درس دیتے تو لوگوں کا ہجوم ان کے گرد جمع ہو جاتا۔ زاویے میں اس وقت چند مرد اور عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک خدمتگار تھا۔ مسلم؟ مسلم؟ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا میں مسلمان ہوں۔ میں نے بتایا ہاں میں مسلمان ہوں۔ وہ اٹھا اور اٹھ کر اندر سے قرآن پاک لے آیا۔ بوسہ دیا۔ کھولا اور کہنے لگا پڑھو۔ میں نے قرآن کو بوسہ دیا اور پڑھنے لگا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں مسلمان ہوں تو اس نے مجھے گلے سے لگایا اور وہاں موجود لوگوں کو آواز دے کر بلانے لگا۔

ہم پانچ لوگ ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان ایک خاتون بھی تھی۔ عمر رسیدہ' اور حجاب میں ملبوس۔ ان میں سے ایک شخص نے سورہ فاتحہ کی تلاوت شروع کی۔ سوز' گداز' لحن داؤدی۔ ''تمام تر تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ پروردگار' مہربان' رحم والا' قیامت کے دن کا مالک۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا......''۔ تلاوت ختم ہوئی تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھے۔ دعا

ختم ہوئی۔قرآن کو جز دان میں لپیٹا جا چکا تھا۔میں اٹھا اور مصافحے کے لئے بڑھا۔سب نے باری باری گلے سے لگایا۔عمر رسیدہ خاتون نے سر پہ ہاتھ رکھا۔جونہی میں مسجد سے باہر نکلا تو وہی خدمتگار جو میری آمد پر جز بز ہو رہا تھا میرے جوتے ہاتھوں میں اٹھائے کھڑا تھا۔میں نے شکریہ ادا کیا' مسجد کے نقش و نگار پہ نگاہ ڈالی اور ہم پھر سے فیض کی بھیڑ میں گُم ہو گئے۔پر پیچ گلیاں' تہہ در تہہ اسرار۔زاویہ پیچھے رہ گیا لیکن سورۂ فاتحہ کی بازگشت بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔......''اے ہمارے پروردگار۔ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا اور جو گمراہ ہونے سے بچ گئے۔'' سورہ فاتحہ۔میری دعا' میرا سہارا۔میں نے اس دعا کو پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے آج کی تقریب بھی اخوت کی یادگار تقریبوں میں شمار ہوگی۔دعا امید بھی ہے اور بھروسہ بھی۔یہ دل کے افق پہ یقین کے چراغ روشن کر دیتی ہے۔ہم تیار ہو کے باہر نکلے اور یونیورسٹی آف میری لینڈ کی طرف روانہ ہونے لگے۔

4.22۔یونیورسٹی آف میری لینڈ

جب ہم یونیورسٹی کے ہال میں داخل ہوئے تو بہت سے مہمان پہنچ چکے تھے۔ولید اور ثمن قدیر انتظامات میں مصروف تھے۔ان کی مدد کیلئے ریحان بھی پہنچ چکا تھا۔ریحان محمود اخوت کا قابلِ اعتماد ساتھی ہے۔وہ گذشتہ پانچ سال سے اخوت کے ساتھ ہے۔جونہی وہ یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب سے فارغ ہوا اس نے اخوت میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔اسے اخوت کی راہ حسین حیدر نے دکھائی۔ریحان ایک شرمیلا سا نوجوان تھا۔پہلی ملاقات میں کوئی بھی یہ اندازہ نہ کر سکا کہ وہ اخوت کیلئے اتنا بڑا اثاثہ ثابت ہوگا۔اسے عملی زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن کچھ عرصہ میں اس نے ہم سب کے دلوں میں گھر کر لیا۔محنت' دیانت' سچائی اور لگن۔اس میں اخوت کی تمام بنیادی اقدار موجود تھیں۔اخوت کی رفاقت نے اس کی صلاحیتوں کو اور نکھار دیا۔جب اس کی ملازمت کے پانچ سال مکمل ہوئے تو اس نے مزید تعلیم کا فیصلہ کیا اور نیویارک کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ابھی وہ دو سال کی چھٹی پر ہے۔مجھے یقین ہے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ واپس پلٹے گا اور ایک بار پھر خود کو اس خواب کی تکمیل کے لیے وقف کر دے گا۔امریکہ کے اس وزٹ میں ریحان سے میری ملاقات نیویارک میں ہونا تھی۔لیکن جب اسے اس ڈنر کی خبر ہوئی تو وہ پیچھے نہ رہ سکا اور انتظامات میں مدد کیلئے فوراً واشنگٹن چلا آیا۔اسے دیکھ کر مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا۔اسی دوران مہمان آتے رہے اور

ہال بھرتا رہا۔ ہمارے لیے یہ سب لوگ اجنبی تھے لیکن اخوت کا تصور ان لوگوں کے لیے اجنبی نہ تھا۔ جونہی وہ ہاتھ ملاتے اپنائیت کی ایک لہر سی دل میں دوڑنے لگتی۔ آٹھ بجے تک پورا ہال بھر چکا تھا۔ ڈیڑھ سو سے زائد لوگ۔ ثمن نے میرے، قدیر اور امتیاز کی جانب دیکھا اور اسٹیج کی طرف بڑھی۔ چند افتتاحی کلمات اور پھر قرآن پاک کی تلاوت۔ اورتم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ ترجمہ ختم ہوا۔ طفیل بھائی نے آکر تقریب کی غرض و غایت بتائی اور پھر مجھے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے وہ کون سی بات کہنی ہے جو سیدھی دل میں اتر جائے۔ طفیل بھائی نے ایک ایسا ماحول بنا دیا جو کسی امتحان سے کم نہ تھا۔

سٹیج پر آنے کے بعد سب سے پہلے میں نے میز بانوں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اتنے ڈھیر سارے لوگ یونہی اکٹھے نہیں ہوتے۔ ''ہم سب تبدیلی کے خواہاں ہیں''۔ میں نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایسی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس میں غربت کیلئے کوئی جگہ نہ ہو۔ جہاں انصاف کے عالمگیر اصولوں کی پیروی کی جائے۔ اس منزل کے بہت سے راستے ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ مائیکروفنانس بھی ہے۔ اخوت کی کہانی مائیکروفنانس کے اسی تصور سے وابستہ ہے......اخوت نے ثابت کیا ہے کہ مؤاخات ایک زندہ فلسفہ کا نام ہے۔ لوگ دوسروں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ بغیر سود کے قرضے دینا عین ممکن ہے۔ ترقی دولت کے ارتکاز میں نہیں۔ غریب قابلِ اعتماد ہے۔ مسجد یا چرچ کو سماجی سرگرمیوں کا محور بنایا جا سکتا ہے۔ لوگ رضا کاریت کے جذبہ سے سرشار ہیں اور کامیابی صرف مالی مراعات کی مرہونِ منت نہیں۔ یہ سارے کام اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن اخوت کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غریبوں کو یہ اعتماد دیا کہ وہ غربت کے خلاف جدوجہد میں اکیلے نہیں۔ کچھ لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ غربت دولت سے محرومی کا نام نہیں۔ غربت اکیلے رہ جانے کا نام ہے۔ انسان اس وقت غریب ہوتا ہے جب اس کا کوئی دوست نہ ہو...... یہ دنیا سماجی اور معاشی ناانصافی کا مرکز بن چکی ہے۔ ایک شخص کے پاس پچاس بلین ڈالر ہیں اور ایک شخص کے پاس ایک ڈالر بھی نہیں......کوئی اچھا معاشرہ ایسی اونچ نیچ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ہم ایسی دنیا پہ یقین نہیں رکھتے جہاں کسی بچے کو سکول کا راستہ ہی نہ ملے۔ جہاں اس کے والدین دوائی کے لیے ترستے رہیں۔ جہاں ان پر انصاف کا ہر دروازہ بند ہو جائے۔ جہاں لوگوں کے پاس کوئی امید بھی باقی نہ رہے۔ اخوت کا دوسرا اعزاز یہ ہے کہ اس ادارے نے لینے والوں کو دینے والا بنایا ہے۔ قرضوں کی سو فیصد

واپسی بھی اور ان کی طرف سے عطیات کی ادائیگی بھی۔ ہم نے یہ خواب دانشِ فرنگ سے مستعار نہیں لیے۔ ہم نے یہ خواب اپنی روایات کے سائے میں بیٹھ کے دیکھے ہیں۔ ہم اگلے زمانوں کی باتیں محمد مصطفیٰؐ کے نقوشِ قدم میں ڈھونڈتے ہیں''۔

بیس منٹ کی گفتگو۔ اخوت کی مکمل کہانی۔ سوال و جواب۔ حیرت' مسرت اور اطمینان۔ میری لینڈ یونیورسٹی کے اس ہال میں ایسی تقاریب بہت کم ہوئی تھیں۔ طفیل بھائی' قدیر' امتیاز' ثمن' ولید اور ریحان۔ ہم دیر تک لوگوں کی دلچسپی اور محویت پہ بات کرتے رہے۔ یہ خواب اب ہمارا نہیں ان کا بھی تھا۔ ہال خالی ہونے لگا۔ ''اگر لوگ فیصلہ کر لیں کہ انہیں مواخات کے اصول کے تحت زندگی گذارنا ہے تو کیا انہیں کوئی روک سکتا ہے''۔ رخصت ہونے والا آخری شخص بھارتی نژاد نصیر الدین تھا۔ اس نے یہ بات کہی اور بہت گرمجوشی سے الوداعی مصافحہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی تھی۔ ''میرے اس سوال پہ غور کیجئے گا۔ یہ سوال آپ سے زیادہ آپ کے اہلِ وطن کیلئے ہے!''۔ سید نصیر الدین نے زور دے کر یہ کہا اور میرے ہاتھ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ میں دیر تک ان الفاظ میں کھویا رہا...... ''اگر لوگ فیصلہ کر لیں کہ انہیں مواخات کے اصول کے تحت زندگی گذارنا ہے تو کیا انہیں کوئی روک سکتا ہے۔'' نصیر الدین کے الفاظ کی گونج بڑھنے لگی۔

4.23۔ میرے اس سوال پہ غور کیجئے گا

مجھے لگتا ہے میرا ہاتھ آج بھی نصیر الدین کی گرفت میں ہے۔ اس وقت اس کا سوال مجھے ماضی میں لے گیا۔

اٹھارہ سال پہلے' جب امریکن یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر نے مجھے اور اپیرل کو ایک مقالہ لکھنے کو کہا۔ اس مقصد کے لئے مجھے' واشنگٹن سے کئی سو کلومیٹر دور پنسلوینیا جانا تھا۔ میں پنسلوینیا کی کاؤنٹی لنکاسٹر پہنچا تو وہاں زندگی کا ایک اور رخ میرا منتظر تھا۔

پرسکون' خاموش۔ لنکاسٹر کاؤنٹی میں رہنے والے لوگوں کو آمش کہتے ہیں۔ دورِ حاضر کی سہولتوں سے دور' بے حد خوبصورت لوگ۔ ان کی زندگی میں جدید ٹیکنالوجی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہاں آٹھویں جماعت سے زیادہ تعلیم پر پابندی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے ان

کے حصول کیلئے آٹھ سال ہی کافی ہیں۔امریکہ کی مختلف ریاستوں میں بکھرے ہوئے یہ لوگ شہروں سے دور' دیہات میں رہتے ہیں۔ان کی کل تعداد اڑھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔صرف لنکا سٹر کاؤنٹی میں ان کی آبادی پچاس ہزار سے زائد ہے۔یہ ایک مشہور عیسائی فرقہ Mannonites کا حصہ ہیں۔بگھی پہ سفر کرتے ہیں۔محنت اور مشقت کو اپناتے ہیں۔اسقاطِ حمل ان کے نزدیک گناہ ہے اور بڑا خاندان خدا کی رحمت کا وسیلہ۔ان کی زندگی میں ایثار' قربانی اور انکسار کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ میں نے ان کے ساتھ تین دن گذارے۔ان تین دنوں کی مسرت اور بوباس اب تک میرے ساتھ ہے۔نیم پختہ گھر......بجلی اور فون کے بغیر۔چھوٹا سا کمرہ' سادہ سی مسہری۔ایک طرف جانوروں کا احاطہ......تازہ دودھ' مکھن اور شہد۔سر کو سکارف سے ڈھانپے ہوئے خواتین......سادگی اور وقار کی تصویر۔گھر کا سارا کام بھی خود اور کھیتی باڑی بھی خود۔نہ کوئی ملازم' نہ مددگار۔انداز میں شائستگی اور گفتگو میں تحمل۔ان کی ساری زندگی چرچ کے گرد گھومتی ہے۔وہ انشورنس کروانا برا سمجھتے ہیں۔فوج میں بھرتی ہونا بھی ان کے نزدیک اچھا نہیں۔نہ وہ عدالت میں جاتے ہیں۔نہ پولیس اسٹیشن کا رخ کرتے ہیں......سکول میں ان کا نصاب بھی اپنا ہے۔یہ سب کچھ امریکہ نہیں۔پھر بھی وہ امریکہ کے شہری ہیں۔''ہمارے بزرگ مذہبی اختلافات کی وجہ سے یورپ سے نکلے۔ہم بہتے ہوئے دھارے کا حصہ نہیں۔ہم اپنی مرضی سے جینا چاہتے ہیں۔ہماری بگھی شہر میں جا نکلے تو لوگ حیران ہوتے ہیں۔کچھ لوگ محبت سے ہاتھ ہلاتے ہیں' کچھ پتھر پھینکنے لگتے ہیں۔شاید انہیں ہماری زندگی پسند نہیں۔لیکن ہمیں یہی رنگ اچھا لگتا ہے۔قدامت اور روایت میں بھی تو حسن ہے''۔میرے آمش میزبان نے بڑے فخر سے یہ باتیں کہیں۔

''اگر کوئی شخص یا قوم یہ فیصلہ کر لے کہ اسے کیسی زندگی گذارنی ہے تو انہیں کون روک سکتا ہے''۔لنکا سٹر کے درودیوار پہ لکھی ہوئی یہ تحریر میں کبھی نہیں بھولا۔جب بھی میں روایت سے دور ہوتا ہوں مجھے لنکا سٹر کاؤنٹی کے آمش لوگ یاد آنے لگتے ہیں۔بہتے ہوئے دھارے سے الگ۔اب ان کی یاد میں نصیرالدین کا سوال بھی شامل ہو چکا ہے......''اگر لوگ فیصلہ کر لیں کہ انہیں مواخات کے تحت زندگی گذارنا ہے تو کیا انہیں کوئی روک سکتا ہے۔'' مجھے لگتا ہے نصیرالدین کا یہ سوال صرف میرے لیے نہیں ہر اس شخص کیلئے ہے جو ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔

4.24۔ اک آس ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں

میری لینڈ یونیورسٹی کے ڈنر میں کچھ صحافی بھی مدعو تھے۔ انہوں نے اس تقریب کی بہت اچھی کوریج کی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے علی عمران نے تو اخوت کی ویب سائیٹ کھنگالنے کے بعد ایک بہت خوبصورت مضمون بھی لکھ ڈالا۔ جمال خان بلوچ نے بھی تعاون کا عندیہ دیا۔ انہی کے مشورے پر پاکستان کے چند اور صحافیوں سے ملاقات کا پروگرام بنا جس کیلیئے ورجینیا کا ایک ریسٹورنٹ منتخب کیا گیا۔ اگلے روز مقررہ وقت پر ہم ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ مہمانوں میں کرکٹ کے مشہور کمنٹیٹر حسن جلیل اور پیپلز پارٹی کے ایک سابق سینیٹر سعید اکبر خواجہ بھی موجود تھے۔ سعید اکبر واشنگٹن کے سفارتی حلقوں میں خاصے مقبول ہیں۔ وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ بھی کام کرتے رہے۔ صحافت کا پیشہ تجسس سے عبارت ہے۔ صحافی ہمیشہ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے ان سے ہونے والی گفتگو کئی طرح کے پیچ وخم کا شکار ہوتی رہی۔ آپ کے مقاصد کیا ہیں۔ عطیات کہاں سے آتے ہیں۔ سیاست سے کیا تعلق ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے کئی ایک اہم پہلوؤں پہ اپنی آزادانہ رائے بھی دی۔ ان کا خدشہ تھا کہ مسجد میں کام کرنے سے خواتین اور اقلیتی مذہبی گروہ قرضوں کی سہولت سے محروم ہوسکتے ہیں۔ ہمارا کہنا تھا کہ ان گروہوں کے مفاد کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ کام مسجد کے علاوہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ خواتین مسجد میں نہ آنا چاہیں تو انہیں خصوصی رعایت بھی میسر ہے۔ اس روز کا ایک اور سنگِ میل پاکستانی امیریکن انٹر پرینیورز سے ملاقات بھی تھی۔ ان سے رابطہ ڈاکٹر ذکی الدین احمد کے ذریعے ہوا۔ ذکی کراچی کے ایک معروف سماجی کارکن ہیں اور اخوت کو عام کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں نے ان سے امریکہ کے وزٹ کا تذکرہ کیا تو ان کا کہنا تھا کہ مجھے امریکہ میں آرگنائزیشن آف پاکستانی انٹر پرینیورز آف نارتھ امریکہ (OPEN) کے لوگوں سے بھی ملنا چاہیئے۔ امریکہ میں یہ تنظیم بہت تیزی سے مقبول ہو رہی ہے اور اس کے توسط سے پاکستان میں بہت کام ہوسکتا ہے۔ ورجینیا میں اس تنظیم کی قیادت جاوید قمر کرتے ہیں۔ ان کے گھر ہونے والی اس ملاقات میں کئی بزنس مین موجود تھے۔ عاکف احمد، عمران اکرم، جاوید قمر کی بیٹی عارفہ سید اور ان کے داماد۔ وطنِ عزیز کی خدمت کا وہی جذبہ لیکن بے یقینی کا گرداب۔ اہلِ قلم سے لے کر انٹر پرینیورز تک۔ یہ بہت باخبر لوگ تھے لیکن ان کی باخبری میں درد وغم کی گہری جھلک بھی تھی۔

4.25۔نیکی کے دو واقعات

اخوت کی گذشتہ رات کی تقریب میں بہت سے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ان میں ایک پرانا دوست عبید بھی تھا۔عبید گورنمنٹ کالج میں ہم سے ایک سال پیچھے تھا۔اقبال ہاسٹل میں وہ ہمارے ساتھ تھا مگر ایم بی بی ایس کے بعد امریکہ چلا آیا۔اس نے ہمیں ورجینیا میں واقع اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔عبید کے اصرار پہ ہم نے اگلے روز شام کے کھانے کے لیے وعدہ تو کرلیا مگر ہمیں اس وعدے کو نبھانے میں بہت مشکل پیش آئی۔ڈاکٹر قدیر اور امتیاز نور بھی مدعو تھے۔ہم ایک ساتھ ہی میری لینڈ سے روانہ ہوئے اور راستہ بھولنے کے بعد ایک طویل چکر لگا کے ورجینیا کے اس چھوٹے سے قصبے میں جا پہنچے۔شہر کی رونق سے بہت دور، درختوں اور ہری بھری بیلوں میں گھرا یہ گھر بہت اچھا لگا۔عبید کے کئی عزیز بھی موجود تھے۔چوہدری صفدر جنہوں نے زلزلے اور سیلاب کے دنوں میں اہلِ وطن کی بہت خدمت کی۔ورجینیا کے اس علاقے میں ایک بہت بڑی مسجد بنانے میں بھی ان کا اہم کردار ہے۔وہ خود ایک سماجی کارکن ہیں لیکن ان کا خیال تھا کہ اب شاید خدمت کا وہ دور باقی نہیں رہا۔دنیا نیکی سے خالی ہو رہی ہے۔ایک زمانہ تھا جب لوگ ہسپتال بناتے تھے اور سکول یا یتیم خانے کھولتے تھے۔اب لوگ ایسے کام کرنے سے کترانے لگے ہیں۔قدیر ان کی رائے سے اختلاف کیے بغیر نہ رہ سکا۔اس کا کہنا تھا کہ آج بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔آج بھی نیکی کا فقدان نہیں۔بدقسمتی یہ ہے کہ ایسے لوگ منظرِ عام پہ نہیں آتے۔ہم اپنی گندگی سرِ عام ڈھیر کر دیتے ہیں اور نیکی کو چھپا کے رکھتے ہیں۔میں نے قدیر کی ہاں میں ہاں ملائی اور صفدر صاحب کی اجازت سے دو واقعات بھی سنائے جو ان کیلئے کسی تحفہ سے کم نہ تھے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ جب بھی مایوسی بڑھنے لگے یہ واقعات حوصلہ بڑھانے چلے آتے ہیں۔

4.26۔لاوارث لاشوں کا محافظ

پہلا واقعہ اوکاڑہ کے محمد حسن کا ہے۔

بیس سال پہلے محمد حسن کے شہر اوکاڑہ کے قریب ٹریفک کا ایک ہولناک واقعہ پیش آیا۔حادثہ کی خبر سن کر شہر سے کچھ لوگ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ان میں محمد حسن بھی تھا۔شام تک وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتا رہا۔اس حادثہ نے اس کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔چند ہی دنوں بعد محمد حسن نے اوکاڑہ کے ایک محلے میں چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے کر ایک ڈسپنسری قائم کر دی۔ڈسپنسری میں چند دوائیاں

تھیں اور ایک ڈاکٹر۔ اسی دوران' چند روز بعد ٹریفک کا ایک اور حادثہ ہوا۔ مریضوں کو اسی ڈسپنسری میں لایا گیا لیکن پھر بھی سب کا علاج نہ ہوسکا۔ محمد حسن نے فیصلہ کیا کہ اب اس ڈسپنسری کو ہسپتال میں تبدیل کرنا ہوگا۔ آج اس بات کو بیس برس بیت گئے ہیں۔ اوکاڑہ میں' اوکاڑہ ویلفیئر ٹرسٹ کے نام سے ایک خوبصورت ہسپتال وجود میں آچکا ہے۔ اس ہسپتال کی اس وقت مالیت دس کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا بانی محمد حسن اکثر سوچتا ہے کہ وہ کون سی نیکی تھی جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے اسے اس عظیم کام کے لئے منتخب کیا۔

ایک کمرے کی ڈسپنسری سے لے کر اتنے بڑے ہسپتال تک۔ محمد حسن کا یہ سفر' محنت اور دیانت کا سفر تھا۔ ہسپتال کی تعمیر میں بہت سے لوگوں نے اس کی مدد کی۔ ہزاروں لوگ جنہوں نے دس' بیس' پچاس اور سوسو روپے کے عطیات دیئے۔ محمد حسن کو طبی معاملات کی زیادہ شُد بُد نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میوہسپتال کے ڈاکٹر سید محمد اویس اس کی راہنمائی نہ کرتے تو شاید یہ خواب اپنی تعبیر کو نہ پہنچتا۔ محمد حسن کا دوسرا کارنامہ اس سے بھی بڑا ہے۔ اس کارنامے کا تعلق لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین سے ہے۔ وہ اب تک اپنے ہاتھوں سے تین سوسولہ مسخ شدہ اور بدبودار انسانی لاشوں کو نہلانے کے بعد کفن پہنا کر قبر کی گود میں اتار چکا ہے۔ اس نے اوکاڑہ میں ایک چھوٹا سا قبرستان بھی بنا دیا ہے۔ اس قبرستان میں دفن لوگوں کا مکمل ریکارڈ اس کے پاس موجود ہے۔ موت کے وقت ان کی حالت کیا تھی۔ ان لوگوں نے کیا پہن رکھا تھا۔ ان کی جیبوں میں کیا تھا۔ وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ شاید کوئی وارث ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس تک آپہنچے۔ محمد حسن نے ان لاشوں کی ذمہ داری کیوں اٹھائی؟ اس کا کہنا تھا کہ ''میں نے ایک بار دیکھا کہ ایک لاوارث لاش کو نہلائے بغیر قبر میں اتار دیا گیا۔ یہاں تک کہ نماز جنازہ بھی ادا نہ کی گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر قیامت کے روز میرے رسول ﷺ نے مجھ سے یہ پوچھ لیا کہ محمد حسن! تمہارے شہر میں میرا ایک امتی کفن کے بغیر پڑا رہا اور کسی نے اس کا جنازہ بھی نہ پڑھا تو میں کیا جواب دوں گا۔ بس! اس خیال نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اوکاڑہ کے قریب بہتی ہوئی نہر سے نکلی اور سڑکوں پر پڑی لاوارث لاشوں کو وہ احترام دوں گا جس کا حکم میرے دین نے دے رکھا ہے۔ غسل بھی' کفن بھی اور قبر کے لئے چند گز زمین بھی۔ میں قیامت کے روز اپنے نبیؐ کے روبرو سرخرو ہونا چاہتا تھا۔''

ایک نوجوان جو پانچویں جماعت کے بعد سکول نہ گیا ہو' جس کے گھر والے دو' چار ہزار سے زیادہ نہ کماتے ہوں۔ وہ کروڑوں روپے کا ہسپتال کیسے بنا سکتا ہے۔ میں نے محمد حسن سے یہ سوال کیا تو اس کا کہنا تھا کہ' کامیابی کا راستہ دولت میں نہیں خدمت میں پوشیدہ ہے۔ خدمت کی بدولت انسان کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔ عزت اور آسودگی۔ یہ ہسپتال تو معمولی شے ہے۔ اگر اخلاص اور محنت ہو تو ایسے کئی ہسپتال بن سکتے ہیں''۔ صفدر صاحب نے میری بات بہت توجہ سے سنی۔ ان کے دل پہ کچھ اثر بھی ہوا لیکن ان کا کہنا تھا کہ ہم سب محمد حسن کی طرح نیکی کرنا چاہتے ہیں پھر بھی ہم محمد حسن نہیں بن پاتے۔ ہماری ترجیحات ہماری ذات تک محدود ہو کے رہ گئی ہیں۔ مجھے لگا ابھی کچھ کسر رہ گئی ہے۔

میں نے ایک لمحہ توقف کے بعد دوسرا واقعہ سنانے کی اجازت طلب کی......صفدر صاحب! اس واقعے کا تعلق راولپنڈی سے ہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بہت سال پہلے گارڈن کالج راولپنڈی کے چند طالب علم ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آنکھوں کا ایک ہسپتال بنائیں گے۔ انہوں نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ تھا اسے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ ایک شخص نے اس رقم کو گِنا تو وہ کل پینتیس روپے بنے۔ یہ رقم تو بہت کم ہے۔ کسی نے کہا لیکن اس کے باوجود انھوں نے راولپنڈی آئی ڈونرز آرگنائیزیشن کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھ دی۔ وہ 14 اگست 1977 کا دن تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس ادارے کو ہولی فیملی ہسپتال میں ایک کمرہ مل گیا۔ وہ ہر ماہ بہت سے ڈاکٹر اکٹھے کرتے اور پھر آئی کیمپ لگانے کے لیے چل نکلتے۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد اور آزاد کشمیر۔ جگہ جگہ، قریہ قریہ۔ 1981 میں ایک مقتدر شخص نے اس ادارے کا سرپرست بننا قبول کیا۔ یہ شخص اتفاق سے پاکستان کا صدر بھی تھا۔ ایسے لوگ سرپرستی کرنے لگیں تو نیکی بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔ ضیاءالحق نے اس چھوٹے سے کمرے کا وزٹ بھی کیا اور کچھ مالی مدد بھی دی۔ یہ مدد پا کر ان نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آئی کیمپوں پر اکتفاء کی بجائے آنکھوں کا ایک مکمل ہسپتال کیوں نہ بنا لیں۔ 1989 میں راولپنڈی شہر کے عین وسط میں چار کنال قطعہ اراضی میسر آ گیا اور بہت جلد بنیادیں بھی رکھ دی گئیں۔

شاید قدرت کو صرف اتنا سا امتحان مقصود تھا۔ پہلی اینٹ رکھنے کی دیر تھی کہ ساری مشکلات ختم ہو گئیں۔ اب ہر سال ہسپتال میں چالیس ہزار کے قریب مریض آتے ہیں۔ اڑھائی ہزار سے زیادہ آپریشن ہوتے ہیں۔

گویا ہر روز سات کے قریب افراد کو بینائی میسر آتی ہے۔ دو سال پہلے اس ہسپتال میں ایک اور شعبے کا اضافہ کیا گیا۔ یہ نیا شعبہ گردے کی بیماریوں کے متعلق ہے اور یہاں ڈائیلیسز کی سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ جو لوگ گردے کے امراض سے آگاہ ہیں انھیں معلوم ہے کہ یہ کتنا مہنگا طریقہ علاج ہے۔ ہر سال اس ہسپتال میں بارہ سو سے زائد فری ڈائیلیسز ہوتے ہیں۔

صفدر صاحب! کیا پینتیس روپوں سے آنکھوں کا ایک بہت بڑا ہسپتال بن سکتا ہے؟ کیا پینتیس روپوں سے ہزاروں مریضوں کی بینائی لوٹ سکتی ہے؟ کیا اس معمولی رقم سے ڈائیلیسز کی مہنگی مشینیں خریدی جا سکتی ہیں۔ لیکن میرے خیال کے مطابق یہ سب کچھ ممکن ہے کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ رونما ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو آپ بھی راولپنڈی میں مری روڈ پر واقع ناز سنیما کے عقب میں ریڈ و میڈیکل کمپلیکس میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر وہاں جانا مشکل ہو تو اپنی جیب سے پینتیس روپے نکالیں اور وہ خواب دیکھیں جو ہارون الرشید اور کیپٹن مقبول احمد نے دیکھا تھا۔ قدرت اس خواب کو ضرور تعبیر بخشے گی۔ ''اسے تو اخلاص اور محنت کی تلاش ہے۔ وسائل کا بندوبست تو وہ خود کرتا ہے''۔ میں نے انہیں محمد حسن کی بات یاد کروائی۔ اور پھر آپ اخوت اور اس کے ہزاروں ڈونرز کو کس فہرست میں رکھیں گے۔ کمی بیشی تو ہوتی رہتی ہے لیکن یہ دنیا نیکی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ صفدر صاحب کچھ سوچنے لگے۔ کھانا اور چائے ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے اجازت چاہی۔ ہمیں دو گھنٹے کی مسافت پہ ایک اور چھوٹے سے شہر ہیگرز ٹاؤن جانا تھا۔ عبید اور اس کے عزیز و اقارب نے بہت محبت سے الوداع کہا۔ جانے سے پہلے صفدر صاحب نے ایک لفافہ بھی تھمایا جس میں اخوت کیلئے عطیہ تھا۔ ''اوکاڑہ کے محمد حسن اور راولپنڈی کے ہارون اور کیپٹن مقبول کو میرا اسلام ضرور کہیے گا''، مجھے لگا صفدر صاحب کی رائے تبدیل ہونے لگی ہے۔

4.27۔ حور وخیام سے گذر

اخوت کے نام سے یہ جو ساری کاوش ہوئی اس کا حاصل کیا ہے۔

قدیر، امتیاز اور میں۔ ہم سب ایک ہی گاڑی میں سوار ہوئے اور ہمارا رخ ورجینیا کے ایک قصبے ہیگرز ٹاؤن کی طرف تھا۔ ہم عشاء کے وقت وہاں پہنچے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں بہت سے پاکستانی ڈاکٹرز رہتے ہیں۔

ان میں سے چند کا تعلق کنگ ایڈورڈ سے ہے لیکن وہ سب وہاں موجود نہ تھے۔ شاید انہیں اطلاع تاخیر سے ملی۔ وہی باتیں اور وہی سوال جواب' جو بالٹی مور کے اسلامی مرکز میں ہوئے۔ ایک سوال تاہم نیا تھا۔ اس انداز میں یہ سوال پہلی بار پوچھا گیا۔'' آپ کی اس ساری کاوش کا مقصد کیا ہے اور آپ نے اب تک حاصل کیا کیا''۔ ایک صاحب نے جو بڑی دیر سے ہماری باتیں سن کر متذبذب ہو رہے تھے ہم سے پوچھا۔ مقصد تو نیکی ہے لیکن حاصل کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ نیکی بذات خود بھی تو انعام ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ بیج بونے کے بعد یہ بھی دیکھا جائے کہ اس پر پھل لگا یا نہیں۔ کیا بیج بونا ہی کافی نہیں۔ ہم نے مشہور صوفی شاعر میاں محمد بخش کی بات دہرانی چاہی:

مالی دا کم پانی دینا' بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پُھل لانا' لاوے یا نہ لاوے

سوال پوچھنے والے کا تجسس باقی تھا لیکن انہوں نے بات آگے نہ بڑھائی۔ شاید وہ مطمئن ہو گئے یا انہیں بھی وقت کی تنگی کا احساس تھا۔ اس سے پہلے کہ کچھ اور سوال ہوتے ہمارے میزبان نے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ ہم نے بھی ان سے رخصت طلب کی اور یوں ہیگرز ٹاؤن سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن امتیاز اور قدیر باتوں میں مشغول تھے۔ کانوں میں بڑی دیر تک ہیگرز ٹاؤن میں پوچھے جانے والے سوال کی بازگشت گونجتی رہی۔'' ہماری اس ساری کاوش کا حاصل کیا ہے۔ ہم یہ سب کیوں کر رہے ہیں۔ اس سارے کام کا نتیجہ کیا نکلے گا''۔ کیا اس لیے کہ اس سے غربت ختم ہو گی...... یا اس لیے کہ ہمیں کہا گیا ہے کہ بس! ایسا کرنا ہے۔ یہی صحیح رستہ ہے۔ مجھے لگا اصل بات تو یہی ہے۔ پہلی بات محض اضافی ہے۔ اخوت کا تعلق حکم سے ہے' نتیجے سے نہیں۔ یہ تو بجا آوری ہے۔ یہ تو اطاعت اور اتباع ہے۔ اطیعوااللہ اور اطیعوالرسول۔ یہ تو ایک ایسا فرض ہے جس کی ادائیگی ہی اس کا حاصل ہے۔ ہیگرز ٹاؤن کا سفر بے معنی نہ تھا:

جسکا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

5

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

بوسٹن ۔ نیویارک ۔ نیوجرسی

باب پنجم

5.1۔اگلی منزل

وقت کا دریا تیزی سے بہہ رہا تھا۔بعض اوقات تو علم ہی نہیں ہوتا اور شب و روز چپکے سے گذر جاتے ہیں۔ ہمیں اتوار کی صبح بوسٹن پہنچنا تھا لیکن ورجینیا میں عبید کے کھانے کی وجہ سے تھوڑی سے تبدیلی عمل میں آئی اور سوموار کی صبح کا پروگرام بنانا پڑا۔اس تبدیلی کی وجہ سے ایئر پورٹ بھی تبدیل کرنا پڑا۔ پہلے واشنگٹن سے روانگی تھی' اب بالٹی مور انٹرنیشنل سے جانا پڑا۔سوموار کی صبح دس بجے تک تیاری ہوتی رہی۔چھوٹی چھوٹی چیزیں اور کچھ تحفے۔ فارغ ہوئے تو بالٹی مور کی جانب سفر شروع ہوا۔ہم نے ورجینیا اور میری لینڈ میں ڈیڑھ سال کا عرصہ گذارا تھا۔کسی بھی ایسی جگہ سے رخصت ہوں تو کچھ نہ کچھ اداسی تو ہوتی ہے۔بالٹی مور تک کا ایک گھنٹے کا یہ سفر پرانی یادوں میں گذرا۔ایئر پورٹ کی طرف آدھے سے زیادہ فاصلہ طے ہوا تھا کہ اچانک قدیر کا فون بجا۔ عاصمہ بھابھی کی کال تھی۔انہوں نے جلدی سے بتایا کہ ہم کمپیوٹر والا بیگ تو گھر بھول آئے تھے۔واپس پلٹ کر جانا تو ناممکن تھا کیونکہ اس صورت میں فلائیٹ یقینی ضائع ہو جاتی۔عاصمہ بھابھی نے ہی اس کا حل نکالا اور اپنی گاڑی پہ بالٹی مور پہنچنے کا فیصلہ کیا۔جو سفر ہم نے ایک گھنٹہ میں طے کیا وہی سفر انہوں نے چالیس منٹ میں کر لیا اور عین وقت پر ایئر پورٹ پہنچ گئیں۔ہم گاڑیوں سے اترے اور رش میں سے راستہ بناتے ہوئے ائیر پورٹ کے اندر داخل ہوئے۔تلاشی کے وہی جاں گسل لمحے۔پچھلے دو ہفتوں میں یہ تلاشی آٹھویں بار ہو رہی تھی۔اتنی تھکاوٹ سفر میں نہ ہوئی جتنی ان مراحل سے گذر کے ہوئی۔بہر حال سفر کی کچھ قیمت تو ادا کرنا ہی تھی۔ جہاز میں بیٹھتے ہی اچانک مجھے خیال آیا کہ ہم تلاشی کے مراحل سے کس قدر نالاں ہونے لگتے ہیں۔یہ نہیں دیکھتے کہ جہاز کا سفر کتنی بڑی نعمت ہے۔ہزاروں میل کا سفر کیا کبھی اتنی تیزی سے ممکن تھا۔ایک ہی صدی قبل لوگ یا تو جانوروں پہ سفر کرتے یا بادبانوں کے سہارے آگے بڑھتے۔آہستہ آہستہ ہوائیں تسخیر ہونے لگیں اور انسان پرندوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔سفر کی صعوبت ختم ہوئی......زندگی ہزاروں برس تک ایک ہی خواب دیکھنے کا عمل ہے۔ مجھے دو بھائی یاد آنے لگے جنہوں نے

زمان ومکان کے تصور کو نئی جہت دے ڈالی۔

5.2۔اس زمین وآسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

ان کا نام ولبر رائٹ اور آرولِ رائٹ تھا۔
وہ پرندوں کو اڑتا دیکھتے اور حیران ہوتے۔ وہ اکثر یہ بھی دیکھتے کہ کچھ پرندے ہوا کی لہروں پر بازو ہلائے بغیر اڑتے رہتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے اخبار میں ایک انجینئر کی خبر پڑھی جو بڑے بڑے پر باندھ کر ایک پہاڑی سے نیچے کی جانب اڑا کرتا تھا۔ اسی کوشش کے دوران ایک روز وہ ہلاک ہو گیا۔ دونوں بھائیوں کو بہت دکھ ہوا لیکن انہوں نے اس کا خواب اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ولبر رائٹ اور آرولِ رائٹ نے واشنگٹن میں سمتھ سونیئن ادارے کو خط لکھ کر ان تمام مضامین کی فہرست منگوالی جو انسانی پرواز کے بارے میں لکھے گئے تھے۔ وہ بڑے جوش وخروش سے یہ مضامین پڑھتے رہتے۔ چار برس کے مطالعے کے بعد انہوں نے دھات کا ایک پتنگ نما جہاز بنانے کا فیصلہ کیا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ یہ کھلونا ایک انقلاب بپا کر دے گا۔ دونوں بھائی سائیکلوں کی فروخت اور مرمت کی ایک دکان کے مالک تھے۔ رات کے وقت دو کان بند کرنے کے بعد وہ ہوا میں پرواز کرنے کے تجربے میں مصروف ہو جاتے۔ ان کے پہلے پتنگ نما جہاز پر تین پونڈ صرف ہوئے۔ تمام تیاریاں مکمل ہونے کے بعد انہیں محکمہ موسمیات کے دفتر سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ شمالی کیلی فورنیا میں کون سا مقام اڑنے کیلئے بہترین ثابت ہوگا۔ یہ ایک اونچی جگہ تھی جہاں سمندر کی سمت سے تیز ہوا چلتی۔ وہاں ساحل کی ریت بھی بہت نرم تھی۔ پہلی پرواز۔ جب انہوں نے اپنے پتنگ نما جہاز میں بیٹھ کر اڑنا شروع کیا تو چند سیکنڈ سے زیادہ ہوا میں نہ ٹھہر سکے۔

رائٹ برادران کی اس پرواز کے وقت ایک انجینئر بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے انہیں شکاگو کی سوسائٹی آف انجینئرز کے سامنے تقریر کرنے کی دعوت دی تو ان بھائیوں کو اور بھی حیرت ہوئی۔ اسی دوران انہوں نے اپنے پتنگ نما جہاز میں بیٹھ کر بیسیوں کامیاب پروازیں کیں لیکن انہیں اپنے اس اڑن صندوق کیلئے ہر جگہ مناسب ہوا نہ ملتی تھی۔ ہوا یا تو بہت ہلکی ہوتی یا پھر تیز اور تھپیڑے دار۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے اپنی ہوا بنانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے جہاز میں پٹرول سے چلنے والا انجن نصب کرنے کے بعد برقی تاروں

کے ذریعے اسے جہاز کے پنکھوں کے ساتھ جوڑ دیا۔کوئی مینوفیکچرر اتنے ہلکے وزن کے انجن نہ بناتا تھا لہٰذا انہوں نے خود ہی کام کر کے اپنی دکان کے اندر ایسا انجن تیار کیا۔اس مشین اور انجن پر ان کا کل خرچ 60 پونڈ سے کم آیا۔

اس مشین کے ذریعے انہوں نے 17 دسمبر 1903 کو ہوا کی مدد کے بغیر پرواز کی۔اس دن غضب کی سردی تھی لیکن اس سردی کے باوجود جب آرول رائٹ ہوائی جہاز میں سوار ہوا تو اس نے اوورکوٹ نہیں پہنا کیونکہ وہ ہوائی جہاز پر زیادہ بوجھ نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ ناممکن بات امکان کی سرحد میں داخل ہوگئی۔ ہوا سے بھاری مشین واقعی ہوا میں اڑنے لگی اور اس نے 120 فٹ کا فاصلہ طے کیا۔اڑن طشتری کا رومانوی تصور بالآخر جہاز میں تبدیل ہوگیا۔ایک سال کے اندر اندر رائٹ برادران پچیس میل لمبی پرواز کرنے لگے۔ایک سو برس بعد آج یہ پرواز کئی ہزار میل سے تجاوز کر چکی ہے۔سمندر، صحرا، زمین و آسمان کی بے کرانی! یہ سب کچھ انسان کے ہاتھوں مات کھا گیا۔

آرول رائٹ اور ولبر رائٹ کی پہلی پرواز فقط بارہ سیکنڈ کی تھی لیکن وہ بارہ سیکنڈ آج بھی انسانی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان کی بدولت صدیوں پرانا خواب حقیقت میں بدل گیا۔ انسان ستاروں کی طرف پرواز کرنے لگا۔ میں جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اترا تو رائٹ برادران کی عظمت کا احساس اور گہرا ہونے لگا۔

خواب، خواب، خواب۔غربت کا خاتمہ فضا میں اڑنے سے مشکل خواب نہیں۔رائٹ برادران نے ایک خواب دیکھا اور پھر تعبیر تک جا پہنچے۔آیئے ہم بھی کوئی خواب دیکھیں۔شاید اگلی نسل اس کی تعبیر پالے:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

غربت کے سومنات کو بہرحال تسخیر ہونا ہے۔

5.3۔بیکر ہال

ڈیڑھ گھنٹے کی فلائیٹ کے بعد ہم سہ پہر تین بجے بوسٹن پہنچ چکے تھے۔ہلچل اور رونق۔لوگن ایئرپورٹ سے نکلتے ہی ٹیکسی لی اور ہارورڈ یونیورسٹی کے بزنس سکول کا رخ اختیار کیا۔ ہمارا قیام سکول کے اندر بیکر نامی ہال

میں کیا گیا تھا۔ دریائے چارلس سے چند قدم کے فاصلہ پر یونیورسٹی حدود کے اندر یہ ایک آرام دہ رہائش گاہ تھی۔ جمنازیم، سوئمنگ پول، جوگنگ ٹریک، سکواش، ٹینس ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔ ہم نہا دھو کے تیار ہونے لگے کیونکہ چھ بجے اسی ہال کے لاؤنج میں پروگرام کی پہلی تقریب تھی۔ لیڈرشپ پروگرام میں اس سال اٹھائیس ممالک کے انہتر شرکاء شامل ہو رہے تھے۔ یہ سب لوگ اوران کے ادارے مل جل کر تیرہ ملین افراد کو قرضوں کی سہولت فراہم کرتے ہیں۔ افریقہ، ایشیا پیسیفک، یورپ، وسط ایشیا، مشرقِ وسطیٰ، لاطینی اور شمالی امریکہ۔ دنیا کے ہر کونے سے آنے والے لوگ۔ اس پروگرام کے لئے مالی اعانت ایکسیون انٹرنیشنل اور ماسٹر کارڈز فاؤنڈیشن کی جانب سے فراہم کی گئی تھی۔ ریسپشن میں خوب گہما گہمی رہی۔ شرکاء کا بڑے تپاک سے خیرمقدم کیا گیا۔ گلدستے، تحفے، تقریریں اور پھر اگلے پانچ روز کے دوران ہونے والی سرگرمیوں کی تفصیل۔ اس پورے پروگرام کا مقصد مائیکروفنانس لیڈرشپ کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اس راہ میں درپیش مسائل اور امکانات کو زیرِ بحث لانا تھا۔ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ کیا غربت سے مقابلہ کیلئے مائیکروفنانس بہترین حکمتِ عملی ہے بھی یا نہیں۔ اس میں وسعت اور گہرائی کا کیا امکان ہے۔ تسلسل، معیار، استحکام، اختراع، ٹیکنالوجی۔ کہیں یہ انقلاب راستے کی گرد میں تو نہیں کھو گیا۔ یہ ساری باتیں۔ اس پروگرام کے روح رواں، دو لوگ تھے پروفیسر مائیکل چُو اور پروفیسر کستوری رانجن۔ دونوں ہارورڈ بزنس سکول میں پڑھاتے ہیں۔ پروفیسر مائیکل چُو، ہارورڈ میں بہت بڑا نام ہے۔ پروفیسر رانجن بھی اس پروگرام سے کئی سال سے منسلک ہیں۔ ان دونوں کے معاونین بھی طویل عملی تجربہ کے حامل منتخب افراد تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پانچ روز پہ محیط اس پروگرام میں بہت سی نئی باتیں سننے کو ملیں۔ دنیا بھر سے آنے والے مندوبین علم اور تجربے کا امتزاج تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسی بڑے ادارے کی نمائندگی کر رہا تھا۔

5.4۔ زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

موسیقی کی مدہم ہوتی ہوئی لَو اور بجھتے ہوئے چراغ!

بیکر ہال کے لاؤنج میں پہلی تقریب ختم ہوئی۔ تمام لوگ باہر نکل کے اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے لگے۔ پروگرام سے مستفید ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ہم اس مواد کو اچھی طرح پڑھ لیں جو ان دنوں زیرِ مطالعہ آنا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہم نے ہارورڈ بزنس سکول کی عمارت دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ہارورڈ دنیا کا

سب سے مہنگا سکول ہے۔ اس کی خوبصورت عمارت سے پرانے دنوں کی باس آتی ہے۔ آئیوی کی بیلیں۔ اینٹوں کی چنائی۔ سبزے کی بہتات۔ مجھے تو یہ گورنمنٹ کالج جیسا ہی لگا۔ جسے جہاں سے روشنی مل جائے۔ سردیوں میں یہاں ہر طرف سفید چادر ہوتی ہے لیکن ان دنوں پھول کھل رہے تھے۔ یہاں ایم بی اے کرنے کے لئے دو کروڑ روپے درکار ہیں۔ لوگ اتنی رقم کیوں خرچ کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ جس کے سینے پہ ہارورڈ کا تمغہ سجا ہو اس کی صلاحیت پہ کوئی شک نہیں کرتا۔ ہارورڈ یا بوسٹن' کیلی فورنیا کی طرح امیر نہیں لیکن اس شہر کے باسیوں نے تعلیم کو ہی روزگار بنا لیا ہے۔ ہم بھی تو شہروں کو علم اور تحقیق کے لئے وقف کر سکتے ہیں۔ ہمیں بھی تو یہ کہا گیا ہے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں لیکن ہم جاہلوں کی صف میں کھڑے ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ گذشتہ چالیس برس میں طبیعات' کیمیا یا فلکیات کے موضوع پر شاید ہی کوئی مقالہ کسی مسلمان سائنسدان نے لکھا ہو۔ کوئی پستی سی پستی ہے۔ دریائے چارلس کا خاموشی سے بہتا ہوا پانی اور اس کے کنارے بیٹھے ہوئے طالبِ علم۔ نہ کوئی احتجاج' نہ شور' نہ نعرے' نہ سپاہی' نہ گارڈ۔ ایک پرسکون ماحول۔ ہر شخص اپنے آپ میں گُم۔ بزنس سکول کے کشادہ در و دیوار دیکھنے کے بعد میں کچھ دیر ہارورڈ کی مرکزی عمارت کے لان میں بیٹھا اپنے روز افزوں زوال پہ غور کرتا رہا۔ کیا ہماری غربت ہی ہمارے زوال کا سبب ہے؟ کیا یہ افلاس ہے جس نے ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ اقبال کا مشہور شعر کانوں میں گونجنے لگا:

یہ اور شے ہے جسے خود بھی تو سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

زوال کے اسباب بے شمار ہیں............

آدمی اپنا دشمن آپ بھی تو ہوتا ہے۔ کوئی اپنے آپ ہی سے عداوت پر اتر آئے، کوئی خود سے دشمنی کرنے لگے......! ماضی کے خمار میں ڈوبے رہنا، خزاں کا ماتم کرنا، لمبی تان کے سو جانا، مالِ مفت کی ٹوہ میں رہنا، نہ خود کچھ کرنا، نہ کسی اور کو کرنے دینا، کیڑے نکالتے رہنا، بلند بانگ دعوے کرنا، قوم کی دولت کو مالِ مفت سمجھنا، چوری چکاری' ڈاکہ زنی، رعایتوں کی تلاش، اقربا پروری' رشوت اور جھوٹ' ملاوٹ کرنا اور ذخیرہ اندوزی کو جائز سمجھنا۔ ظلم، ناانصافی، بدعہدی، بے حسی، سستی اور کاہلی' بے زاری' بددلی' بدنیتی' بددیانتی اور بھتہ خوری۔ شر کے خوف سے لوگوں کی عزت کرنا' منہ زوروں کو لیڈر ماننا' جھوٹ پر اترانا اور منافقت میں پناہ

لینا‘ کاسہ لیسی، کام چوری۔ دوسروں کی نہ سننا، اپنی کہے جانا، شک کرتے رہنا، حسد کی آگ میں جلنا؛ کسی بھی شعبدہ باز کے پیچھے چل دینا اور اپنی ہی املاک کو جلا کر راکھ کر دینا...... جہالت کا زہر پینا۔ آگہی سے دور بھاگنا۔ یہ بھول جانا کہ آگے جانے والے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتے۔ انہیں تو اور آگے جانا ہے۔ مہ و پروین سے بھی آگے۔

زوال کا سبب صرف غربت ہی نہیں۔ پیچھے رہ جانے کے اسباب بے شمار ہیں۔

5.5۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

درسگاہیں اپنے طالب علموں سے پہچانی جاتی ہیں۔

رومن اور ڈیوڈ۔ ہارورڈ کے دو طالبِ علم۔ رومن کا تعلق جرمنی سے اور ڈیوڈ کا ہالینڈ سے ہے۔ ان دونوں سے تعارف عمران سرور کے ذریعے ہوا۔ یہ دونوں طالبِ علم بھی ہیں اور کوہ پیما بھی۔ علم ان کی جستجو ہے اور کوہ پیمائی ان کا شوق ہے۔ ان سے رابطہ ہارورڈ آنے سے کئی ماہ پہلے ہوا۔ ان دونوں نے No Mountain is too High (NM2H) نامی ایک تنظیم بنا رکھی ہے۔ ان کا عزم ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ کے تمام سربفلک پہاڑوں کو سر کریں گے۔ عمران نے انہیں اخوت کے بارے میں بتایا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ہر مہم کے وقت اخوت کی بھی تشہیر کریں گے۔ یوں اخوت اور (NM2H) کے درمیان ایک ضابطہ تعاون طے پا گیا۔ میں ہارورڈ پہنچا تو رومن اور ڈیوڈ کو بے حد خوشی ہوئی۔ انہوں نے اپنی گرل فرینڈز سے ملوایا۔ جینٹ اور لارین۔ ایک جاپانی اور ایک امریکی۔ کہاں جرمنی کہاں ہالینڈ‘ کہاں جاپان اور کہاں امریکہ۔ اجنبی شہروں اور دور دراز ملکوں میں جنم لینے والے کیسے ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ دیواریں ٹوٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ محبت بھی کیا جادو ہے۔ رومن اور ڈیوڈ نے ایک خصوصی ڈنر بھی کیا جس کے دوران باہمی تعاون پہ بات ہوتی رہی۔ وہ سمسٹر کے خاتمہ کے فوراً بعد الاسکا میں ایک پہاڑ سَر کرنے جا رہے تھے۔ اس پہاڑ کی بلندی اٹھارہ ہزار فٹ سے زائد ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس بلندی پر وہ دو جھنڈے نصب کریں گے۔ ایک "NM2H" کا اور دوسرا "AKHUWAT" کا۔ الاسکا کی بلندی میں کوئی ذی روح نہیں بستا۔ پھول‘ پودے‘ نباتات‘ جمادات کچھ بھی نہیں۔ شاید محبت کا جادو بھی نہ ہو۔ وہاں ''اخوت'' کا پرچم بلند ہوگا۔ مجھے لگا یہ پرچم ان عظیم افراد کے حضور نذرانۂ عقیدت ہے جنہوں نے دنیا میں سب سے پہلے مواخات کا رشتہ قائم کیا:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بلندیوں کا سفر یقیناً پہلے قدم سے شروع ہوتا ہے۔ بارہ سال پہلے جو قدم اٹھا وہ کہاں تک جا پہنچا۔ و یجعلکم خلفاء الارض......"تم ایک معمولی، حقیر اور بے نشاں تخلیق ہو تمہیں زمین پر عزت کا مقام کون دیتا ہے؟ خلیفتہ اللہ کون بناتا ہے"۔ یہ تو محض اسی کی عطا ہے۔

رومن اور ڈیوڈ نے ہمیں ایک نا قابلِ بیان مسرت سے ہمکنار کر دیا۔

5.6۔ یوتی الحکمۃ من یشاء

بات نکلی ہے تو پھر دور تلک جائے گی۔

ڈیوڈ کی گرل فرینڈ فلیچر سکول آف ڈپلومیسی کی طالبہ ہے۔ اس نے اخوت کی کہانی کچھ اور دوستوں کو سنائی اور یوں یہ بات فلیچر سکول کی ایک پروفیسر تک جا پہنچی۔ جب پروفیسر کِم وِلسن کو یہ علم ہوا کہ میں ان دنوں بوسٹن میں ہوں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اس نے فوراً ای میل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا اور ایم بی اے کی کلاس میں باقاعدہ گفتگو کی دعوت بھی دے ڈالی۔ ہمارے لئے یہ بات بہت اہم تھی کہ وہ گذشتہ تین سال سے اخوت کو ایک باقاعدہ کیس کے طور پر پڑھا رہی تھیں۔"رضا کاریت، عبادت گاہوں کا استعمال، سود سے نجات۔ اخوت نے مائیکروفنانس میں اس قدر نئی باتیں متعارف کی ہیں کہ میں ایک مدت سے ورطۂ حیرت میں ہوں۔" اس نے بہت شوق سے بتایا۔ اخوت کو کِم وِلسن سے متعارف کروانے کا کام کسی اور نے نہیں ہمارے دیرینہ دوست میلکم ہارپر نے کیا تھا۔ جن دنوں وہ نیو ہمپشائر یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا اس نے اخوت پر ایک مضمون لکھا۔ یہی مضمون اس نے پروفیسر کِم وِلسن کو بھجوا دیا اور یوں یہ فلیچر سکول کے کورس کا حصہ بن گیا۔ میں، ڈیوڈ اور اس کی گرل فرینڈ جینٹ کے ہمراہ جب اس کلاس میں پہنچا تو کِم وِلسن نے بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ ایک گھنٹے کا لیکچر پوری کلاس نے مکمل دلچسپی اور انہماک سے سنا۔ یہ تمام نوجوان سرمایہ دارانہ نظام میں رہنے کے باوجود ایک ایسا جہان آباد کرنا چاہتے تھے جہاں ہر شخص کو عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہنے کا موقعہ ملے اور اس کی محنت کا ہر ثمر اسی کی اپنی جھولی میں گرے۔ اخوت میں انہیں یہی پیغام نظر آیا اور وہ سب اس کی رو میں بہنے لگے۔ پروفیسر وِلسن اس بے خودی میں سب سے آگے تھی۔ اس نے اپنے اختتامی کلمات میں اخوت کو ایک نا قابلِ بیان روحانی تجربے سے تعبیر کیا۔ اس کی جانب سے ملنے والی اس ای میل میں ان جذبات کا مکمل اظہار ہوتا ہے:

"You can't imagine what a great treat you gave us last week with your spectacular presentation on Akhuwat. I am copying Malcolm Harper, your admirer, and who I know will be envious that Fletcher got a chance to hear your talk.

I just wanted to let you know that the students attending were so taken with the simple idea of the Brotherhood. You took a complex idea and made it so human. We were all in awe. Thank you so much.

I hope to stay in touch. You inspired so many of us. My warmest and most heartfelt thanks. "

مجھے لگا شاید یہ خط کبھی پروانۂ نجات بن جائے۔

فلیچر سے باہر نکلے تو بارش ہو رہی تھی۔ بارش کا پہلا قطرہ ہی دل پہ دستک بن کے گرتا ہے۔ جل تھل ہو جائے تو باغ سا کھل جاتا ہے۔ مٹی کی خوشبو اور جلترنگ۔ ڈیوڈ اور جینٹ مجھے ہارورڈ تک واپس لے آئے۔ میں نے جینٹ سے کہا اگر وہ پاکستان میں ہوتی تو اس کا نام جینٹ سے جنت بن جاتا اور جب میں نے اسے جنت کے معنی بتائے تو وہ مسکرانے لگی۔ ان دونوں نے مجھے عاصم خواجہ کے دفتر کے پاس اتار دیا۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو۔ ہارورڈ کا یہ کم عمر پروفیسر وضع قطع سے خود طالبِ علم نظر آتا ہے۔ لیکن یہ محض حجاب ہے۔ تدبر اور فہم کا عمر سے کوئی رشتہ نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس خوش قسمت کو حکمت مل گئی اسے حقیقت میں خیرِ کثیر مل گئی۔

5.7۔ کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری

لیڈر شپ پروگرام کے روح رواں کا نام مائیکل چُو ہے۔

مائیکل چُو بہت زیرک اور ذہین انسان ہے۔ انتہائی سمجھ بوجھ کا حامل۔ گفتگو کے سلیقہ سے آشنا۔ وہ چین میں پیدا ہوا۔ یوراگوئے میں پلا بڑھا اور امریکہ میں آباد ہو گیا۔ ہارورڈ بزنس سکول اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہیں سے اس نے تعلیم حاصل کی اور اب یہیں پڑھاتا ہے۔ وہ گفتگو کا ماہر ہے۔ اس کے الفاظ دل پہ دستک دیتے

ہیں۔ باتوں میں کبھی یہ تاثر نہیں دیتا کہ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ جب میں نے اسے اخوت کے بارے میں بتایا تو مسکرانے لگا۔ میں آپ کی ویب سائیٹ کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ یہاں جتنے لوگ ہیں میں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوں۔ اس نے لیڈرشپ پروگرام کے شرکاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اگر آپ اخوت کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں تو کیا کوئی مشورہ دینا چاہیں گے۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ نئے راستوں پہ چلنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے لیکن ابھی آپ کو بہت دور جانا ہے۔'' یہ کہہ کے وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے مزید کریدا تو بولا ''آپ اب تک کتنے لوگوں کو قرضوں کی سہولت دے چکے ہیں۔'' دو لاکھ۔ میں نے جواب دیا۔ ''پاکستان میں کتنے لوگوں کو ایسے قرضوں کی ضرورت ہے۔'' اس نے دوبارہ پوچھا۔ ایک کروڑ۔ میں نے جواب دیا۔ ''آپ ان ایک کروڑ افراد تک کب پہنچیں گے۔'' میں ایک لمحے کیلئے خاموش ہو گیا۔ مائیکل بہت گہرا آدمی ہے۔ اس سوال کے پیچھے دراصل ایک پیغام تھا۔ وہ پیغام یہ تھا کہ ان ایک کروڑ افراد تک پہنچنے کیلئے جو راستہ اخوت نے اختیار کیا وہ بہت مشکل ہے۔ ایثار' قربانی' بھائی چارہ۔ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ لوگوں کو مؤاخات کا درس دینے سے کہیں آسان ہے کہ مائیکروفنانس کو کاروبار سمجھ لو۔ مارکیٹ سے پیسہ اٹھاؤ' سود اور سروس چارجز کا اضافہ کرو اور غریبوں کو تھما دو۔ تمہیں تمہارا منافع مل جائے گا اور غریبوں کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ دنیا بھر میں' خصوصاً لاطینی امریکہ میں' جو ادارے ستر سے اسی فیصد شرح سود پر قرضے دیتے ہیں مائیکل ان کا سب سے بڑا طرفدار ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ترقی کا سارا سفر پلک جھپکنے سے پہلے طے ہو جائے۔ کیپٹل ازم کا شاید یہی المیہ ہے۔ انسان وقت سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ مانگنے لگتا ہے۔ جب دولت اور حرص کے دروازے کھلتے ہیں تو صبر اور قناعت کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں۔ میں مائیکل چُو کو کیسے بتاتا کہ دولت کمانا برا نہیں لیکن دولت کمانے کیلئے غلط راستہ اختیار کرنا برا ہے۔ ہم سود نہیں لے سکتے۔ کوئی بھی اخلاقی نظام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے لئے اگر منزل اہم ہے تو اس منزل تک پہنچنے کا راستہ بھی اتنا ہی اہم ہے لیکن مائیکل چو بحث نہیں کرتا۔ صرف رائے دیتا ہے۔ کوئی اصرار کرے تو مسکرا کے موضوع بدل دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے پہ انتہائی دیانتداری سے یقین رکھتا ہے۔ میرے کانوں میں اس کا سوال گونج رہا تھا۔ ''آپ ایک کروڑ افراد تک کب پہنچیں گے''۔ ''آپ ایک کروڑ افراد تک کب پہنچیں گے'' یہ سوال تھا' رائے تھی یا چیلنج۔ مجھے لگا یہ چیلنج ہے اور اس کا یہ چیلنج صرف میرے لیے نہیں' پورے پاکستان کیلئے ہے۔ ہر حکمران' ہر دانشور' ہر صاحبِ ثروت کے لیے۔ کیا غریب ہمارے قومی وجود کا حصہ نہیں۔ ان کی غربت کے دو ہی حل ہیں۔ یا تو

ہم انہیں کیپیٹل ازم کے رحم وکرم پہ چھوڑ دیں یا پھر مؤاخات کا درس اپناتے ہوئے انہیں اپنا بنالیں۔ کاروبار یا ایثار۔ اجنبیت یا مواخات۔ فیصلہ مائیکل نے نہیں کرنا' فیصلہ تو ہمارے ہاتھ میں ہے۔

5.8۔ بوسٹن ٹی پارٹی

پروگرام کے شرکاء کو ہر طرح سے مصروف رکھا گیا۔ کچھ سیر' کچھ تفریح' کچھ تفنن طبع۔ ایک رات سمندر کے ساحل پر ایک قدیم ریسٹورنٹ میں ڈنر کا انتظام کیا گیا۔ لوگ بہت اہتمام سے وہاں پہنچے۔ مہمان بھی اور میزبان بھی۔ انسان عمر کے کسی بھی حصہ میں ہو اچھا لگنے کی خواہش ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ مسکراہٹ کے کھلتے ہوئے پھولوں نے انہیں اور اچھا بنا دیا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کی آرائش سے اس کی قدامت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اسی ریسٹورنٹ کے قریب بوسٹن ٹی پارٹی نامی تاریخی واقعہ پیش آیا تھا۔ کھانے کے دوران ایک میزبان نے بوسٹن ٹی پارٹی کا مختصر سا تعارف کروایا۔

'بوسٹن ٹی پارٹی' کو امریکہ کی جنگِ آزادی کا نقطۂ آغاز بھی کہا جاتا ہے۔ سترھویں صدی کے آخری عشروں میں برطانوی پارلیمنٹ نے امریکہ پہ ٹیکسوں کی بھرمار کر رکھی تھی۔ یہ ظالمانہ طرزِ عمل اتنا بڑھا کہ ایک روز Tea Act کی صورت میں چائے پر بھی بھاری ٹیکس لگا دیا گیا۔ امریکہ برطانیہ کی کالونی تھی اور وہاں کا حکمران طبقہ اس نوآباد جنت سے پیدا ہونے والی دولت لوٹنا چاہتا تھا۔ مقامی لوگوں کو یہ لوٹ مار قبول نہ تھی۔ نتیجہ احتجاج کی صورت میں نکلا۔ پرامن احتجاج اگر ناکام ہو جائے تو بغاوت بن جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ حرفِ احتجاج بغاوت میں بدلنے لگا۔ انہی دنوں بوسٹن کی بندرگاہ پر برطانیہ سے آنے والے تین بحری جہاز آ کے لنگر انداز ہوئے۔ ان جہازوں پر چائے لدی ہوئی تھی۔ بوسٹن کے مکینوں نے ''مہاک انڈینز'' کا روپ دھارا' ان جہازوں کو اپنے قبضہ میں لیا اور ہزاروں من چائے سمندر میں غرق کر دی۔ یہ واقعہ 16 دسمبر 1773 کو رونما ہوا۔ تاجِ برطانیہ کیلئے یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ انہیں یوں لگا جیسے سمندر میں چائے کی پتی نہیں ان کا سارا جاہ وجلال اور دبدبہ غرق ہو گیا ہو۔ برطانوی وزیرِ اعظم اور پارلیمنٹ نے اسے باغیانہ فعل قرار دینے کے بعد انتہائی سخت اقدامات کا اعلان کیا لیکن انہیں شاید علم نہ تھا کہ تاریخ ان کے اقدامات سے پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ بوسٹن ٹی پارٹی سے آزادی کی جدوجہد کو ایک مہمیز ملی اور 1775 میں آزادی کی جنگ کا باقاعدہ طبل بجنے لگا۔ یہ جنگ کچھ ہی عرصہ میں ایک نئے ملک کی صورت میں اپنے

آخری انجام کو پہنچی۔اس واقعہ کا نام بعد میں 'بوسٹن ٹی پارٹی' رکھا گیا۔سولہ دسمبر 1773 کی رات۔ایک فیصلہ کن رات تھی کیونکہ اگلے روز سمندر نے جس سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا وہ غلامی کا نہیں' آزادی کا سورج تھا.................. بوسٹن ٹی پارٹی اب ایک علامت بن چکی ہے۔احتجاج کی اور آزادی کی۔خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کی دیر ہے ہر قوم بوسٹن ٹی پارٹی مناتی ہے۔نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ ہر بار ''ٹی پارٹی'' پر ہی ہوا۔وقت بدل گیا۔دنیا کی قومیں سامراج سے آزاد ہو گئیں لیکن بوسٹن ٹی پارٹی اب بھی ہوتی ہے۔ایسی ہی ٹی پارٹی ایک روز کشمیر میں بھی ہوگی' فلسطین میں بھی ہوگی۔'بوسٹن ٹی پارٹی' آزادی کا نشان ہے۔میں ریسٹورنٹ کی کھڑکی سے ساحلِ سمندر کو دیکھ رہا تھا۔دو سو سال پہلے اس رات وہاں اندھیرا تھا۔گہرا اندھیرا۔اب وہاں روشنی ہے۔رات جتنی تاریک ہو صبح اتنی ہی پُرنور ہوتی ہے۔

5.9۔آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش

بزنس سکول میں قیام کے دوران ہی مجھے اٹھارہویں سالانہ انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ کانفرنس میں شرکت کا موقعہ بھی ملا۔اس کا انعقاد ہارورڈ یونیورسٹی کے کینیڈی سکول میں ہو رہا تھا۔کانفرنس کا اس سال کا موضوع تھا ''سات ارب افراد۔ترقی کی نئی دنیا'' ہر طرف پھیلی ہوئی جنگیں' فنانشل کرائسس' ماحول کی تباہی' قدرتی آفات' حکمرانی کے برے معیار' غربت اور افلاس۔اس دنیا میں سات ارب افراد کیلئے زندہ رہنا کسی بڑے امتحان سے کم نہیں۔ماہرین معیشت' دانشور' رہنما' استاد' صحافی' مدبر' سیاست دان' مذہبی پیشوا۔اگر دنیا کو غربت سے بچانا ہے تو ان سب کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔یہ کانفرنس بھی ایسی ہی ایک کوشش تھی۔اس کے ذریعے اہلِ علم اور اہلِ عمل کو ایک جگہ جمع کرنا مقصود تھا تاکہ ہارورڈ کے طالب علم ان سے مستفید ہو سکیں۔ کانفرنس کے اہم مقررین میں بان کی مون سیکرٹری جنرل اقوامِ متحدہ بھی شامل تھے۔ان کے علاوہ مختلف شعبوں کے نامی گرامی افراد' چار سو مندوبین اور پھر ہارورڈ کینیڈی سکول کے اَن گِنت طلبا و طالبات۔مجھے یہاں اخوت کے غیر معمولی کام اور اس کی Innovations کے حوالے سے گفتگو کا موقعہ ملا۔پچاس سے زائد افراد کے ساتھ ایک گھنٹے کی یہ نشست بہت کارآمد تھی۔سوال اٹھا کہ امریکی معاشرہ اخوت کے تصور سے کس طرح مستفید ہو سکتا ہے۔ایک سیاہ فام طالبِ علم نے اخوت کو مارٹن لوتھر کنگ کے بھائی چارے کے فلسفہ سے مشابہ قرار دیا۔سود کے بغیر مالی خدمات کی فراہمی۔یہ تصور ان لوگوں کے لئے انوکھا بھی تھا اور

ناقابلِ یقین بھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا ایسا ہونا واقعی ممکن ہے؟ معاشیات کے جو اصول انہوں نے پڑھے ان میں قرضِ حسن کا کہیں پر کوئی ذکر نہیں۔ وہاں تو صرف سود کو معیشت کی گاڑی کا ایندھن سمجھا جاتا ہے۔ ان کی سوچ وال سٹریٹ سے شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتی ہے۔

اس کانفرنس میں شرکت کی بدولت اخوت کا پیغام بھی پھیلا اور اخوت کو چند بہی خواہ بھی مل گئے۔ کچھ غیر ملکی۔ کچھ پاکستانی۔ ان میں حسن عامر بھی شامل تھا۔ عامر کا تعلق کراچی سے ہے اور وہ ہارورڈ کے ایجوکیشن سکول میں پڑھ رہا ہے۔ اس نے اخوت کے تصور کو اپنانے میں ایک لمحہ بھی دیر نہ کی اور دو دنوں میں نجانے کتنے لوگوں کو بتا دیا کہ اخوت کی طرح ہر شخص تبدیلی کا پیامبر بن سکتا ہے۔ اسے تعلیم کا خبط لاحق تھا۔ امریکہ آنے سے پہلے وہ کراچی کے ایک سکول میں پڑھا رہا تھا۔ اس کا خواب تھا کہ اس کے وطن کے تمام بچے معیاری تعلیم حاصل کریں۔ ''غریب بچوں کی تعلیم صرف پانچ جماعتوں تک محدود کیوں ہے۔ انہیں دوسروں کی طرح پڑھنے کے مساوی مواقع کیوں میسر نہیں آتے۔ ان کی رسائی اعلیٰ تعلیم تک کیوں نہیں ہوتی۔ کتنے آئین سٹائن کتنے چرچل رستے میں ہی کھو جاتے ہیں۔'' عامر کی باتوں سے مجھے ایک بھولی بسری کہانی یاد آنے لگی۔ یہ کہانی عبدل اور راشد کی کہانی ہے جو کچھ عرصہ پہلے کسی اخبار میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی ان ڈیڑھ کروڑ پاکستانی بچوں کی کہانی بھی ہے جن کے پاس جوتا ہے نہ کپڑا، قلم ہے نہ دوات۔ جو سکول کا راستہ تک نہیں دیکھ پاتے۔ عبدل اور راشد۔

5.10۔ عبدل اور راشد

عبدل اور راشد۔ اس علامتی کہانی کے دو کردار ہیں۔ ان دونوں نے پاکستان میں جنم لیا۔ ''عبدل'' ایک خانہ بدوش خاندان کا بچہ ہے جو کراچی سے سات سو کلومیٹر دور ایک گاؤں کے قریب رہتا ہے جب کہ راشد کا تعلق کراچی کے ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ان دونوں بچوں میں سے کوئی بھی اس بات کا ذمہ دار نہیں کہ اس نے کہاں جنم لیا۔ ان کے والدین کی آمدنی اور تعلیم، ان کا شہر اور دیہات سے رشتہ۔ یہاں تک کہ وہ کس صنف سے تعلق رکھتے ہیں ان سب کے تعین میں ان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ تاہم یہ چیزیں ان کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کریں گی۔ یہ امکان سات فیصد سے بھی زیادہ ہے کہ عبدل اپنی زندگی کے پہلے سال میں ہی موت کا شکار ہو جائے۔ جب کہ راشد کی زندگی میں ایسے کسی سانحہ کا امکان صرف تین فیصد ہے۔ اگر

وہ دونوں بچپن کی حدود سے نکل گئے تو عبدل پچاس سال اور راشد ستر سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ راشد کم از کم بارہ سال تک تو سکول ضرور جائے گا لیکن عبدل کے لئے یہ مدت تین سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ راشد ایک آرام دہ اور خوشگوار زندگی گذارے گا جب کہ عبدل کو نہ تو پینے کے لئے صاف پانی ملے گا اور نہ ہی اس کے گھر میں نکاسی آب کی سہولت کا امکان نظر آتا ہے۔

یہ دو بچے ایک ہی ملک میں پیدا ہوئے لیکن ان دونوں کی زندگی' ایک دوسرے سے بہت مختلف انداز میں گذرے گی۔ دوردراز علاقے میں جنم لینا' تعلیم تک رسائی نہ ہونا' ماں باپ کی کم مائیگی' جہالت' کسمپرسی۔ یہ اور اس طرح کی کئی اور محرومیاں عبدل کو غربت میں دھکیلتی رہیں گی۔ جب کہ اس کے ہم وطن راشد کا مستقبل نسبتاً روشن ہے۔ اسے تعلیم کے بعد ملازمت مل سکتی ہے۔ اگر وہ کاروبار کی طرف مائل ہوا تو بنک اسے سرمایہ بھی فراہم کردے گا کیونکہ اس کے خاندان کے پاس کچھ اثاثہ جات موجود ہیں۔ عبدل خواہ کتنا ہی ہونہار' یا ذہین ہو' اسے نہ تو کہیں ملازمت مل سکتی ہے اور نہ ہی کوئی بنک اس پر اعتبار کرنے کے لئے تیار ہوگا۔ عبدل کا خاندانی پسِ منظر اسکے راستے میں رکاوٹ بنتا رہے گا۔ ایک ہی ملک میں پیدا ہونے والے ان دونوں بچوں کی زندگی دو الگ الگ دھاروں میں بہتی رہے گی۔ نسل در نسل۔ نجانے کب تک؟

مصنف نے اس کہانی کو اچانک ایک اور رخ دے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جس دن پاکستان میں عبدل اور راشد نے جنم لیا اسی دن یورپ کے ایک ملک سویڈن میں بھی ایک بچے نے آنکھ کھولی۔ یہ بچہ اکیاسی سال کی عمر تک زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ عمر راشد سے بارہ سال اور عبدل سے تیس سال زائد ہے۔ عمر کی اس طوالت سے کہیں زیادہ اہمیت اس شے کی ہے کہ یہ عمر گذرتی کس طرح ہے۔ پاکستان کے ایک پسماندہ گاؤں میں گذرنے والی زندگی' کراچی کی ایک درمیانے درجے کی آبادی اور سویڈن کے انتہائی ترقی یافتہ شہر میں گذرنے والی زندگی کبھی یکساں نہیں ہوسکتی۔ سویڈن میں جنم لینے والے ولیم کو دنیا کا ہر شہر خوش آمدید کہے گا۔ کیسے کیسے سکول اس کی صلاحیت کو نکھاریں گے۔ کتنے ہی ایسے شعبے ہیں جن میں ولیم اپنے جوہر دکھا سکتا ہے۔ شاید وہ اپنے ملک میں کوئی بڑا مقام حاصل کرلے۔ عبدل کے پاس اپنے بچوں کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہوگا جب کہ ولیم اپنے ترکہ میں دولت کا ایک ڈھیر چھوڑ کے جائے گا۔ ان تین بچوں کی درمیان یہ تقابل کیا کہتا ہے؟ یہی کہ مواقع نہ ملنے کی وجہ سے غربت نسل در نسل سفر کرتی ہے۔ دنیا بھر کے عبدل صرف اسی

لئے غربت کا شکار ہیں کہ ان کے پاس وہ مواقع نہیں جو انہیں آگے بڑھنے میں مدد دے سکیں۔ ایک ہی دن جنم لینے والے یہ تینوں بچے جن راستوں پر چلیں گے وہ راستے بھی ایک جیسے نہیں۔ عبدل کے راستے میں اتنی رکاوٹیں ہیں کہ انہیں عبور کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ راشد اور ولیم کے راستے میں یہ رکاوٹیں ہوتیں تو وہ بھی چیتھڑوں میں ملبوس زندگی گذارتے۔

نسل، قومیت، جنس، رنگ اور سماجی رتبہ۔ شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب! ترقی ان سب سے منسلک ہے۔ عبدل اپنے کمال تک نہ پہنچ سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مواقع کی غیر مساوی تقسیم ہے۔ لوگ اس لئے غریب نہیں کہ ان میں صلاحیت کی کمی ہے۔ لوگ اس لئے غریب ہیں کہ ہم انہیں مواقع نہیں دیتے۔ یہی باتیں اٹھارہویں انٹرنیشنل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں زیر بحث آئیں۔ جب تک ہم تعلیم، صحت اور روزگار کی سہولت ہر خاص و عام کو فراہم نہیں کریں گے اس وقت تک ایک خوبصورت دنیا کی تعمیر کا خواب پورا نہیں ہوگا۔ کیمبرج کی گلیوں میں گھومتے ہوئے بہت وقت بیت گیا۔ کیمبرج ایک خوبصورت اور پُرسکون قصبہ ہے۔ اس کے اردگرد بکھرا ہوا بوسٹن اتنا پُرسکون نہیں۔ بوسٹن میں غربت بھی ہے اور جرم بھی......میلکم ایکس کا بچپن اسی شہر کی جرم آلود گلیوں میں گذرا۔ ہارورڈ، کیمبرج اور بوسٹن......ان شہروں میں بھی عبدل، راشد اور ولیم جیسی تقسیم موجود ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اورالمیہ ہے۔ اس نظام میں دولت اور غربت کو بغل گیر ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ عامر نے خدا حافظ کہا اور ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیکر ہال لوٹ آئے۔

5.11۔ ہمیں مؤاخات کی ضرورت ہے

بیکر ہال کی آرام دہ خواب گاہ۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ کئی بار ہم خود سونا نہیں چاہتے اور کئی بار کوئی اور سونے نہیں دیتا۔ مجھے ایک کہانی یاد آنے لگی۔ بوسٹن سے بہت دور ایک نیم تاریک شہر کی نیم تاریک گلیاں۔ ان گلیوں میں رہنے والی ایک بہادر عورت جس کی یاد کسی روشن ستارے سے کم نہیں۔

بشریٰ نامی اس عورت کا تین مرلے کا اپنا گھر ہے۔ جہاں وہ اسکا میاں اور بچے، سب مل جل کر رہتے تھے۔ خوش و خرم۔ اس کا خاوند سبزی منڈی میں کام کرتا اور دس، پندرہ ہزار ہر مہینہ کما لیتا۔ بچے سکول جاتے اور

وہ گھر کا کام کاج سنبھالتی۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کا شمار محلے کے خوشحال گھرانوں میں ہوتا' پھر اچانک ایک روز اس کے میاں پہ فالج کا حملہ ہوا۔ فالج کے بعد اس کا نچلا دھڑ مکمل بے کار ہو گیا۔ نہ وہ چل پھر سکتا نہ اٹھ سکتا تھا۔ گھر میں جو کچھ تھا وہ علاج پہ لگ گیا۔ صرف دو کمروں کا مکان باقی رہ گیا۔ کوئی رشتہ دار ساتھ دینے کے قابل نہ تھا۔ وہ خود بھی پڑھی لکھی نہ تھی کہ کہیں نوکری کر سکتی۔ بہت سوچا' بھاگ دوڑ بھی کی لیکن کوئی بات نہ بنی۔ کھانا' پینا' خاوند کی ادویات گھر کا بل۔ وہ کہاں جائے' کس کے دَر پہ دستک دے۔ بے بسی اور محرومی نے اسے اک دشتِ بے کراں میں لا پھینکا۔ اسی کش مکش میں وہ اخوت کے پاس پہنچی۔ وہ دفتر میں بیٹھ کر ان لوگوں کو دیکھتی رہی جو وہاں قرضہ لینے آتے اور پھر اسے بھی راستہ نظر آ گیا۔ پندرہ ہزار کا قرضہ' جس میں سے آٹھ ہزار کی ریڑھی اور سات ہزار کی سبزی' پھل اور ترازو۔ یہ سب کچھ اسے سبزی منڈی سے مل گیا۔ اب وہ ہر روز منڈی سے کچھ سبزی' کچھ پھل لاتی ہے انہیں ریڑھی پہ رکھتی ہے اور پھر اپنے خاوند کو ریڑھی پہ سوار کر کے اس ریڑھی کو گھر کے پاس واقع بازار میں لے جاتی ہے۔ باقی کام خاوند کرتا ہے۔ اس کا نچلا دھڑ معذور ہے تو کیا ہوا' ہاتھ تو سلامت ہیں۔ وہ ریڑھی پہ بیٹھے بیٹھے سبزی اور پھل بیچتا ہے۔ سہ پہر تک ریڑھی خالی ہو جاتی ہے۔ بشریٰ واپس آ کر ریڑھی دھکیلتی ہوئی گھر لے جاتی ہے۔ ہر روز پانچ سے سات سو روپے بچ جاتے ہیں۔ دو' تین ماہ کے اندر ہی سارے معاملات بہتر ہونے لگے۔ بچے پھر سے سکول پہنچ گئے۔ ادویات بھی مل گئیں۔ گھر کا خرچہ بھی نکلنے لگا۔ وہ ہر روز جب معذور خاوند کو ریڑھی پر بٹھا کر باہر نکلتی ہے تو ایک نیا عزم اس کے ہمرکاب ہوتا ہے۔ اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اسے یقین ہے کہ ایک روز اس کے خاوند کا علاج بھی ہو جائے گا۔ ''اب مجھے راستہ مل گیا ہے۔'' اس کا اعتماد اور حوصلہ قابلِ تعریف تھا۔

زندگی کی حقیقت سے کشید کی ہوئی یہ کہانی۔ ایسی کہانیاں ہر گلی محلے میں بکھری پڑی ہیں۔ افسوس! ہم کہانیاں پڑھتے ہی نہیں۔ ہم جانتے ہی نہیں کہ کوئی کتنا مجبور ہے۔ شاید وہ وقت بہت دور نہیں جب ہم سے پوچھا جائے گا کہ ہمارا ہمسایہ کس حال میں تھا۔ خوشحال بستیوں کے ساتھ جو کچی بستی تھی وہاں زندگی کیسے بسر ہو رہی تھی۔ بوسٹن شہر سے بہت دور نیم تاریک شہر کی نیم تاریک گلیاں۔ ان گلیوں میں رہنے والی ایک بہادر عورت

جس کی یاد کسی روشن ستارے سے کم نہیں۔ رات کا باقی حصہ اتنا بوجھل نہ تھا۔

5.12۔ موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے

صبح ہوئی۔ ہارورڈ بزنس سکول میں یہ پانچواں روز تھا۔ ہر روز کوئی نیا موضوع، کوئی نئی کہانی۔ لوگ سمجھنا چاہتے تھے کہ غربت کیسے کم ہو گی۔ بہترین تجربے کے حامل لوگ۔ ان کا خلوص اور دیانتداری قابلِ تعریف تھی۔ ان کے علم اور سمجھ بوجھ پہ کسی کو شک نہیں۔ مائیکل چو، اور رانجن کمال کے استاد تھے۔ انہوں نے اس سوچ کو ایک مخصوص انداز میں آگے بڑھنے دیا۔ آخری روز کی گفتگو بہت خوبصورت تھی۔ پر اثر، پر درد۔ ''کیا ہم وہ دن دیکھ پائیں گے جب غربت اور افلاس کا خاتمہ ہو چکا ہو...... پھول تو سب کیلئے ہونے چاہئیں...... خوشبو بھی سب کی ہے...... یہ ہوائیں، یہ چاند، یہ ستارے...... ہتھیار نہیں پھینکنے، شکست نہیں ماننی...... انسانیت کی راہ میں کانٹے ضرور ہیں لیکن گھبرانا نہیں۔ ان کانٹوں کو سمیٹنا ہی زندگی ہے''۔ کہتے ہیں ایک بار کچھ لوگ سفر کے دوران ایک سرنگ سے گذرے۔ رات کا وقت اور اندھیرا۔ سرنگ میں ہر طرف نوکیلے کنکر بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ان کے بعد کوئی اور یہاں سے گذرا تو اسے ان کنکروں سے تکلیف ہو گی۔ یہ سوچ کر انہوں نے کنکر اٹھانا شروع کر دیئے۔ سرنگ ختم ہوئی۔ لوگ باہر نکلے اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ انہوں نے جو کنکر اٹھائے وہ کنکر نہیں بلکہ ہیرے تھے۔ جنہوں نے زیادہ اٹھائے وہ بہت خوش ہوئے اور جنہوں نے کم اٹھائے وہ افسردہ۔ جنہوں نے کچھ بھی نہ اٹھائے وہ اور بھی غمگین ہونے لگے۔ یہ دنیا بھی ایسے ہی ہے۔ کچھ لوگ ہر طرف بکھرے دکھ کے کنکر اٹھا کر اپنے دامن میں ڈال لیتے ہیں۔ اس بات سے بے خبر کہ یہ کنکر قیامت کے روز ہیرے بن جائیں گے۔ جنہوں نے زیادہ اٹھائے وہ خوش ہوں گے اور جن کے دامن میں کم ہوئے وہ افسردہ ۔ مجھے لگا کانفرنس کے شرکاء کی جھولیاں ان کنکروں سے بھری ہوئی ہیں۔ تیز، نوکیلے اور خاردار کنکر اور پھریوں لگا جیسے بہت جلد یہ کنکر ہیرے جواہرات بن جائیں گے۔ قیامت کے شور میں ایک آواز بلند ہو گی............ ''ان لوگوں نے دنیا میں میرے بندوں کے دکھ سمیٹے۔ آج قیامت کے روز میں ان کے دکھ سمیٹوں گا''۔

5.13۔ عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

ہیرے اور جواہرات۔

اس حکایت سے مجھے بہت سے اور ہیرے اور جواہرات بھی یاد آئے۔ یہ ہیرے اور جواہرات اخوت

کے گمنام سپاہی ہیں۔ان کے سینے پہ کوئی تمغہ آویزاں نہیں ہوتا۔ان پہ کوئی کہانی نہیں بنتی' کوئی کتاب نہیں لکھی جاتی۔وہ صبح' شام۔رات' دن۔موسم کی سختیوں سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔وہ کام کو عبادت سمجھتے ہیں۔انہیں نہ تو شہرت کی پروا ہے نہ نام کی۔ان کا جذبہ'ان کی محنت'ان کی وفا...... یہ سب کسی اور دنیا کی کہانی ہے۔محمد اسلم پہلے دن ملازمت کے لیے آیا تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔اس نے جس والہانہ جذبے کا مظاہرہ کیا وہ ہم سب کے لئے حیرت کا باعث ہے۔پہلے وہ لون افسر تھا ترقی کر کے برانچ منیجر بن گیا۔بطور لون افسر اس کی کارکردگی مثالی تھی۔بطور برانچ منیجر اس سے بھی بڑھ گئی۔وہ ایک بہترین منتظم ہے۔یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کے پاس آئے اور پھر اخوت کی محبت میں گرفتار نہ ہو۔خوش مزاج' خوش اخلاق' خوش گفتار۔اس کی تعلیم میٹرک ہے لیکن ایک منتظم کیلئے جو بھی خصوصیات درکار ہیں وہ اس کے اندر بخوبی موجود ہیں۔یہ سب کچھ اس نے اپنے تجربے سے سیکھا ہے۔اچھی سوچ' اچھا عمل' اچھی گفتگو۔وقت کو کیسے استعمال کرنا ہے۔مسائل کو کیسے سلجھانا ہے۔لوگوں کو ساتھ لے کے کیسے چلنا ہے۔محمد اسلم وعظ ونصیحت کے انبار لگانے پہ یقین نہیں رکھتا۔وہ ایک روحانی آدمی ہے۔میں نے ایک بار اس سے کہا کہ محنت تو بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن تمہاری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔تمہاری کامیابی کا راز کیا ہے۔میں ''درود شریف'' پڑھتا ہوں۔محمد اسلم نے پوری سچائی کے ساتھ جواب دیا۔''سنا ہے علامہ اقبالؒ نے ایک کروڑ بار درود شریف پڑھا تو وہ شاعر سے شاعرِ مشرق بن گئے''اس نے جواب دیا۔''تاثیر صرف محنت سے نہیں۔تاثیر تو کرم اور نظر سے آتی ہے۔درود شریف پڑھنے کے بعد جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہ کام ہو جاتا ہے۔سارا دن مجھے ایک عجیب سی کیفیت گھیرے میں لیے رکھتی ہے۔نہ کوئی خوف' نہ بے چینی۔'' محمد اسلم ہر وقت درود شریف کا ورد کرتا ہے۔میں اسے دیکھتا ہوں تو منیر نیازی کا یہ شعر یاد آنے لگتا ہے:

میں کہ اک برباد ہوں آباد رکھتا ہے مجھے
دیر تک اسمِ محمد شاد رکھتا ہے مجھے

اخوت میں محمد اسلم کی طرح کے کئی لوگ ہیں۔ایسے ہی ایک اور شخص کا نام ندیم ڈیوڈ ہے۔ندیم ڈیوڈ بہت اجلے کردار کا مالک ہے۔نہ اس نے کبھی جھوٹ بولا' نہ کسی سے جھگڑا کیا' نہ کسی کا دل دکھایا' نہ کسی کا حق

مارا۔سکول نہ جانے کے باوجود وہ حسنِ تربیت سے مالا مال ہو گیا۔ کیسے؟ یہ بھید اللہ ہی جانتا ہے۔اس کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں فادر جوزف نے دیا جس کے گرجا گھر میں اخوت کی تیسری برانچ قائم ہوئی تھی۔ فادر نے کہا یہ بہت ہیرا آدمی ہے لیکن وہ اس سے بھی بڑھ کر نکلا۔شاید فادر نے تعریف میں بخل سے کام لیا تھا۔وہ ایسا آدمی ہے جسے کوئی غرض اور طلب ہی نہیں۔ جو تنخواہ لیتے ہوئے بھی جھجکنے لگتا ہے۔ٹوٹے پھوٹے گھر' خستہ حال گلیاں' کیچڑ سے اٹے ہوئے محلے' جہاں مکھیوں' مچھروں' غلاظت اور بدبو کے سوا اور کیا ہے۔ندیم ڈیوڈ۔قینچی چپل پہن کے ان خارزار راستوں پہ سفر کرتا رہا۔جب وہ رات کو گھر پہنچتا تو اس کی ایڑیوں سے خون رستا اور وہ درد کی وجہ سے ساری رات سو نہ سکتا لیکن اگلی صبح زخموں پر پٹی باندھ کر پھر دفتر پہنچ جاتا۔کوئی نہیں جو اس دردمندی سے لوگوں کی خدمت کرے۔ وہ مشکلوں کو دیکھ کے خوش ہوتا ہے۔اس نے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا۔میں نے اسے کہا کہ تم اخوت کیلئے اتنا پیدل چلتے ہو موٹر سائیکل کیوں نہیں لے لیتے۔وہ مسکرانے لگا۔ندیم کو اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ اخوت کے پاس ابھی اتنے وسائل نہیں کہ موٹر سائیکل خرید سکے۔گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ' لُو اور پھر حبس۔برسات میں ہر طرف برستا ہوا پانی۔ندیم ڈیوڈ پیدل چلتا رہا۔اس کے قدموں نے شہر کی سڑکوں پہ ایثار کے انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں۔رزقِ حلال اگر ہے' تو یہی ہے۔بہت دنوں بعد اس نے ایک روز سائیکل خرید لیا۔بے حد اصرار کے بعد۔بے لوث خدمت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو گی۔ندیم ڈیوڈ آج کل اخوت کی ایک برانچ میں منیجر ہے۔اس کی برانچ لاہور کی مثالی برانچوں میں شمار ہوتی ہے۔تعلیم نہیں تو کیا' درد بھی تو انسان کو کامیابی کے سارے گر سکھا دیتا ہے۔ندیم ڈیوڈ ایک دیوانہ ہے۔اس کے دیوانہ پن کا نام اخوت ہے۔وہ اب تک آٹھ ہزار گھرانوں کی مدد کر چکا ہے۔اس کے دامن میں ان گنت لوگوں کے آنسو جمع ہیں۔یہ آنسو نہیں موتی ہیں۔ہیرے جواہرات سے بڑھ کر۔مجھے یقین ہے کہ ایک روز جب اللہ کا دربار لگے گا تو ان موتیوں کی چمک لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دے گی۔

5.14۔ایک اور ڈیوڈ

ندیم ڈیوڈ کی اس کہانی سے مجھے ایک اور ڈیوڈ یاد آتا ہے۔اس کا نام مائیکل ڈیوڈ تھا۔مائیکل مجھے واشنگٹن کے مشہور چرچ نیشنل کیتھڈرل کی سیڑھیوں پہ ملا۔وہ لوگوں میں چاکلیٹ بانٹ رہا تھا۔مجھے بھی اس نے کچھ

چاکلیٹ دیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں قریب ہی واقع امیریکن یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ اس نے چاکلیٹ کا ایک اور لفافہ نکالا اور مجھ سے ملنے کا وعدہ کرلیا۔ کچھ دنوں بعد وہ واقعی یونیورسٹی چلا آیا اور ہماری دوستی ہونے لگی۔ وہ جب بھی کیتھڈرل آتا مجھ سے ملنے یونیورسٹی پہنچ جاتا۔ اس نے مجھے واشنگٹن شہر کی اندرونی کہانیاں بھی سنائیں۔ جرم، قتل وغارت اور نشہ۔ اس کی اپنی کہانی بھی ایسی ہی تھی۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا آیا کہ اس کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ لمحہ ہر شخص کی زندگی میں آتا ہے لیکن لوگ اس کو پہچان نہیں پاتے اور پھر ساری زندگی رائیگاں چلی جاتی ہے...... مائیکل کہنے لگا یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بدچلن، بدمعاش اور آوارہ تھا۔ بے کار، بے گھر، بے مقصد۔ نشے میں دھت رہنا اور جرم کرنا یہی میرا معمول تھا۔ وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ میں بھوک کے عالم میں ادھر ادھر دھکے کھاتا شہر کے سب سے بڑے چرچ جا پہنچا کہ شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔ میرے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی اور میں اپنے قدموں پہ کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا۔ فادر نے اس حالت میں مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً میں نے وہ رات چرچ کی سیڑھیوں پہ گذار دی۔ اس انکار نے مجھے بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیا۔ کیا مجھے یہاں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ صبح ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں کوئی جرم نہ کروں گا۔ کوئی گناہ نہ کروں گا۔ میں نے بھیک سے بھی تائب ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے لگا یہ بھی گناہ ہے۔ بس وہ ایک لمحہ جب فادر نے مجھے بے گانگی سے دیکھا اور میرے اندر تبدیلی کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں وہاں سے اٹھا اور ایک کلینک چلا گیا۔ میری مضبوط قوت ارادی کام آئی اور میں نے نشہ کی لعنت سے نجات پالی۔ میں خود ہی اپنا مسیحا تھا۔ نئی زندگی شروع کرنے کیلئے میں نے کئی جگہ نوکری کی درخواست دی۔ ایک روز ایک ہوٹل میں کام مل گیا۔ با قاعدہ تنخواہ۔ کھانا پینا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ اسی دوران ایک روز ایک بہت عجیب سا واقعہ ہوا۔ ہوٹل میں اس روز کوئی تقریب تھی لیکن مہمان بہت کم آئے۔ بہت سا کھانا بچ گیا۔ میرے منیجر کے لیے مشکل ہوگئی کہ وہ اس کھانے کا کیا کرے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ کوئی حل بتاؤ۔ مجھے اپنے نشہ کرنے والے، بے گھر دوست یاد آنے لگے۔ میں نے کہا میں یہ کھانا ایک گھنٹے میں ختم کرسکتا ہوں۔ منیجر ہنسنے لگا لیکن جب میں نے اپنا آئیڈیا بتایا تو وہ راضی ہوگیا۔ اس نے مجھے ہوٹل کا ٹرک دیا اور میں نے سارا کھانا اس میں رکھوا دیا۔ دو تین سو لوگوں کا کھانا تو ہوگا۔ میں شہر کے مختلف پارکوں میں، کونے کھدروں میں ٹرک بھگاتا رہا۔ مجھے علم تھا کہ اس کھانے کے مستحق کہاں کہاں رہتے ہیں۔ تین تین چار چار لوگوں کا کھانا ایک ایک شخص کے حوالے کیا۔

میرے پرانے دوست۔ان کے چہروں پہ کھلی ہوئی مسکراہٹ مجھے عجیب سی خوشی دے رہی تھی۔ میں نے ان کی تصویریں بھی لیں۔ واپس پہنچ کر یہ تصویریں میں نے منیجر کو دکھائیں تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ ایک دردمند انسان تھا۔اس نے یہ بات انتظامیہ کے دوسرے لوگوں سے کی اور سب نے فیصلہ کیا کہ بچے کھچے کھانے کو کوڑے میں پھینکنے کی بجائے اسی طرح استعمال میں لائیں گے۔ واشنگٹن میں اس طرح کے اور بھی بہت سے ہوٹل تھے۔انہوں نے سب سے رابطہ کیا۔ دس ہوٹلز نے اس کام میں شامل ہونے کی ہامی بھر لی۔ یوں بے گھر اور بے سہارا لوگوں کے لیے کھانے کا مستقل بندوبست ہو گیا۔ اس پورے پراجیکٹ کا نام Michael David's Dinner Party رکھا گیا۔ گویا یہ کام میرے ہی نام سے منسوب ہو گیا۔ جو آدمی کل تک خود بھوکا سوتا تھا اس کے نام سے سیکڑوں لوگ کھانا کھانے لگے۔ یہ سب خداوند کا انعام تھا۔ اب ہر روز رات کو واشنگٹن کے ہوٹلوں سے ٹرک نکلتے ہیں اور ان سیکڑوں لوگوں کو کھانا پہنچ جاتا ہے جو نشہ کے عالم میں کھوئے رہتے تھے۔ کبھی میں بھی انہی جیسا تھا لیکن خداوند نے میری رہنمائی کی اور مجھے راستہ مل گیا۔ اسی چرچ کی سیڑھیوں پر جہاں میں ساری رات ٹھٹھرتا رہا میں نے بے شمار لوگوں کو کھانا پیش کیا ہے۔ اسی پادری کے سامنے جس نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ فادر نے بے شک پناہ نہ دی لیکن خداوند نے پناہ دے دی۔ خداوند تو یہ کہتا ہے کہ جو گناہ گار ہیں انہیں میرے قریب لاؤ کہ انہیں میری زیادہ ضرورت ہے۔ وہ سرد یخ بستہ رات نہ ہوتی تو شاید میں ابھی تک بدچلن، بدمعاش اور آوارہ ہوتا۔ نشے میں دھت رہتا۔ وارداتیں کرتا۔ کسے خبر گناہ کی اندھی گلی میں کب راستہ مل جائے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ

"Every Saint has a past and every sinner has a future."

کب سورج نکل آئے، کب بارش ہونے لگے۔ وہ بس ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جس کے بعد یہ سب بدل جاتا ہے۔ ڈیوڈ، مارٹن لوتھر کنگ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ کنگ کی شہرہ آفاق تقریر I have a Dream اسے زبانی یاد تھی۔ جب وہ کنگ کے لہجے میں ڈوب کر یہ تقریر سناتا تو یوں لگتا جیسے اصل میں مارٹن لوتھر ہمارے روبرو موجود ہو۔ روزا پارکس سے میرا تعارف بھی مائیکل کے توسط سے ہوا۔اس کے نزدیک روزا پارکس جرأت کی سب سے بڑی علامت تھی۔ ندیم ڈیوڈ سے لے کر مائیکل ڈیوڈ تک۔ نیکی پر کسی کا اجارہ نہیں۔ خدا تو سب کا ہے۔ ڈیوڈ جیسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے کچھ لوگ اور یاد آتے ہیں۔ مارٹن لوتھر کنگ، میلکم ایکس، محمد علی...... غربت میں جنم لینے والے یہ لوگ شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ تینوں سیاہ فام، تینوں باغی۔ ان تینوں کو بھی مذہب نے

پناہ دی۔ محمد علی سے کسی نے پوچھا تم تھکنے سے پہلے کتنا دوڑ لیتے ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ میں تو گنتی شروع اس وقت کرتا ہوں جب تھک کے چور ہو جاؤں۔ وہی لمحہ میرے امتحان کا لمحہ ہوتا ہے۔ محمد علی سچ کہتا ہے۔ یہی لمحہ معمولی اور غیر معمولی انسان میں حد فاصل ہے۔ مارٹن لوتھر، میلکم ایکس، محمد علی اور مائیکل ڈیوڈ۔

ان سب کی کامیابی کا کیا گُر تھا۔ ذہانت، محنت، عزم ......شاید......لیکن مجھے ان میں جو قدرِ مشترک دکھائی دیتی ہے وہ ان کی سچائی ہے......انہوں نے سچ کو ڈھونڈا اور پھر وہ سچ ان کی رگوں میں لہو بن کے دوڑ نے لگا۔ سچ کو پانا ہی کافی نہیں سچ کو حرزِ جاں بنانا بھی اہم ہے۔ ہم سچ تک پہنچ جاتے ہیں لیکن سچ کو اختیار نہیں کرتے۔ ہم سچ کیلئے موت قبول کر لیتے ہیں لیکن اس کیلئے زندہ نہیں رہتے۔

5.15۔ یہ رتبہء بلند ملا جس کو مل گیا

مارٹن لوتھر، میلکم ایکس، محمد علی اور مائیکل ڈیوڈ!

امریکی معاشرہ عجیب طرح کی انتہاؤں کا شکار ہے۔ ایک طرف دولت کے انبار ہیں اور دوسری طرف ناقابلِ یقین غربت۔ امکانات کی فراوانی کا یہ عالم کہ بل گیٹس نامی ایک کالج ڈراپ آؤٹ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کا سب سے امیر شخص بن جاتا ہے اور پھر جب دولت سے جی بھرتا ہے تو وہ اسے لوگوں کو تحفے میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ شخص دولت کما کے اتنا خوش نہیں ہوا جتنا دولت تقسیم کر کے خوش ہوا۔ اسی طرح کا ایک اور شخص، وارن بفٹ بھی ہے جس نے اپنی نوے فیصد دولت نیکی کے کاموں کیلئے وقف کر دی۔ سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا جذبہ تھا جس نے اسے تیس بلین ڈالر لوگوں میں بانٹنے پہ آمادہ کیا۔ اسکا جواب تھا:

My gift is nothing...... I can have everything I need with less than one percent of my wealth... I am just giving back surplus claims that have no value to me but can do a lot for others...

''اگر ہم سب اسی طرح سوچنے لگیں تو یہ ایک مختلف دنیا کا آغاز ہوگا۔'' کلنٹن، وارن بفٹ کو اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اسی طرح کا سوال پوچھنے پر کرِس ہان نامی ایک اور امیر شخص نے اس سے کہا:

Beyond a certain point, which we'd reached, money has no further

value. It can't bring happiness, but it can save or transform many lives.

امریکہ میں ایثار کی ایسی کئی کہانیاں نظر آتی ہیں لیکن دینے کی لذت ہر شخص کے مقدر میں نہیں۔ نہ ہی یہ اعزاز کسی ایک قوم کیلئے مخصوص ہے۔ امریکہ خوشحال کیوں ہے؟ شاید اس لیے کہ وہاں لوگ دینے سے گریز نہیں کرتے۔ راک فیلر، اینڈریو کارنیگی، بل گیٹس، وارن بفٹ ...... یہ لوگ امریکی تہذیب کا سنگھار ہیں۔ ہر امریکی صدر وائٹ ہاؤس سے نکلنے کے بعد سوشل انٹرپرینیور بننا چاہتا ہے۔ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کو نوبل پرائز کا حقدار سمجھا گیا۔ بطور امریکی صدر نہیں بلکہ بطور ایک سوشل انٹرپرینیور۔ بل کلنٹن ایک کامیاب صدر تھا، لیکن غربت کو مٹانے کیلئے اس کی جدوجہد کا اصل آغاز اس کے دورِ صدارت کے بعد ہوتا ہے۔ اس کی مشہور کتاب "Giving" ایثار اور رضاکاریت کا ایک لازوال پیغام ہے۔ اس کتاب میں وہ صرف ''دینے'' کی بات کرتا ہے۔ دولت، وقت، صلاحیت، آئیڈیاز...... اس کے نزدیک ہم میں سے ہر شخص دینے کی راہ پر چل نکلے تو یہ محرومیاں کم ہوسکتی ہیں۔ کتاب کے پہلے باب کا اختتام مارٹن لوتھر کنگ کے اس خوبصورت پیغام پہ ہوتا ہے "Everyone can be great because everyone can serve"............ گویا انسانی عظمت کا ہر راستہ خدمت کی دلکش وادیوں سے ہو کے گذرتا ہے۔ بل گیٹس اور وارن بفٹ نے اپنی دولت لوگوں میں بانٹ دی۔ اگر وہ نہ بھی بانٹتے تو بھی یہ دولت یہیں رہ جاتی۔ وہ جو قرآن نے کہا کہ جو شخص دنیاوی صلے کا طالب ہے وہ جان لے کہ اللہ کے پاس دنیا کا صلہ بھی ہے اور آخرت کا ثواب بھی (النساء ۱۳۴)۔ وارن بفٹ نے ایک بار بہت مشکل بات انتہائی سادگی سے کہہ دی:

I was born in the right country at the right time, and my work is disproportionately rewarded compared to teachers and soliders.

ہم کہاں جنم لیتے ہیں اس پر ہمارا اختیار نہیں لیکن ہم دنیا میں کیا چھوڑ کے جاتے ہیں اس پر ہمارا اختیار ضرور ہے۔ امریکہ میں بیس لاکھ سے زیادہ غیر سرکاری ادارے خدمت کے کاموں میں مگن ہیں۔ ہر سال 600 بلین ڈالرز کے عطیات دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان کا منظر بھی کم خوش نما نہیں...... اخوت، شوکت خانم، ایدھی، ایل آر بی ٹی، الشفاء، چھیپہ، فاطمید، سہارا، امین مکتب، حجاز ہسپتال، ٹی سی ایف، مغل، ریڈ، کاوش، ٹی سی اے، فاؤنٹین ہاؤس...... یہ سب نام بھی ایثار کی ایسی ہی کہانی کے عنوان ہیں۔ جب تک یہ عنوان زندہ ہیں، انسانیت زندہ ہے...... دینے کی لذت ہر شخص کے مقدر میں نہیں اور نہ ہی یہ اعزاز کسی ایک قوم سے

مخصوص ہے لیکن باقی وہی لوگ اور قومیں رہتی ہیں جو ضرورت سے زائد رزق اللہ کی راہ میں دینے کی خواہش رکھتی ہوں۔

5.16۔اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر

ہر سفر کو بالآخر ختم ہونا ہے۔ہارورڈ سے واپسی کا دن آن پہنچا۔اس تمام عرصہ میں اخوت کی جس طرح پذیرائی ہوئی وہ ناقابلِ فراموش واقعہ تھا۔عمران سرور سے لے کر رومن اور ڈیوڈ تک۔لاء سکول سے فلیچر سکول۔ کم وِلسن سے مائیکل چُو۔عاصم خواجہ سے ترن کھنہ اور پھر لیڈر شپ پروگرام کے شرکاء، بزنس سکول کے درودیوار، دریائے چارلس کے کنارے پرندوں سے کھیلتی ہوئی دوشیزائیں اور پانی میں تیرتی خوبصورت رنگین کشتیاں۔کتنی ہی یادیں دل پہ نقش ہوگئیں۔زندگی کچھ بھی تو نہیں۔بس یادوں کا ایک حسین مرقع ہے:

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دلآویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

بظاہر یہ چند دن تھے لیکن ان کو وسعت دیں تو ایک طویل کہانی بن جائے گی۔الوداعی تقریب کے بعد لوگ رخصت ہونے لگے۔انہیں علم تھا کہ اب ملاقات کا امکان بے حد کم ہے۔یہ احساس ماحول کو افسردہ بنا رہا تھا۔چند ہی روز میں لوگوں کو ایک دوسرے سے انسیت سی ہوگئی۔ہم کتنی جلدی قریب آتے ہیں اور کتنی جلد ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں۔الوداعی ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔میں نے سامان صبح سے باندھ رکھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اگلا سفر جہاز کی بجائے ریل پہ کیا جائے۔امریکہ کا اصل حسن دیکھنا ہے تو واحد راستہ ریل کا سفر ہے۔سمندر، پہاڑ، جھیلیں، مرغزار، وادیاں، صحرا۔کہیں بستیاں، کہیں عمارتیں۔انسان نے زمین کی وسعتوں کو کس کس طرح سے زیر کیا۔میں نے ایک بار پورا ایک ماہ امریکہ کی ایک ریل میں گزارا۔واشنگٹن سے شکاگو۔وہاں سے وسکونسن، پورٹ لینڈ، کیلی فورنیا، ٹیکساس، فلوریڈا، میامی، نیویارک اور واپس واشنگٹن۔امریکہ کے گرد ایک دائرہ سا بنا اور اس میں پورا امریکہ سما گیا۔ہم ریل میں سوتے، وہیں کھانا کھاتے اور جس شہر میں کوئی دوست ہوتا وہاں اتر جاتے۔وہ ریل بھی بہت خوبصورت تھی۔نہ سونے میں کوئی مشکل، نہ چلنے پھرنے میں۔ٹی وی روم۔ریسٹورنٹ۔سٹڈی روم۔میرے ساتھ فرخ، جنید اور فرازین بھی

تھے۔ایک ماہ بعد جب ہم واپس پہنچے تو کئی ہزار کلومیٹر سفر طے کر چکے تھے۔

اگلے روز جب میں نے یونیورسٹی میں اس سفر کی روداد سنائی تو ساری کلاس حیرت زدہ رہ گئی۔ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس نے اپنے ملک کی اس قدر خاک چھانی ہو۔اپیرل کو تو یقین ہی نہ آتا تھا۔اس نے انگلیوں کا حلقہ بنایا' انگوٹھے پہ ٹھوڑی رکھی اور مجھے دیکھنے لگی۔اس کے چہرے پہ حیرت نے کتنے ہی نقوش بنا ڈالے۔حیرت حسن کو دوآتشہ بنا دیتی ہے۔میں نے سوچا اب بیس برس بعد ایسے طویل سفر کی مہلت نہیں لیکن بوسٹن سے نیویارک کا سفر ریل پہ ہی ہونا چاہیے۔قدیر کو فون کیا۔اس نے فوراً سیٹ بک کروا دی اور یوں میں نے بیکر ہال سے نکل کر ٹیکسی لی' سامان رکھا اور بوسٹن ریلوے سٹیشن پہنچ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ایک گھنٹے بعد ٹرین پہنچ گئی۔ایک اور خوبصورت سفر کا آغاز ہوا۔یہ ٹرین اتنی آرام دہ تو نہ تھی لیکن اس مختصر سفر کے لئے نہایت مناسب تھی۔میں نے سامان رکھا اور کھڑکی کے ساتھ ایک سیٹ پہ جا بیٹھا۔گاڑی سٹیشن سے نکلی اور پھر چند ہی منٹ میں شہر بھی پیچھے رہ گیا۔وسیع و عریض میدان' سبزہ اور پانی۔نیلا آسمان اور سمندر۔جہاں سمندر ختم ہوتا وہاں سے آسمان شروع ہو جاتا۔امریکہ کا اصل حسن روبرو تھا۔بہت دیر خلاؤں میں گھورنے اور پرانے سفر کو یاد کرنے کے بعد میں نے سمندر اور وسیع نیلے آسمان سے نگاہیں ہٹائیں۔نہ وہ پروفیسر' نہ یونیورسٹی کا وہ کمرہ جہاں میں سفر کی کہانی سنا رہا تھا' نہ اپیرل کا متحیر چہرہ:

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ میں رہا نہ وہ تو رہا جو رہی تو بے خبری رہی

اسی افق سے ایک اور افق طلوع ہوا۔پھر سے وہی خواب جس کا نام اخوت ہے۔بارہ سال پہلے جب یہ خواب دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا لیکن پھر اس خواب کے شجر پہ نئی کونپلیں کھل اٹھیں۔بشریٰ اعجاز کا خوبصورت کالم یاد آنے لگا:''اخوت آنے والے زمانے کا خواب ہے جسے ایک سرپھرا دیکھتا ہے۔بڑے خواب ہمیشہ ''سرپھروں'' کی آنکھوں پر ہی اترا کرتے ہیں'ان سے عقل والوں کو کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔جب بھی بڑے خواب کی بات ہو مجھے اقبالؒ یاد آتے ہیں' قائد یاد آتے ہیں اور سرسید احمد خان یاد آتے ہیں..........ڈاکٹر امجد ثاقب نے بھی اخوت کا خواب دیکھا۔عشق کی پہلی منزل کا پہلا باب' جنوں کے دشوار گزار راستے کا آغاز' انسانوں کو ان کی چھنی ہوئی فضلیت دلانے کی آرزو'ان کی عزتِ نفس کی بحالی کی کوشش......''۔بوسٹن سے نیویارک۔ٹرین کا یہ سفر پانچ

گھنٹوں پہ محیط تھا۔ میں اس دوران اسی خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ کسی نے کہا تھا کہ خواب وہی نہیں ہوتے جو سوتے ہوئے دیکھے جائیں۔ خواب تو اصل میں وہ ہیں جو سونے ہی نہ دیں۔ اخوت بھی اب ایسا ہی ایک خواب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ جستجو کرے۔ لیس الانسان الا ماسعیٰ۔

5.17۔ کوئی لوٹا دے میرے بیتے ہوئے دن

نیویارک کے ریلوے اسٹیشن پر فخر چٹھہ نے خوش آمدید کہا۔ لوگوں کا اژدہام۔ سیکڑوں نہیں شاید ہزاروں۔ یہ اسٹیشن بھی کسی سمندر سے کم نہیں۔ لیکن ہر لہر میں نظم وضبط۔ نیویارک میں ہمارا قیام بھی فخر چٹھہ کے گھر تھا۔ ہمارے رفیق کار انصر کا چھوٹا بھائی۔ انصر نے اس کے کان میں نجانے کیا جادو پھونکا کہ اس نے مہمان نوازی کی حد کر دی۔ نیویارک ریلوے اسٹیشن سے لے کر جہاں اس نے ہمیں ریسیو کیا' جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ تک جہاں اس نے الوداع کہا' وہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ اس کی بیگم اور دو خوبصورت بچے بھی ہمارے میزبانوں میں شامل تھے۔ پاکستانی کمیونٹی کا ڈنر' نیو جرسی کی دعوت' مین ہیٹن ول کالج کی پریزینٹیشن۔ فخر ہر جگہ ہمارے ساتھ گھومتا رہا۔ اس دوران اس نے بہت سے دوستوں سے بھی ملایا ان میں ذاکر نسیم بھی شامل ہیں جن کی کمپنی میں وہ کام کرتا ہے۔

ذاکر نسیم کا تعلق فیصل آباد کے ایک نواحی قصبے سے ہے۔ لیکن اب ان کا شمار نیویارک کی پاکستانی کمیونٹی کے سرکردہ افراد میں ہوتا ہے۔ ہم نے ایک روز دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا۔ کھانے کے دوران وہ دل کے داغ ٹٹولتے رہے۔ ''جب میں پاکستان سے روانہ ہوا تو وہاں زندگی مختلف تھی۔ ہم کم مائیگی کے باوجود غریب نہ تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کے دشمن۔ شاید وہ کوئی اور دنیا تھی' کوئی اور ملک۔ دھیما دھیما' متحمل مزاج' پرامن۔ مجھے اسی کی تلاش ہے''۔ ہمیں بھی اسی پاکستان کی تلاش ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ ترقی یافتہ اور پرامن لیکن امن کا تعلق انصاف سے ہے۔ معاشی اور سماجی انصاف سے۔ خوشحالی صرف چند گھروں تک محدود ہو تو امن نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم نے غربت اور جہالت سے جنگ نہ کی تو یہ خواب پورا نہیں ہوگا۔ ایسی ہی ایک ملاقات قیصر کے اہلِ خانہ سے بھی ہوئی۔ قیصر اخوت کا پرانا دوست ہے۔ ایک سال پہلے وہ امریکہ آ گیا اور نیویارک میں بھائیوں کے ساتھ ادویات کا بزنس کرنے لگا۔ نیویارک کی ایک جدید آبادی میں ان کے گھر میں ہونے والا ڈنر جس میں لذتِ کام ودہن کے سارے لوازمات موجود تھے۔ قیصر کے بڑے بھائی کی کہانی بھی

شب وروز جستجو کی کہانی ہے۔ساجد بھائی کی محنت نے ایک پورے گھرانے کونئی زندگی دے دی۔ان کے دل میں بھی درد کی وہی لہر تھی۔انہیں بھی اپنے کھوئے ہوئے پاکستان کی تلاش تھی۔امن' انصاف' خوشحالی۔نجانے یہ تلاش کب پوری ہوگی۔جب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کے مصطفیٰ زیدی کا یہ شعر کہا تو دل پہ کہیں چوٹ سی پڑی:

ایسی سونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں' اے تیرگیٔ صبح وطن

کھانے کے اختتام پر پاکستان اور اہل پاکستان کیلئے دعا بھی ہوئی.....مختار مسعود کے مطابق اچھے لوگ انعام کے طور پر ملتے ہیں اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔یا خدا! یہ قحط الرجال ختم ہو' بوندا باندی' بارش اور پھر جل تھل ہو جائے۔دل بجھے جاتے ہیں' اے تیرگیٔ صبح وطن۔

5.18۔نیویارک۔فیصلے یہاں نہیں ہوتے

اگلے تین روز نیویارک کیلئے تھے۔بروکلین' کوئینز' برونکس' نیوجرسی۔

نیویارک ڈاؤن ٹاؤن اور مین ہیٹن کی عمارتیں دیکھ کر انسان حیرت میں ڈوبنے لگتا ہے۔نیویارک کو دنیا کا فنانشل کیپیٹل کہتے ہیں۔یہاں کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے۔معیشت اور کاروبار کا عالمی مرکز...... پچھلے دو سو سال کے دوران امریکہ آنے والوں نے زیادہ تر نیویارک کا راستہ اختیار کیا۔بحر اوقیانوس کا ساحل' مجسمہء آزادی اور مین ہیٹن کی بلند و بالا عمارات ان لوگوں کو سب سے پہلے خوش آمدید کہتی ہیں۔نیویارک کی کہانی بہت زیادہ طویل نہیں۔تین سو سال پہلے یہاں ایک وسیع و عریض جنگل تھا۔بہار میں پھول کھلتے اور سردیوں میں برف کی چادر پڑی رہتی۔کبھی کبھی سمندر کو جوش آتا تو لہریں سر پھوڑنے چلی آتیں۔ایک روز انسان کو اس جنگل کی خبر ہوئی اور یہ آباد ہونے لگا۔سترھویں صدی کے آغاز میں ولندیزی تاجروں نے یہاں قبضہ کیا۔1664 میں برطانیہ نے اس علاقہ کو اپنی کالونی بنالیا۔ایک سو سال تک یہاں برطانیہ کا جھنڈا لہراتا رہا۔ایک روز یہاں کے لوگوں نے تاجِ برطانیہ سے بغاوت کا نعرہ بلند کیا۔آزادی کی جنگ کے بڑے بڑے واقعات یہیں رونما ہوئے۔امریکہ میں ہونے والی سول وار میں بھی نیویارک کا کردار مرکزی تھا۔یہاں سے

تقریباً چار لاکھ فوجی اس جنگ میں شرکت کرنے گئے۔ یہ سب لنکن کے سپاہی تھے۔ ان میں سے پچپن ہزار کے قریب لقمہ اجل بنے اور جو زخمی ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں۔ شمال اور جنوب کے درمیان اس خونی تصادم کے زخم کب کے مندمل ہو چکے۔ یہی امریکہ کی کامیابی ہے۔

بحر اوقیانوس کے کنارے ایستادہ آزادی کا مجسمہ نیویارک کی پہچان ہے۔ یہ مجسمہ فرانس کی جانب سے آزادی کے صد سالہ جشن (1886) کے موقعہ پر اہلِ امریکہ کو پیش کیا گیا۔ ایسا ہی ایک مجسمہ فرانس کے شہر پیرس میں بھی ہے۔ آزادی کا یہ مجسمہ دراصل ایک علامت ہے۔ شاید اس امر کا اعلان کہ آپ ایک آزاد سرزمین میں داخل ہو رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں کے باشندے نیویارک میں آباد نہ ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہاں ایک کروڑ سے زائد رجسٹرڈ گاڑیاں اور سوا کروڑ کے لگ بھگ ڈرائیونگ لائسنس تھے۔ اگر نیویارک ایک ملک ہوتا تو دنیا کی سولہویں بڑی معیشت قرار پاتا۔ اس شہر میں آمد و رفت کا زمین دوز نظام کسی عجوبہ سے کم نہیں۔ سخت پتھریلی سرزمین کی وجہ سے اس نظام کی تعمیر انتہائی مشکل امر تھی۔ اسی پتھریلی زمین کی وجہ سے ہی مین ہٹن کی سربفلک عمارتیں تعمیر ہوئیں اور انسان آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ یوں تو نیویارک میں بہت سے اہم اور تاریخی مقام ہیں لیکن دنیا کا معاشی مرکز ہونے کی حیثیت سے یہاں کی سب سے اہم جگہ وال سٹریٹ اور نیویارک سٹاک ایکسچینج ہے۔ نیویارک سٹاک ایکسچینج اور وال سٹریٹ اب ہم معنی ہو چکے ہیں۔ یہاں کے مکین سمجھتے ہیں کہ دنیا کی دولت اور معیشت کا فیصلہ اسی جگہ ہوتا ہے شاید وہ نہیں جانتے کہ اللہ کے ہاں معیشت کے قانون جدا ہیں۔ پکڑ دھکڑ، جرم و سزا۔ وہ سارا کھیل ہی کچھ اور ہے۔ خدا افراد اور اقوام کو اس وقت پکڑ میں لیتا ہے جب وہ اپنی معیشت پر اترا رہے ہوتے ہیں۔ جب وہ اس زعم کا شکار ہوتے ہیں کہ غربت اور امارت محض ان کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ''کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں جب وہ لوگ اپنی معیشت پر اِترا رہے تھے'' القصص (28۔58)۔ انسان جلد باز ہے۔ بار بار بھول جاتا ہے کہ بازی اسی وقت پلٹتی ہے جب کوئی خدا کی ہمسری کا اعلان کر دے۔ خدا کو شاید سب گوارا ہو سوائے غرور کے، سوائے شرک کے۔

5.19۔ خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یادِ فصلِ بہار

امریکی معیشت کی پناہ گاہ۔ وال سٹریٹ۔

وال سٹریٹ کی وجہ تسمیہ ایک چھوٹی سی دیوار ہے۔ جو کبھی نیویارک شہر کے لیے فصیل کا کام دیتی تھی لیکن اب

یہ دیوار سرمایہ دارانہ نظام کی فصیل بن چکی ہے۔ بظاہر اس قدر مضبوط کہ کوئی اس میں شگاف نہیں ڈال سکتا۔اس دیوار کے اولین معماروں میں ایک بڑا نام الیگزینڈر ہملٹن کا ہے۔ جسے مرنے کے بعد وال سٹریٹ کے قریب ہی دفن کر دیا گیا۔

الیگزینڈر ہملٹن امریکہ کا پہلا وزیرخزانہ اور جارج واشنگٹن کا معتمد ساتھی تھا۔اس نے ایک سپاہی' ماہر معیشت' سیاسی مدبر اور قانون دان کے طور پر اپنا لوہا منوایا۔امریکہ کے مشہور بنک''بنک آف نیویارک'' کی بنیاد بھی اسی نے رکھی۔ معاشی معاملات کا اسے گہرا ادراک تھا۔اس نے غربت میں آنکھ کھولی لیکن اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر امریکہ کے بانیوں میں شمار ہونے لگا۔دولت' عزت' شہرت اور مرتبے کے باوجود اس کی زندگی کا اختتام ایک المیہ پہ ہوا۔الیگزینڈر ہملٹن اور امریکی نائب صدر''بر'' کے مابین مختلف وجوہات کی بناء پر مخالفت اور پھر دشمنی شروع ہوگئی۔اس عناد کی کئی وجوہات تھیں۔ بر کو شکایت تھی کہ ہملٹن کی مخالفت کی وجہ سے اسے امریکہ کی صدارت کا الیکشن ہارنا پڑا۔ جب یہ دشمنی حد سے بڑھنے لگی تو Duel کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔اس زمانے میں دو آدمی اپنے اختلاف حل نہ کر پاتے تو Duel یا''موت کی جنگ'' کا راستہ اپنایا جاتا تھا۔ یہ ایک انتہائی اقدام تھا۔ہملٹن اور بر کے مشترکہ دوستوں نے انہیں اس سے روکنے کی کوشش کی لیکن غصے نے ان کی نگاہوں پہ پٹی باندھ دی۔ذاتی مخاصمت اور انا۔انسان غرور کی رو میں کہاں تک بہہ جاتا ہے۔ڈوئل کیلئے گیارہ جولائی 1804 کا دن مقرر ہوا۔ نیوجرسی' دریائے ہڈسن کا مغربی کنارہ' وی ہاکن نامی جگہ۔ہملٹن اور بر جو امریکہ کے نامی گرامی سیاستدانوں میں شمار ہوتے تھے علی الصبح اس بدقسمت مقام پہ پہنچ گئے۔ایک امریکہ کا سابق وزیرخزانہ' جنگِ آزادی کا ہیرو' اور دوسرا امریکی نائب صدر......یہی نہیں ان کی حیثیت اس سے بڑھ کر بھی تھی ....دونوں آزادی کے معمار' جواں فکر اور دوراندیش بھی تھے۔ہملٹن کی عمر انچاس برس اور بر اس سے کچھ ہی بڑا۔ گھڑیال بجا' حریف آمنے سامنے آئے' دونوں نے نشانہ تاکا۔ صلح کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔انا سب سے بڑی تھی۔زندگی سے بھی۔دونوں نے ایک دوسرے سے پشت جوڑی۔مخالف سمت میں دس دس قدم آگے بڑھے۔ رومال ہلنے پر پھرتی سے واپس پلٹے۔گولیاں چلیں۔ہملٹن کی گولی بر کے سر پہ لٹکی درخت کی ایک شاخ کو چیرتی ہوئی گذر گئی لیکن بر کی گولی نشانے پہ تھی۔ ہملٹن کے پیٹ کے نچلے حصہ پہ لگنے کے بعد یہ گولی گھومتی ہوئی پسلیوں تک جا پہنچی۔خون کا فوارہ سا پھوٹا

اور ہملٹن اپنے ہی پاؤں پہ گر گیا۔ زخم بہت کاری تھا۔

ہملٹن اس زخم کی تاب نہ لا سکا اور اگلے روز بارہ جولائی کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہملٹن نے جان بوجھ کر غلط نشانہ لیا کیونکہ وہ بر کے خون میں ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا تھا۔ ہملٹن کا ایک خط بھی پیش کیا گیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ برکو اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ اس کا خاتمہ اس کے پستول سے نکلی ہوئی گولی سے ہو۔ اس لیے گولی داغتے ہوئے اس نے پستول کا رخ بر کی طرف نہیں کیا۔ لیکن لوگ اسے محض افسانہ طرازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ایک اداس دن تھا۔ درد سے بھرا اور خون آلود۔ گولیوں کی آواز سے دریائے ہڈسن کا گہرا سکوت ٹوٹ گیا۔ معصوم پرندے اپنے گھونسلوں سے اڑ کر انسان کو خون بہاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ ہملٹن اور بر آج دنیا میں نہیں۔ وہ پرندے بھی کہاں ہوں گے۔ لیکن وی ہاکن نامی جگہ بھی ہے' دریا کا کنارہ بھی ہے' شاہ بلوط کے دیوقامت درخت بھی ہیں۔ شاید ان پرندوں میں نسل در نسل یہ کہانی سنائی جاتی ہو۔ کوئی بوڑھا پرندہ کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتا ہو کہ انسان کس قدر ضدی ہے۔ خود ہی انا کی صلیب پہ لٹک جاتا ہے۔ جنگِ آزادی کے دو ہیرو کتنے کم نگاہ نکلے۔ وال سٹریٹ الیگزینڈر ہملٹن کا خواب تھی۔ اسے ابدی استراحت کیلئے جگہ بھی یہیں ملی۔ میں کچھ دیر الیگزینڈر ہملٹن کی قبر پہ کھڑا رہا۔ خزاں رسیدہ درخت اور قبر پہ بکھرے ہوئے زرد پتے۔ قبرستانوں میں بہار نہیں آتی۔ پھول نہیں کھلتے۔ البتہ اس قبرستان سے ملحقہ وال سٹریٹ کا معاملہ اور ہے۔ یہاں بہار رہتی ہے' خزاں نہیں آتی۔ یہاں کے مکین دولت میں کھیلتے ہیں۔ وال سٹریٹ ان کیلئے پناہ گاہ ہے۔ ایک مضبوط فصیل۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مزدور اور محنت کش اس دن کے منتظر ہیں جب یہ فصیل الیگزینڈر ہملٹن کی طرح خود ہی اپنے پاؤں پہ گر جائے گی۔ غربت ہمیشہ کیلئے ان کا مقدر تو نہیں:

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

5.20۔امریکہ صرف وال سٹریٹ نہیں

اوسیو لا میکارٹی...... نیویارک کی ایک اور مکین۔

وال سٹریٹ اور ہالی وڈ کے مکینوں سے بہت مختلف۔ایک کمزور سیاہ فام عورت جس کی کہانی امریکی معاشرے کا ایک اور رخ پیش کرتی ہے۔اس کہانی کا حاصل یہ ہے کہ امریکہ صرف وال سٹریٹ نہیں کچھ اور بھی ہے۔
اوسیولا سادگی، کفایت شعاری اور ایثار کا پیکر تھی......وہ چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی کہ اسکی خالہ بیمار رہنے لگی۔خالہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔تیمارداری کی ذمہ داری اوسیولا کو سونپ دی گئی۔وہ خالہ کی خدمت میں اس قدر محو ہوئی کہ سکول جانا ہی بھول گئی۔نیویارک کے گلی کوچوں میں کئی سال یونہی گذر گئے۔جب تک خالہ اس دنیا سے رخصت ہوتی اس کے سارے خواب مرجھا چکے تھے۔اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے محلے میں لوگوں کے برتن دھونے اور کپڑے استری کرنے لگی۔اس مزدوری کے نتیجہ میں اسے جو کچھ ملتا اس کے معمولی اخراجات اور کھانے پینے کیلئے کافی تھا۔کچھ نہ کچھ باقی بچ جاتا۔جس سے وہ لوگوں کی مدد کر دیتی یا اسے بنک میں جمع کروا دیتی۔محنت اور بچت کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔نجانے کتنی بہاریں خزاں میں تبدیل ہوئیں۔جب اس کی عمر ستاسی سال ہوئی تو وہ ایک روز اپنے بنک گئی۔بنک آفیسر نے بتایا کہ اس کے اکاؤنٹ میں کئی لاکھ ڈالر جمع ہیں۔پچھتر سال کی محنت کا ثمر۔اس نے کچھ دن سوچنے میں گذارے اور پھر اس دولت کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ڈیڑھ لاکھ ڈالر سے افریقن امیریکن طالب علموں کیلئے ایک انڈومنٹ فنڈ بنایا اور بقیہ رقم قریبی چرچ اور اپنے غریب رشتہ داروں میں تقسیم کر دی۔وہ ایثار کا پیکر جو تھی۔

امریکہ کے صدر بل کلنٹن نے اوسیولا میکارٹی کو وائٹ ہاؤس آنے کی دعوت دی تو اس نے جہاز پہ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔اسے یہ مشین غیر محفوظ دکھائی دیتی تھی۔وہ نیویارک سے ٹرین پر بیٹھ کر واشنگٹن پہنچی............اسے امریکہ کے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔کلنٹن کا کہنا تھا کہ اوسیولا سے ملاقات اس کی زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ تھا۔1995 میں جب ایک اٹھارہ سالہ لڑکی سٹیفنی کو پہلا اوسیولا میکارٹی سکالرشپ ملا تو اوسیولا کی نگاہوں کی چمک دیدنی تھی۔بچپن سے لے کر آج تک اس کے دل میں یہ کسک رہی کہ وہ تعلیم حاصل نہ کر سکی لیکن آج وہ کسک جاتی رہی............سٹیفنی کو سکول جاتے ہوئے دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے وہ خود سکول جا رہی ہو۔سٹیفنی کی مسکراہٹ میں ستاسی سال کی تھکن نے دم توڑ دیا......نیویارک صرف الیگزینڈر ہملٹن کا نہیں اوسیولا میکارٹی کا بھی ہے۔امریکہ صرف وال سٹریٹ نہیں بل گیٹس اور وارن بفٹ بھی ہے۔

5.21۔وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اوسیولا سے کسی نے پوچھا تم نے اپنی جمع پونجی لڑکیوں کیلئے ہی کیوں وقف کی۔اس کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔''مردوں کی اس دنیا پہ عورتوں کا بھی حق ہے...... میں جانتی ہوں کہ ایک عورت کی حیثیت سے مجھے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔گھر سے نکلتے ہی یہ احساس ہوجاتا کہ یہ دنیا صرف مردوں کیلئے بنی ہے۔ابھی عورت کو سر اٹھا کے چلنے کی اجازت نہیں۔ابھی راستے پُر خار ہیں...... میں چاہتی ہوں بچیاں بھی جی بھر کے جئیں۔ان کے بھی تو خواب ہیں''۔

یہ باتیں نیویارک میں رہنے والی اوسیولا کی تھیں جو ایک ترقی یافتہ معاشرے کا حصہ ہے۔وہ معاشرہ جہاں عورتیں بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں عبور کر چکی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تو عورت اور غربت کا تعلق اور بھی گہرا ہے۔غربت اگر اختیار سے محرومی کا نام ہے تو عورت سے بڑھ کر اور کوئی غریب نہیں۔ جب تک وہ والدین کے گھر میں رہتی ہے تو اس کی قسمت کا فیصلہ باپ اور بھائیوں کے پاس ہوتا ہے۔ جب وہ خاوند کے گھر آتی ہے تو یہ اختیار بھی اس کے خاوند کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ بھوک اور محرومی کا سب سے زیادہ شکار وہی بنتی ہے۔دکھ کا آتشکدہ اسے ہر روز جلا کے راکھ کرتا ہے۔اگر گھر میں کسی ایک شخص کو بھوکا رہنا پڑے' کسی ایک کو جہالت کی چتا میں جلنا پڑے' کسی ایک کو دوا سے محروم ہونا پڑے تو وہ عورت ہی ہوتی ہے۔غریب ہونا بہت بڑا دکھ ہے لیکن غریب عورت ہونا ایک ناقابل بیان دکھ ہے۔

اخوت نے خواتین کو کامیابی کی نئی راہوں سے آشنا کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قرضوں نے انہیں بڑی بڑی خوشیوں کی راہ دکھائی ہے۔ان قرضوں کی بدولت ان کی خوداعتمادی بڑھی' عزت نفس میں اضافہ ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا سماجی مقام بلند ہونے لگا۔''جب سے میں نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے میں خود کو بہت معتبر پانے لگی ہوں۔میں اب پانچ ہزار روپے ماہانہ کماتی ہوں۔میرے بچے پیٹ بھر کے کھانا کھاتے ہیں۔میری اپنی چھوٹی موٹی ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں۔اب میرے خاوند کی نگاہوں میں تشکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ مجھے اور میری بیٹی کو اب گھر پر بوجھ نہیں سمجھا جاتا۔اس سے پہلے میں خاوند کے سامنے ہاتھ بڑھاتی تو مجھے یوں لگتا جیسے خیرات کے لیے ہاتھ بڑھا رہی ہوں۔اب روزمرہ کے اخراجات میں خود اپنی جیب سے بھی پورے کر سکتی ہوں۔'' یہ کسی ایک عورت کی گواہی نہیں ایسی ہزاروں عورتیں ہیں جو ہر روز

یہی کہانی دہراتی ہیں۔ اگر پچاس فیصد آبادی اس احساس کے بوجھ تلے دبی رہے کہ زندگی مردوں سے ملنے والی بھیک یا خیرات کا نام ہے تو کیا ہم غربت کا خاتمہ کر سکیں گے؟ اوسیولا کی ترجیح اتنی بھی غلط نہیں۔

5.22۔ اپنی جان نذر کروں اپنی وفا پیش کروں

نیویارک کی سب سے بڑی تقریب بروکلین کے رائل بینکوئیٹ ہال میں ہوئی۔ ایک سو سے زائد افراد۔ یہ سب فخر اور ریحان کی محنت کا نتیجہ تھا۔ ان تمام افراد سے رابطہ، دعوت، یاد دہانی اور پھر تقریب کے انتظامات۔ یہ سب کچھ آسان نہ تھا۔ طیبہ ضیاء چیمہ جو نوائے وقت کی مشہور کالم نگار ہیں، مجیب لودھی، ظہور حماد، فیض احمد، ظفر شاہ، اعجاز چٹھہ، عبدالخالق، محسن ظہیر بہت سے لوگ موجود تھے۔ اخوت کا پرانا ساتھی اور رضا کار قیصر۔ تقریریں، تصویریں، پریزینٹیشن۔ مجیب لودھی کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ وہ تقریب کے دوران اس قدر جذباتی ہوئے کہ انہوں نے ایک تھیلا اٹھایا اور ہر ٹیبل پہ جا کے عطیات کی اپیل شروع کر دی۔ ہم انہیں روکتے رہے کہ ہمارا مقصد کچھ جمع کرنا نہیں لیکن ان کا کہنا تھا کہ نیکی میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ ایک، ایک۔ دو، دو۔ دس، دس اور سو، سو ڈالر اس تھیلے میں گرتے رہے۔ ایک نوجوان قریب آ کے کہنے لگا۔ میں یہاں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ میری طرف سے دو سو ڈالر قبول فرمائیں۔ ان سے اور کچھ نہیں تو ایک خاندان کا کاروبار تو شروع ہوسکتا ہے۔ میں اور ریحان سوچ رہے تھے کہ جب تک دنیا میں ایسا ایک شخص بھی ہے اخوت کا تصور نہیں مٹ سکتا۔ اس کے چہرے پہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ ہر شخص کے نصیب میں نہیں۔ جہانیاں کا نوجوان، آئی آئی ٹی کے بچے...... بہت سی اور کہانیاں ایک بار پھر یاد آنے لگیں۔ کچھ لوگوں کا تعلق گجرات سے تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر اعجاز بشیر کو بہت یاد کیا۔ ڈاکٹر اعجاز بشیر کی بے لوث خدمت کا پورا گجرات شہر معترف ہے۔ اخوت کو گجرات لے جانے کی دعوت انہی نے دی۔ وہ چار بھائی ہیں۔ جب انہوں نے کاروبار شروع کیا تو والد نے انہیں حکم دیا کہ تین بھائی کاروبار کریں گے اور چوتھا بھائی خدمت کرے گا۔ سرِ تسلیم خم ہوا۔ تین بھائی کماتے ہیں اور اعجاز بشیر اللہ کی راہ میں بانٹنے چلا جاتا ہے۔ اشفاق نامی ایک دوست کو بھی انہوں نے اسی راہ پہ لگا لیا۔ کچھ بعید نہیں سارا گجرات ہی آہستہ آہستہ اس راہ پہ لگ جائے۔ طیبہ ضیاء نے بھی تقریر کی۔ اخوت کے بارے میں بہت اچھے جذبات۔ انہوں نے اپنی بیٹی مومنہ چیمہ کا بھی ذکر کیا جو ہارورڈ سے پڑھ کر نکلی اور پھر ایک روز کار کے ایک حادثے کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ طیبہ ضیاء اور ان کے میاں

نے اس غم کو بھی طاقت بنالیا۔ ورلڈ مسلم کانگرس کے ڈاکٹر طارق چیمہ بھی آن ملے۔ مومنہ چیمہ فاؤنڈیشن کے نام سے ایک ادارہ بنا اور غریب بچوں کو سکالرشپ ملنے لگے۔ گریہ وزاری' آہ و بکا' آنسوؤں کی جھڑی۔ جو ماں ان سے بلند ہو جائے اس کی عظمت پہ کسے شک ہوگا۔

5.23۔ یہ بھی تو حج ہے

ڈنر مکمل ہونے کے بعد لودھی صاحب نے جو تھیلا مجھے تھمایا اس میں کل گیارہ سو ڈالر تھے۔ چھوٹے اور بڑے نوٹ اور کچھ چیک جوان سے الگ تھے۔ اس تھیلے نے مجھے ایک اور تھیلا یاد دلا دیا۔ تھیلا نہیں شاید وہ پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا لفافہ تھا۔ جو ہمیں پروفیسر رف رف کی وساطت سے ملا۔

پروفیسر رف رف اخوت کے دیرینہ دوست ہیں۔ وہ ہر اتوار کی صبح علامہ اقبال ٹاؤن کے ایک پارک میں درسِ قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔ سیر کے لیے آنے والوں کو تبلیغ کرنا رف رف کا ہی کمال ہے۔ بعض اوقات کسی مہمان کو بلا کر خصوصی لیکچر کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ ایک بار پروفیسر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ بھی کسی روز وہاں آ کر اخوت کے بارے میں بتائیں۔ میں اگلے اتوار علی الصبح وہاں جا پہنچا۔ دو سو سے زیادہ مرد اور خواتین منتظر تھے۔ طویل گفتگو ہوئی اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔ گفتگو کے بعد ایک انتہائی عمر رسیدہ شخص میرے پاس پہنچا۔ اس نے صرف اتنا پوچھا کیا غریب آدمی بھی اخوت کو عطیہ دے سکتا ہے پھر ہاتھ ملایا اور واپس چل دیا۔ اگلی صبح رف رف صاحب ملے تو ان کے پاس پلاسٹک کا ایک لفافہ تھا جس میں دس' دس' بیس بیس اور سو سو کے نوٹ تھے۔ کہنے لگے یہ کل دس ہزار روپے ہیں۔ کل جو بابا جی آپ سے ملے انہوں نے دیئے ہیں۔ اخوت کیلئے۔ وہ ملتان روڈ پر پھل کی ریڑھی لگاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں کئی سال سے حج کیلئے رقم جمع کر رہا ہوں۔ اس امید میں کہ ڈیڑھ لاکھ ہو جائیں تو میں یہ فرض ادا کرلوں۔ ابھی اسّی ہزار ہوئے ہیں۔ اس میں سے دس ہزار نکال کر آپ کو دے رہا ہوں۔ حج پہ جانے کا ارادہ ابھی قائم ہے لیکن کچھ وقت اور لگ جائے گا۔ کوئی حرج نہیں۔ دیئے ہوئے میں سے ہی دینا ہے۔ جس نے پہلے دیئے وہ دوبارہ بھی دے دے گا۔ لینا دینا تو لگا رہتا ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے اصل میں ہے تو اسی کا۔ میں یو لی تھین کے اس لفافے کو دیکھتا رہا جس میں ان گنت چھوٹے چھوٹے نوٹ موجود تھے۔ میلے کچیلے' کچھ پھٹے ہوئے۔ گنے تو پورے دس ہزار ہی تھے لیکن مجھے علم ہے کہ یہ دس ہزار نہیں دس لاکھ تھے یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ ایک بالی پہ ستر گنا یا

سات سوگنا۔ یہ حساب کون کرسکتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سارے کیلکو لیٹر جواب دے دیتے ہیں۔ ساری مشینیں ٹوٹ جاتی ہیں اور سارے حساب بھی بے باق ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بابا جی کا حج اسی سال ہو گیا تھا۔''جس نے پہلے دیئے وہ دوبارہ بھی دے گا۔ لینا دینا تو لگا رہتا ہے۔'' مجھے ان کی یہ بات اکثر یاد آتی ہے۔

5.24۔عطاء الحق قاسمی

نیویارک کی تقریب میں کچھ دوستوں نے بتایا کہ نیویارک میں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ابھی کھانے میں کچھ دیر تھی۔ ریحان نے نیٹ سے فوراً ان کا ایک کالم نکالا اور مہمانوں کو دکھانے لگا۔ اخوت کے بارے میں قاسمی صاحب کا یہ کالم بہت مشہور ہوا تھا۔ ان کے روایتی شگفتہ انداز میں ہلکی سی افسردگی بھی تھی۔ کالم کا عنوان تھا۔''یہ وہ شہر ہے جس میں کوئی گھر بھی خوش نہیں۔'' لکھتے ہیں''کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے آنسوؤں اور آہوں سے بھرے ہوئے ایسے خط موصول نہ ہوتے ہوں جن میں خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ دیتے ہوئے مالی مشکلات دور کرنے کی درخواست نہ کی گئی ہو۔ ان میں سے ہر خط مجھے شدید دکھ اور کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس طرح کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہیں جن کی ضرورتوں نے ان کی زندگیاں اجیرن کی ہوئی ہیں چنانچہ ان سب کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ان سب پر علیحدہ علیحدہ کالم لکھنے کی ضرورت ہے جس میں مخیّر حضرات سے درخواست کی جائے کہ وہ ان مجبوروں کی دست گیری کریں اور ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ اس کا واحد حل ظلم اور ناانصافی پر مبنی موجودہ ظالمانہ نظام کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کرنا ہے تاکہ پاکستان کے سولہ کروڑ عوام کو ان کے وہ حقوق مل سکیں جو غاصب طاقتوں نے ان سے چھین رکھے ہیں۔ یہ منزل مجھے ابھی بہت دور لگتی ہے۔ اس منزل تک رسائی سے پہلے ایسے فلاحی اداروں کا قیام مظلوموں کی ایک حد تک دادرسی کرسکتا ہے جو ان کے مسائل کے حل کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ قیام پاکستان سے قبل ہندو اپنے فلاحی اداروں کے لیے مشہور تھے جس کی کچھ نشانیاں لاہور میں گنگارام ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال اور دیال سنگھ کالج وغیرہ کی صورت میں اب بھی موجود ہیں مگر قیام پاکستان کے بعد الحمدللہ اب ہمارے درمیان بھی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو مختلف فلاحی اداروں کے پرچم تلے غریب عوام کی مشکلات میں کمی کرنے کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک تنظیم''اخوت'' بھی ہے جس کے''مدارالمہام'' ڈاکٹر امجد ثاقب ہیں۔

ڈاکٹر امجد ثاقب حکومت میں ایک بڑے منصب پر فائز تھے اور یوں شاید انہیں زیادہ قریب سے عوام کی مشکلات دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ انہوں نے اپنا عیش و آرام تج کر عوامی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور ایک ادارے ''اخوت'' کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ ضرورت مندوں کو گداگر نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس کا مقصد انہیں بلاسود قرض مہیا کر کے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا تاکہ وہ اس قرض کی رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر سکیں۔ چنانچہ کسی نے سلائی مشین خریدنے کے لیے، کسی نے ریڑھی کی خریداری کے لیے اور کسی نے کسی اور کاروبار کے لیے تنظیم کی طرف رجوع کیا اور اس سے لیے ہوئے قرض سے کاروبار کا آغاز کرتے ہوئے اپنے بچوں کی روزی کمانے کے قابل ہو گیا۔ اس وقت تک ''اخوت'' پچاس کروڑ روپے کی رقم ضرورت مندوں کو بلاسود قرض کے طور پر دے چکی ہے (اب یہ رقم ساڑھے چار ارب سے تجاوز کر چکی ہے۔ الحمدللہ) جس کی حد غالباً فی خاندان تیس ہزار روپے تک ہے۔ ایک حیرت انگیز اور باعث مسرت بات یہ ہے کہ ابھی تک پچاس ساٹھ ہزار لوگ ''اخوت'' سے قرض لے کر کامیاب کاروبار کر رہے ہیں اور ان میں سے ایک بھی ڈیفالٹر نہیں۔ ''اخوت'' نے اپنی شاخیں مختلف مساجد اور دوسری عبادت گاہوں میں قائم کر رکھی ہیں۔ شاید اس لیے کہ ضرورت مندوں کے کام آنا اپنے طور پر ایک بڑی عبادت ہے۔ مجھے یوں تو ظفر اقبال کے بہت سے شعر پسند ہیں۔ تاہم ان کا یہ شعر خصوصی طور پر مجھے بہت اچھا لگتا ہے:

یہ وہ شہر ہے جس میں کوئی گھر بھی خوش نہیں
دادِ ستم نہ دے کہ ستم گر بھی خوش نہیں

اور اس ناخوشی، افسردگی اور اداسی کی زد میں ہمارے خوشحال طبقے کے افراد بھی بہت بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ وہ مختلف النوع نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہیں، ان کی زندگیاں دھکا اسٹارٹ ہیں۔ وہ سکون آور ادویات کے سہارے اپنے معمولات انجام دیتے ہیں۔ انہیں میرا مشورہ ہے کہ وہ سکون آور ادویات کی بجائے اپنی دولت اور اپنے وقت کا ایک حصہ اللہ کے بندوں کی خدمت کے لیے وقف کر کے دیکھیں۔ اس کے نتیجے میں ان کا رشتہ حقیقی زندگی کے ساتھ دوبارہ جڑ جائے گا۔ انہیں اپنی زندگیوں میں ایک ایسی مسرت کا احساس ہوگا جس سے وہ ابھی تک نا آشنا تھے اور آپ یقین کریں ان کی یہ اندرونی مسرت ان کے کھنچے ہوئے چہروں کو بھی آسودہ آسودہ اور روشن روشن کر دے گی۔ میں جب کبھی دردِ دل رکھنے والوں کے چہروں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہاں نور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ اللہ والے ہیں۔ ہر شخص اللہ والا ہے جو اس

کے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ آپ بھی ان نیک لوگوں کے گروہ میں شامل ہو جائیں تا کہ قیامت کے روز بُرے لوگوں کے ساتھ اٹھائے جانے کی بجائے اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھائے جائیں''۔

تقریب ختم ہوئی۔ سب لوگ رخصت ہونے لگے۔ اپنائیت اور تپاک۔ جب نیویارک کے یہ باسی اخوت کی تقریب میں شرکت کیلئے آئے تو اجنبی تھے لیکن اخوت کے پیغام نے انہیں اپنا بنا دیا۔ دردمندی' گداز اور پھر مواخات کا پیغام۔ ہر گھر میں کوئی مومنہ ہوتی ہے۔ جس کے بچھڑنے پہ آنسو بہائے جاتے ہیں۔ کاش یہ آنسو صدقہ جاریہ بن کے دوسروں کے کام آسکیں۔ نیویارک کے اردو اخباروں نے اس تقریب کی بھرپور کوریج کی۔ طیبہ ضیاء نے نوائے وقت میں ایک خوبصورت کالم بھی تحریر کیا۔ فخر اور ریحان کی محنت رنگ لائی اور نیویارک کی پاکستانی کمیونٹی میں اخوت کا شہرہ ہونے لگا۔

5.25۔ میری منزل ہے اجالوں کا جہاں

ہارورڈ' فلیچر اور آئی آئی ٹی کے بعد اخوت کی ایک تقریب نیویارک کے تاریخی مین ہیٹن ول کالج میں بھی ہوئی۔ یہ کالج نیویارک کے نواح میں واقع ہے اور اس کا شمار بھی امریکہ کی بہترین درسگاہوں میں ہوتا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ ایک پر ہجوم شہر کے ساتھ ایسا پرسکون مقام بھی ہوگا۔ وسیع و عریض' سبزے اور درختوں میں گھرا۔ اندرونی زیبائش بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ ساگوان اور مہاگنی کی لکڑی کا اس قدر خوبصورت کام بہت کم نظر آتا ہے۔

یہاں کے چھ ہزار طالب علموں میں کئی پاکستانی بھی ہیں۔ ان پاکستانی طالب علموں میں اخوت کی ایک دوست بھی تھی جس کا نام وردا ہے۔ وردا اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے پورے کالج میں مشہور ہے۔ فیکلٹی سے لے کر کالج کے پریذیڈنٹ تک سب اس کے گرویدہ ہیں۔ اخوت کی تقریب میں پچاس سے زیادہ طالبعلم اور استاد اکٹھے کرنا اسی کا کمال تھا۔ کالج کے پریذیڈنٹ پوری تقریب میں موجود رہے اور انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ اخوت کی کہانی نے یہاں بھی سب کو متاثر کیا۔ کئی ایک طالب علموں نے پاکستان آ کے انٹرن شپ کا عندیہ دیا۔ تقریب کے دوران اساتذہ نے بھی گفتگو کی اور طالب علموں کو سوال جواب کا

طویل موقعہ دیا گیا۔ مین ہٹن ول کی ویب سائٹ اور نیوز لیٹرز میں اخوت کی کہانی کئی ہفتوں تک چھپتی رہی۔

وردا نے اپنے کالج کے علاوہ ایک اور ملاقات کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ یہ ملاقات بھارت نژاد انوپم ستیاشی سے تھی۔ انوپم کچھ عرصہ پہلے تک بار کلے بنک میں ایک اعلیٰ عہدے پہ فائز تھا لیکن اب اپنا کاروبار کرتا ہے۔ اس نے بچوں کی تعلیم کیلئے ایک این جی او بھی بنا رکھی ہے جو مختلف مما لک میں غریب بچوں کو ابتدائی تعلیم دینے کے لیے مدد دیتی ہے۔ انوپم کا کہنا ہے کہ اعلیٰ تعلیم اپنی جگہ پر اہم ہے لیکن ہماری پہلی توجہ ابتدائی تعلیم پہ ہونی چاہئے۔ غربت کو تسخیر کرنا ہے تو ان بچوں کو سکول لانا پڑے گا جو سکول سے دور ہیں۔ وہ اپنی مثال دیتا ہے کہ اگر اس کے والدین اسے ابتدائی تعلیم نہ دے پاتے تو وہ دلی کے ایک غریب محلے سے اٹھ کر نیویارک کے سب سے مہنگے علاقے تک نہ پہنچ پاتا۔ انوپم نے اخوت کے ساتھ تعاون کی پیش کش بھی کی اور اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ میں اس کی تنظیم کے ایڈوائزر کے طور پر کام کروں۔ انوپم ایک عالمی شہری بن چکا تھا۔ جس کی زندگی کا مقصد غربت سے لڑنا تھا خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی شخص غریب نہ رہے انہیں مل کر کام کرنا چاہیے۔ غربت کو عجائب گھر کی زینت بنانے کیلئے اتفاق چاہیے۔ اتفاقِ رائے اور اتفاقِ عمل۔ انوپم، وردا، ریحان، فخر اور میں بڑی دیر تک ایک ریستوران میں بیٹھے کافی پیتے رہے۔ ہماری گفتگو پاکستان اور بھارت سے نکل کر پوری دنیا تک پھیلنے لگی۔ جب تک دوار ب لوگ ناخوش ہیں، ہم خوش نہیں رہ سکتے۔ کرۂ ارض پر بسنے والے ہر شخص کی محرومی ہماری محرومی ہے اور ہمیں اس محرومی کو دور کرنا ہے۔ تاریکیاں اور اندھیرے۔ ہمیں اس شکست کو فتح میں بدلنا ہے۔ ہماری منزل روشنی کا وہ شہر ہے جہاں اجالوں کا راج ہو۔

5.26۔ کیسے کیسے میزبان

انوپم سے ملنے کے بعد فخر نے مین ہیٹن میں گھمانا شروع کر دیا۔ فخر اور اس کی اہلیہ بہترین میزبان تھے۔ جب بھی کوئی اچھا میزبان ملے مجھے دو اور میزبان یاد آتے ہیں۔ جن کی توجہ اور خدمت کا نقش بھلا کب بھولے گا۔ ہمفری فیلوشپ کے دوران طالب علموں کو کسی مقامی خاندان کے ساتھ رہنے کا موقعہ بھی دیا جاتا ہے۔ بہت سے امریکی خاندان طالب علموں کی میزبانی کرنا چاہتے ہیں۔ بیرونِ ملک سے آئے فیلوز کو کچھ روز ان کے ساتھ بسر کرنا پڑتے ہیں۔ میرے قیام کا قرعہ فال ولسن فیملی کے نام نکلا۔ میں جب واشنگٹن سے روانہ ہو کر ویسٹ منسٹر نامی شہر پہنچا تو مسٹر اور مسز ولسن استقبال کیلئے ریلوے اسٹیشن پہ موجود تھے۔ انہوں

نے مجھے گاڑی پہ بٹھایا اور ہم شہر کے نواح میں واقع ان کے گھر پہنچ گئے۔ اگلے پانچ روز خاطر مدارات میں گذر گئے۔ مسز ولسن نے اپنے بیٹے کی طرح میرا خیال رکھا۔ مسٹر ولسن امریکی فارن سروس میں بہت سینئر عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ کچھ عرصہ کیلئے ان کا قیام پاکستان میں بھی ہوا۔ پاکستان کے بارے میں ان کی معلومات سے مجھے خوشگوار حیرت ہوتی رہی۔ یہاں ان کے کئی ایک دوست بھی تھے جن کا تذکرہ ان کیلئے بے حد مسرت کا باعث بنا۔ مسٹر ولسن کے ساتھ امریکی تاریخ پہ گفتگو اور مسز ولسن کے ساتھ ان کے بچوں کی باتیں۔ دو ہی روز بعد مجھے مکمل علم تھا کہ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ کہاں کہاں تک تعلیم حاصل کی۔ اس وقت کیا کرتے ہیں۔ زندگی میں کہاں جانا چاہتے ہیں۔ کب کب ماں باپ کو ملنے آتے ہیں۔ ان کی اچھی عادات کیا ہیں۔ ایک بیٹے سے تو میری فون پہ بات بھی ہوئی۔ دونوں میاں بیوی پچھتر اور ستر سال کی عمر کے باوجود انتہائی چاک و چوبند تھے۔ ہم ناشتہ اکٹھے کرتے۔ ناشتے کے بعد میں قریبی یونیورسٹی چلا جاتا اور رات کو ہم شہر کے کسی قدیم ریسٹورانٹ میں کسی شمع دان کے نیچے جلتی بجھتی روشنی میں ڈنر سے محظوظ ہوتے۔ ہر روز صبح کے وقت اٹھتے اور رات دیر تک چاندنی میں سیر کرتے۔

مسٹر ولسن نے مجھے ہنری ڈیوڈ تھوریو سے متعارف کروایا جو امریکہ کے عظیم ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا مشہور مضمون Civil Disobedience مہاتما گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ کی عدم تشدد کی تحریک کی بنیاد بنا۔ اس کی مشہور کتاب ''والڈن'' ان اہم کتب میں شمار ہوتی ہے جنہوں نے امریکہ کے مزاج کو متاثر کیا۔ امریکی ادب کا کلاسیک ناول Uncle Tom's Cabin بھی میں نے انہی کے گھر رہتے ہوئے پڑھا۔ مسز ولسن انتہائی شفیق اور مہربان خاتون تھیں۔ مجھے اس وقت بے حد شرمندگی ہوتی جب وہ خود میرے کپڑے دھوتیں اور انہیں استری کر کے میرے کمرے میں رکھ دیتیں۔ مروت اور میزبانی کا یہ پہلو ناقابلِ فراموش تھا۔ میں نے امریکہ کی بین الاقوامی حکمتِ عملی کے بارے میں کئی بار سخت الفاظ بھی استعمال کیے لیکن مسٹر ولسن ایک ماہر سفارت کار کی طرح ان باتوں کو پسِ پشت ڈال دیتے۔ اختلاف رائے کے باوجود ان کا رویہ انتہائی مہذب رہا۔ تلخ گفتگو کو شائستگی سے سننے میں کیا مزا ہے یہ سبق میں نے مسٹر ولسن سے سیکھا۔ پانچ دن کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا تو ہر طرف اداسی بکھر رہی تھی۔ وہ کمرہ جہاں میں ٹھہرا' وہ

کچن جہاں مسز ولسن نے میرے لیے امریکی ڈشز پکائیں، وہ سٹڈی روم جہاں میں علم اور دانش کی باتیں سنتا رہا وہ ڈرائنگ روم جہاں بیٹھ کر ہم اچھی دنیا کے خواب دیکھتے رہے۔ دونوں میاں بیوی مجھے رخصت کرنے اسٹیشن تک آئے۔ مسز ولسن کا ہاتھ الوداعی انداز میں دیر تک لہراتا رہا۔ مسٹر اور مسز ولسن دونوں اب اس دنیا میں نہیں۔ میں ہر سال کسی روز شام کے وقت دو موم بتیاں روشن کرتا ہوں۔ یہ مسٹر اور مسز ولسن کو میرا نذرانہ ءعقیدت ہے جنہوں نے صرف انسانی جذبوں کے تحت میری میز بانی کی اور مجھے بتایا کہ ضروری نہیں ہوتا کہ دل کا دروازہ صرف انہی لوگوں کیلئے کھولا جائے جنہیں پھر سے لوٹ کے آنا ہو۔ جو واپس نہ آئیں انہیں بھی دل میں رکھا جا سکتا ہے۔ فخر اور اس کی اہلیہ بھی بہترین میز بان تھے۔ انہوں نے مسٹر اور مسز ولسن کی یاد تازہ کر دی۔

5.27۔ محبت کی زباں ہو جا اخوت کا بیاں ہو جا

نیو یارک کے بعد نیو جرسی۔ اتوار کا دن دوپہر دو بجے سے چار بجے تک۔ بیچ وڈ کیفے، ایڈیسن، نیو جرسی۔ اس تقریب کے روحِ رواں فیصل مسعود تھے جن سے ملاقات ہارورڈ میں ہوئی۔ فیصل نے اپنے تیس کے لگ بھگ دوستوں کو مدعو کیا۔ ڈاکٹر، انجینئر اور دیگر پروفیشنل۔ فیصل مسعود کا تعلق بھارت سے ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مؤاخات ہر انسان کا تصور ہے۔ پاکستان کیا اسے تو دنیا بھر میں عام ہونا چاہیے۔ مجھے فیصل کی اس خواہش کے پسِ پردہ ظفر علی خان کا یہ شعر گونجتا ہوا سنائی دے رہا تھا:

اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں
تو دہلی تک کا ہر پیر و جواں بے تاب ہو جائے

اخوت واقعتاً پوری انسانیت کے لئے ہے۔ چودہ سو برس پہلے مدینہ میں جو ریاست بنی وہ صرف مسلمانوں کی ریاست نہ تھی۔ اس میں ہر مذہب کے پیروکاروں کو وہاں کا شہری تسلیم کیا گیا تھا۔ آج کے عہد میں مذہب کے نام پر بننے والی دو ریاستیں، پاکستان اور اسرائیل۔ کیا وہاں عقیدہ کے حوالے سے اختلاف کی آزادی ہے یا پھر وہ زبان بند ہو جاتی ہے جو کسی اور کے خدا کی تعریف کرے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے خدا کے ماننے والے خدا کو زیادہ رنجیدہ کرتے ہیں۔ انسان نے ہر بار اس حقیقت کو پس پشت ڈالا کہ دائمی فتح تلوار کی نہیں ہوتی۔ دین میں تو کوئی جبر نہیں۔ یہ تو ہے ہی ایثار۔ اگر ہم دنیا میں امن چاہتے ہیں تو ہر مذہب کا احترام کرنا

ہوگا۔ایک صاحب نے پوچھا کہ کیا اخوت کا پروگرام صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ ہمارا جواب تھا کہ ایسا کس طرح ہوسکتا ہے۔ رسالتمابؐ نے اپنے آخری خطاب کے موقع پر فرمایا کہ میرا پیغام پوری انسانیت کیلئے ہے۔اخوت کا سرچشمہ وہی پیغام ہے۔فیصل مسعود اوران کے دوستوں نے اخوت کے ساتھ تعاون کو ایک منظّم شکل دینے کا وعدہ کیا۔ کیفے کے مالک نے بھی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ رہنے دی۔

اسی تقریب میں ہماری ملاقات طارق صاحب سے ہوئی جو قاضی فاؤنڈیشن چکوال کے قاضی محمد اشرف کے دوست ہیں۔ قاضی اشرف امریکہ میں رہتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ ''چکوال اور پاکستان کا قرض ابھی میرے کندھوں پر ہے''۔انہوں نے یہ فاؤنڈیشن چکوال سے اپنی محبت کے اظہار کیلئے بنائی اور اتنی فیاضی سے عطیات دیئے کہ ایک نئی کہانی رقم کردی۔طارق صاحب ایک روز قبل ایک طویل سفر کے بعد امریکہ واپس پہنچے تھے لیکن قاضی اشرف نے انہیں اخوت کے بارے میں اتنا کچھ بتایا کہ وہ ملاقات پہ مجبور ہوگئے۔ تقریب کے اگلے روز بھی وہ وقت نکال کے ملنے آئے۔ نیویارک کی سڑکوں پہ گھومنے کے بعد ہم دیر تک ایک افغانی کیفے میں بیٹھے رہے۔طویل گفتگو۔ بہت سے سوال۔آپ اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔اخوت کی اگلی منزل کیا ہے۔ مجھے یہ باتیں بھی اچھی لگیں اور افغانی کیفے کا وہ ماحول بھی۔سماوار' فنجان' قہوے کی خوشبو اور خدمت کا سلیقہ۔ طارق صاحب سٹیزن فاؤنڈیشن کے ڈونرز میں شامل ہیں۔سٹیزن فاؤنڈیشن نے پاکستان میں تعلیمی انقلاب برپا کردیا ہے۔ انتہائی پسماندہ علاقوں میں اعلیٰ معیار کے حامل ایک ہزار سکول۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔کاوش ٹرسٹ' سٹیزن فاؤنڈیشن' غزالی فاؤنڈیشن' پاک ٹرکش سکول اور طاہر یوسف کے ٹرسٹ سکول۔ یہ وہ ادارے ہیں جنہوں نے گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے زروجواہر کو ڈھونڈا اور پھرانہیں اپنے سر کا تاج بنایا۔ طارق صاحب کے ساتھ تعلیم کیلئے قرضِ حسن کے علاوہ یونیورسٹی کے قیام پر بھی بات ہوئی۔انہوں نے اخوت یونیورسٹی کے منصوبے میں گہری دلچسپی لی اور مدد کا وعدہ بھی کیا۔

5.28۔اخوت یونیورسٹی

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد۔

میں طارق خان کو بتارہا تھا کہ یونیورسٹی کا خواب بھی کوئی نیا خواب نہیں۔ یہ خواب بھی اخوت کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا رہا۔بیس برس پہلے میں امریکہ میں ''مونٹی چیلو'' کے وزٹ پہ گیا تو اس خواب نے پہلی کروٹ لی۔

مونٹی چیلو امریکہ کے تیسرے صدر تھامس جیفرسن کی رہائش گاہ تھی۔اس نے اپنی زندگی کے آخری دن یہیں گذارے اور پھر یہیں پر دفن ہوا۔مونٹی چیلو میں ایک کتبے پہ تھامس جیفرسن کی یہ تحریر درج تھی............''میں امریکہ کا صدر رہا لیکن میری خواہش ہوگی کہ میں ایک ایسے شخص کے طور پر پہچانا جاؤں جو ایک یونیورسٹی کا بانی تھا''......اور یوں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی آف ورجینیا کا وجود عمل میں آیا۔ترقی کا راستہ بھی شاید یہی ہے۔ عارضی تبدیلی لانا ہو تو کسی کو کاروبار کے لئے سرمایہ فراہم کردو اور دائمی تبدیلی لانا ہو تو اس کا رشتہ کاغذ، قلم اور کتاب سے جوڑ دو۔مونٹی چیلو کے اس سفر کے بعد اخوت یونیورسٹی کا خواب بھی زندگی کا حصہ بن گیا۔ایک ایسی درس گاہ کا خواب جہاں علم کو کاروبار نہ سمجھا جائے۔ جہاں وہ بچے پڑھیں جن کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ پہلے سمسٹر کی فیس ہی ادا کر سکیں۔عبدل اور راشد۔ان کا بھی تو حق ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ غربت کی زنجیر کاٹنے کیلئے تعلیم ہی تو اصل تیشہ ہے۔بارک اوباما حسین اگر ہارورڈ نہ پہنچتا تو امریکہ کا صدر نہ بن پاتا۔

یونیورسٹی کا خواب ہمیں ناصر محمود کھوسہ کے پاس لے آیا۔پنجاب کے چیف سیکریٹری۔سول سروس میں لوگ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں مانگتے۔ ہم نے ان سے ذکر کیا۔ مجھے لگا ان کا شوق شاید ہم سے بھی زیادہ تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا اور ہماری مکمل مدد کی ہامی بھر لی۔ بات حتمی منظوری کیلئے وزیراعلیٰ تک پہنچی۔اخوت یونیورسٹی کا منصوبہ جب کیبنٹ میٹنگ میں پیش ہوا تو جو پہلی آواز اس کے حق میں بلند ہوئی وہ کسی اور کی نہیں خود وزیراعلیٰ پنجاب، شہباز شریف کی تھی۔انہوں نے اخوت کی خدمات کو بے حد سراہا۔ اخوت کے بارے میں انتہائی اچھے خیالات کا اظہار کیا اور فوری طور پر زمین کی فراہمی کا اعلان کر دیا۔ہم نے حکومت سے اور کچھ مانگا بھی نہ تھا۔ میٹنگ میں موجود ایک صاحب نے اعتراض کیا تو وزیراعلیٰ نے کہا......پٹرول پمپوں اور سی این جی سٹیشنوں کے لیے زمین بٹتی ہے تو آپ اعتراض نہیں کرتے لیکن تعلیم کیلئے آواز اٹھے تو آپ معترض ہوتے ہیں۔اس کے بعد بحث کی گنجائش نہ تھی۔وزیراعلیٰ اور چیف سیکرٹری دونوں کا حکم تھا کہ زمین کی منتقلی میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ ہو۔ادھر ہمارا عزم ہے کہ چند سال کے اندر یونیورسٹی کا آغاز ہو جائے۔یہ بھی عزم ہے کہ اس یونیورسٹی میں طالب علموں سے معمولی فیس لی جائے۔بس یونیورسٹی کا ایک بنک اکاؤنٹ ہو جس میں والدین اپنی استطاعت کے مطابق جو کچھ دے سکیں جمع کروا دیں۔ جو

ایک روپیہ دے سکتا ہے، وہ ایک روپیہ دے۔ جو ایک لاکھ دے سکتا ہے، وہ ایک لاکھ دے۔ نہ تکرار کی جائے نہ تقاضا کہ علم کا فروغ کاروبار نہیں فریضہ ہے۔ اس کی خرید وفروخت سے بہتر ہے کہ اس کی جستجو ہی چھوڑ دی جائے۔ میرے محترم استاد صابر لودھی نے ایک روز بتایا کہ گورنمنٹ کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد بھی ایسی ہی کسی درسگاہ کا خواب دیکھتے تھے۔ لیکن یہ یونیورسٹی بنے گی کیسے؟ طارق خان نے سوال کیا۔

5.29۔ یونیورسٹی کیسے بنے گی

آئیڈیل ازم زندگی سے کی جانے والی ضد کو کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

اخوت یونیورسٹی بھی ایسی ہی ایک ضد ہے۔

یہ ضد کیسے پوری ہوگی۔ آج سے بارہ سال پہلے کوئی یہ سوال پوچھتا تو شاید ہم اس کا جواب نہ دے پاتے۔ لیکن اب ہمارے پاس اس کا جواب موجود ہے۔ اخوت کی کہانی ایسے بہت سے سوالوں کا جواب ہے۔ اگر بلاسود قرضے ہو سکتے ہیں تو بلا فیس تعلیم بھی ہو سکتی ہے۔ مواخات کا ماڈل ہمارے سامنے ہے بس اسے دہرانا ہے۔ پہلے مرحلے میں تعمیر کیلئے تیس کروڑ روپے درکار ہیں۔ دوستوں نے کہا ایک اینٹ کی قیمت ایک ہزار روپے ہونی چاہیے۔ گویا ہمیں صرف تین لاکھ اینٹیں بیچنی ہیں۔ کیا ملک بھر میں ایسے تین لاکھ لوگ بھی نہیں جو اپنے رزق میں سے صرف ایک ہزار روپے ہی دے سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ صرف لاہور میں بیسیوں ایسے لوگ ہیں جو اس یونیورسٹی کا سارا خرچ اٹھا سکتے ہیں اور پھر اہلِ خیر لاہور میں ہی نہیں پورے ملک میں رہتے ہیں۔ کراچی میں تو اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اب تو پاکستانیوں پہ دولت ہُن کی طرح برستی ہے۔ وہ چاہے امریکہ میں ہوں، یورپ میں یا مشرقِ وسطیٰ میں۔ ہمیں صرف یہ باور کروانا ہے کہ نیکی صرف یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ اپنا مال قربان کرو، زکوٰۃ دو اور اس حقیقت کو مان لو کہ جان اور مال لٹانے والے ہی تقویٰ کی منزل کو پہنچ پاتے ہیں۔ اہلِ ثروت کے علاوہ اخوت کے بہادر ساتھی اور دو لاکھ Borrowers بھی تو ہیں۔ یہ دنیا کی پہلی یونیورسٹی ہوگی جو غریبوں کے پیسوں سے بنے گی۔ ہمیں علم ہے ان لوگوں کے لئے ایک ہزار روپے کی اینٹ خریدنا مشکل ہوگا لیکن یہ بھی یقین ہے کہ اگر موقعہ آیا تو وہ یہ کام ضرور کریں گے۔ وہ بھی تو اس دیوانگی کے اسیر ہیں جس کا نام اخوت ہے۔ یہ لوگ مالی طور پر غریب ہو سکتے ہیں لیکن یہ کردار کے غریب نہیں اور یہ بات انہوں نے بارہا ثابت کی ہے۔ یہ قربانی

صرف ابتدائی دس بیس سال کی بات ہے۔ پھر تو یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلباء ہی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کا بوجھ اٹھائیں۔ احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کیا ہوگا۔ سیکڑوں ڈاکٹرز' انجینئرز' پروفیشنلز' اہلِ علم' اہلِ قلم۔ جس مادرِ علمی کے اتنے سپوت ہوں اس کی مانگ بھلا کیسے ویران ہو سکتی ہے۔'' طارق بھائی! مالی استحکام کی فکر انہیں ہوتی ہے جو کاروبار کیلئے آئے ہوں۔ جو بازارِ حیات میں آئے ہی لٹنے کیلئے ہوں انہیں سود و زیاں کا کیا اندیشہ۔ اخوت یونیورسٹی کا فنانشل ماڈل دیکھ کے لوگ حیران ہوتے ہیں لیکن مؤاخات پہ یقین رکھنے والوں کیلئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں''......آئیڈیل ازم زندگی سے کی جانے والی ضد کو کہتے ہیں۔ جنوں کا مرض لاحق ہو تو زندگی اس ضد کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔

5.30۔ کارِ جہاں دراز ہے

اخوت کے افق پر بہت سے دیئے روشن نظر آتے ہیں۔ میں طارق خان کو بتا تا رہا۔

ہر چھوٹے بڑے شہر میں ایک دفتر۔ ایثار اور قربانی کی فضا۔ بہت سے لوگ' اپنا کاروبار' خود انحصاری اور خوشحالی' کاروبار کے اچھے اصول ' جہالت کا خاتمہ' علم کی روشنی' صاف ستھرا ماحول' ترقی کے یکساں مواقع' نظم و ضبط' خواتین' محروم طبقوں اور اقلیتوں سے یگانگت' یکساں نظامِ تعلیم' امانت' دیانت' صلحِ کل' گداگری کا خاتمہ' تعلیم' صحت' صاف پانی' بنیادی سہولتوں کی فراہمی اور پھر سب سے بڑھ کر اخوت یونیورسٹی اور اخوت صدقات بنک!

ان میں سے کچھ کام ریاست کے ہیں اور کچھ نجی شعبہ کے لیکن ان کاموں کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب ان میں فرد کی شمولیت بھی ہو۔ اس شمولیت کا ایک راستہ مؤاخات ہے۔ اپنی خوشی کے ساتھ دوسروں کی خوشی۔ ترقی کی منزل تک پہنچنے کیلئے پہلا کردار اداروں کا نہیں بلکہ فرد کا ہے۔ فرد کی رضامندی شرطِ اول ہے۔ فرد کی تبدیلی معاشرے کی تبدیلی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ اخوت اسی تبدیلی کی دستک ہے۔ فرد کو یہ احساس دلانا کہ وہ بدلے گا تو زمانہ بدلے گا اور پھر یہ بتانا کہ وہ تنہا نہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی اس کی بھلائی کا سوچتے ہیں۔ جب اسے یہ یقین ہو جائے تو پھر اسے بھی لینے سے دینے والا بنانا۔ دوسروں کیلئے جینے کا پیغام دینا۔ فرد کی تبدیلی اور پھر اس کے ذریعے معاشرے کی تبدیلی اور ان اداروں کا قیام جو اس تبدیلی کو آگے بڑھائیں۔ افراد اور ادارے۔ ایک' دو نہیں' دس' بیس' ہزاروں' لاکھوں۔ لیکن یہ سارا کام ایک دن میں ہونے والا نہیں۔ یہ

ایک پراسیس اپروچ ہے۔اس کیلئے وقت درکار ہے۔

''آپ نے یہاں بنک کی بات کی۔کہیں یہ تضاد تو نہیں۔بنک تو سود کو آگے بڑھاتا ہے۔'' طارق صاحب نے ٹھہرتے ٹھہرتے ایک اور سوال کیا۔ بنک سے میری مراد بنکاری کا مروجہ نظام نہیں بلکہ اخوت کی طرح صدقات کا مستقل فنڈ ہے جو ایک مالیاتی ڈسپلن کے تحت کام کرے اور یہ صدقات صرف قرضِ حسن کیلئے استعمال ہوں۔آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں اسلامی بنک' صدقات بنک یا Non-Banking Financial Institution۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اتنے صدقات کیسے اکٹھے ہوں گے۔شاید انہیں خدا کے اس اعلان پہ یقین نہیں کہ'' میں سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہوں''(البقرہ 276)۔سود اور صدقات کا ایک ہی جگہ تذکرہ شاید اسی لیے ہے کہ سود کا خاتمہ صرف صدقات سے ممکن ہے۔کوئی ایک بل گیٹس' کوئی ایک وارن بفٹ۔اگر یہ دو افراد مل کر ایک سو بلین ڈالر یا دس ہزار ارب روپے''صدقہ'' کر سکتے ہیں تو پاکستان کے بل گیٹس اور وارن بفٹ ایسا کیوں نہیں کریں گے۔وہ بائیس خاندان جواب بڑھ کر کئی سو بن چکے ہیں۔جن کی زائد دولت Surplus Wealth بھی کئی ہزار ارب سے زائد ہے۔بقول کرِس ہان یہ دولت ان کے کسی کام کی نہیں لیکن تاریک بستیوں کے اندھیرے اس دولت سے دور ہو سکتے ہیں۔

اخوت کے افق پر بہت سے دیئے روشن نظر آتے ہیں۔

5.31۔نیویارک سے روانگی

اگلی صبح۔میں باہر نکلا تو سورج کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔چھوٹے' چھوٹے گھروں کی ایک طویل قطار۔دیوقامت درخت اور سرسراتی ہوئی تیز ہوا۔آج نیویارک میں آخری روز تھا۔تین ہفتے قبل میں جب یہاں پہنچا تو اندازہ نہ تھا کہ یہ سارا وزٹ اس قدر بھرپور ہوگا۔مشرق سے مغرب اور پھر شمال سے لے کر جنوب تک۔کتنے ہی شہر' کتنی ہی درس گاہیں۔ Reaching One Thousand Americans نامی مہم کتنی کامیابی سے اختتام کو پہنچی۔پائیلو کوہلو نے سچ ہی تو کہا تھا کہ اگر انسان کسی مقصد کو دل کی گہرائیوں سے اپنا لے تو پھر ساری دنیا اس کی رفیق بن جاتی ہے۔کچھ ایسی ہی کیفیت یہاں بھی تھی۔رنگ' نسل اور مذہب کوئی شے راہ میں مزاحم نہ ہوئی۔محبت کا پیغام' محبت بن کے پھیلتا رہا۔اک

پھوارسی تھی جو ہلکے ہلکے برستی رہی۔ انسان خدا کی سب سے خوبصورت تخلیق ہے۔ اسے نیکی ہی اچھی لگتی ہے۔ میں کچھ دیر فخر کے گھر کے باہر کھڑا نیویارک کی اس نئی صبح کو دیکھتا رہا جہاں ہزاروں' لاکھوں لوگ اپنے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ ایسی ہی کوئی پرامن صبح میرے وطن پہ بھی طلوع ہوگی۔ پشاور' اسلام آباد' لاہور' کراچی' کوئٹہ اور گلگت۔

میں لان میں کھلنے والے بیرونی دروازے کے شیشے کو دیکھنے لگا جہاں ایک چھوٹی سی گھنٹی لٹک رہی تھی۔ تھوڑی' تھوڑی دیر بعد کوئی چڑیا آتی' شیشے میں اپنا عکس دیکھتی اور اپنے نازک پروں سے گھنٹی کو چھیڑ کے اڑ جاتی۔ شاید وہ مکینوں کو بتانے آتی کہ اٹھئے صبح تو کب کی ہو چکی............! میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا ہوا واپس کمرے میں آیا۔ سامان اکٹھا کرنا' خاص طور پر جب واپسی کا سفر سامنے ہو کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ میں مختلف لفافوں کو ایک لفافے میں اور پھر ایک لفافے کو مختلف لفافوں میں ڈالتا رہا۔ فرش پہ کتابیں بکھرنے لگیں۔ کچھ دعوت نامے' کچھ تحفے' کچھ سوونیئر:

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

انہی بکھری ہوئی چیزوں میں مجھے اخبار کے تین تراشے نظر آئے۔ یہ تین کالم تھے جو مختلف ایام میں اخوت کے بارے میں لکھے گئے۔ ان تینوں میں اخوت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی۔ میں انہیں دوبارہ پڑھنے لگا۔ سود نہیں قرضِ حسن' کامیابی کی کہانیاں اور اپنے اپنے حصہ کی ذمہ داری۔ اوریا مقبول جان' عامر خاکوانی اور عرفان صدیقی۔ یہ کالم اسی نئی صبح کے نقیب ہیں جس کا خواب میں چند لمحے پہلے لان میں کھڑا ہو کے دیکھ رہا تھا۔

5.32۔ سود نہیں قرضِ حسن: اوریا مقبول جان

اوریا مقبول نے اپنے اس کالم میں جو لکھا وہ شاید بہت سے لوگوں کے دل کی آواز ہے۔

''جس ملک میں ہر سال اربوں روپے کرپشن میں ڈوبے ہوئے اداروں کو دیئے جاتے ہوں' جہاں کبھی بے نظیر انکم سپورٹ' کبھی بیت المال اور کبھی کسی اور سکیم کے تحت اربوں روپے کی خیرات دی جاتی ہو' جہاں

سستی روٹی، مفت تعلیم اور مفت کتابوں کے نعروں پر اربوں روپے خرچ کئے جاتے ہوں۔لیکن اگر کوئی حکمرانوں کوایک مشورہ دے کہ ان سارے پیسوں کوملا کر بینکاری کا ایک ایسا نظام شروع کریں جو قرضِ حسن کی بنیاد پر قائم ہو،تو سب کی جبینوں پر بل پڑنے لگتے ہیں۔سب کے سب مشورہ دینے والے کو دقیانوس اور فرسودہ کہنے لگتے ہیں۔طرح طرح کے سوال اٹھتے ہیں۔ان عظیم دانشوروں اور معاشی تجزیہ نگاروں کو میرے اللہ نے صرف تین سال پہلے ایسا جواب دیا کہ ان سب کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں۔صرف تین سال پہلے کی بات ہے جب امریکہ، برطانیہ اور سود کے بل بوتے اور ناجائز دھن دولت کی بدولت آباد ہونے والا دبئی اس طرح ڈوبے کہ اربوں ڈالر یوں لگتا تھا کہ سمندر کی نذر ہو گئے۔وہ جائیدادیں جن کی قیمتیں گھنٹوں کے حساب سے بڑھتی تھیں انہیں کوڑیوں کے مول بھی خریدنے والا کوئی نہ تھا۔بینکوں کے دروازوں پر تالے پڑ گئے تھے۔تو ایسے میں امریکہ اور برطانیہ نے اپنی معیشتوں کو مستحکم کرنے کے لیے شرح سود کو صفر کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔یعنی عملی طور پر سود کو ختم کر دیا تا کہ ان کی معیشت پھلے اور پھولے۔مدتوں سے سود کی بنیاد پر چلتی ہوئی معیشتوں نے تسلیم کیا کہ معیشت کو استحکام دینا ہو تو سود کو ختم کرنا ہوگا۔لیکن ہمارے کسی سیاستدان، معیشت کے ماہر اور اقتصادی امور کے تجزیہ نگار نے اس واضح علامت سے بھی کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔

یہ سبق ہم کیوں حاصل نہیں کرتے۔ہم جن کے گھروں میں قرآن پاک کسی پاک صاف مقام پر ضرور موجود ہوتا ہے اور ہم میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے قرآن پاک کی وہ آیت بھی پڑھی ہو گی جس میں اللہ نے سود کا کاروبار کرنے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔لیکن ہمارے ہر چوراہے پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ کے بڑے بڑے بورڈ جگمگاتے ہیں، اس کی دکانیں کھلی ہیں، ان کے خوشنما ترغیبات کے اشتہار اخبارات اور ٹی وی کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ایسا کیوں ہے۔کیا کسی نے سارے بینکاری نظام پر غور کیا ہے جس کو لندن میں آباد ان یہودی سناروں نے شروع کیا جن کے پاس لوگ سونا رکھتے تھے اور وہ اس کے عوض ایک چٹ دیا کرتے تھے جس سے لوگ خریداری کرتے تھے۔پھر ایسا ہونے لگا کہ ایک تولہ رکھوا کر تھوڑا سا پیسہ دینے سے لوگ دو تولے یا تین تولے کی چٹ بھی جاری کروا لیتے۔یوں ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جن کے پاس لوگوں کا سرمایہ تھا اور وہ جس کو

جس طرح چاہتے دیتے، جس کاروبار میں چاہتے استعمال کرتے اور سونا بے شک کم ہو جتنی چاہے چیٹیں جاری کر دیتے۔ یوں ان یہودی سناروں نے برطانیہ میں بینک آف انگلینڈ کی بنیاد رکھی اور ایک ایسے سسٹم کا آغاز کیا جس کے تحت لاکھوں لوگوں کی تھوڑی تھوڑی بچتیں سود کا لالچ دے کر اکٹھی کی جائیں اور انہیں چند من مانے افراد کو دیا جائے اور وہ جو چاہے اس سے کریں، کاروبار کر کے ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کریں، نقصان ہو تو دیوالیہ کہلا کر غریب عوام کی جمع پونجی ہڑپ کر لیں۔ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک ایک یا ڈیڑھ فیصد انتظامی اخراجات لے کر ملکوں کو قرضہ دیتے ہیں اور ہمارے حکمران بہانہ یہ کرتے ہیں کہ ہم سودی نظام کے گھن چکر سے کیسے نکلیں۔

میرے ملک کے حکمران طبقوں کو غریب کے پیسوں کی ایسی لت پڑی ہوئی ہے کہ اس وقت پاکستان میں موجود تمام بینکوں سے حکومت نے قرضہ لے رکھا ہے اور وہ مہنگی شرح سود پر۔ ہم بجٹ کا خسارہ یا تو سناروں کے کاغذوں کی طرح نوٹ چھاپ کر پورا کرتے ہیں یا پھر لوگوں کے بینکوں میں پڑے ہوئے پیسے ہضم کر کے۔ ہماری ساری کی ساری معیشت ان پیسوں کے گرد گھومتی ہے جو لوگوں نے یہ سمجھ کر بینکوں میں محفوظ کر رکھا ہے کہ کل ان کے کام آئیں گے۔ اس وقت بینکوں کے اس خزانے کا ستر فیصد سے زیادہ حکومت کو قرض دیا جا چکا ہے اور حکومت ان بینکوں کو جو سود ادا کر رہی ہے اس سے ان بینکوں کی عالیشان عمارتیں ائیر کنڈیشنڈ دفاتر، بہترین کاریں اور اللّے تللّے چل رہے ہیں۔ ''دکھ جھیلے بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں''۔ اس بی فاختہ یعنی عوام کو دکھ جھیلنا ہی چاہیے کہ اس نے یہ تصور کر لیا ہے کہ شاید اللہ کے خزانوں میں کوئی کمی واقع ہونے والی ہے اس لیے آنے والے کل کا بندوبست کر لیا جائے۔

لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس بینکاری نظام کا جو معیشت کی بنیاد بن چکا ہے توڑ کیا ہے۔ یاروں نے اسلامی بینکاری کے نام پر توڑ نکالنے کی کوشش کی لیکن وہاں بھی اجارہ دار بینک، آپ سے پیسے اکٹھے کئے، جہاں چاہے لگا دیئے اور بتایا اتنا منافع اور اتنا نقصان۔ اب جو سرکار کو سولہ فیصد سود پر رقم دی جا رہی ہے یہ کونسا اسلامی کاروبار ہے۔ لیکن ہم خوش کہ اسلام کے مطابق ہمارا روپیہ محفوظ ہے۔ اسلام اس قسم کی تجارت اور نفع و نقصان کو پسند نہیں کرتا جس میں آپ کو علم تک نہ ہو کہ مال حرام کاروبار میں لگ رہا ہے یا حلال میں۔ اسلام کے ہاں اگر کوئی تصور بینک کا ہو سکتا ہے اور بن سکتا ہے تو وہ یہ کہ ایک ایسا ادارہ جس کے پاس ایک

طویل لسٹ موجود ہو جہاں پر سرمایہ کاری کی جا سکے، لوگ آ کر مرضی سے اپنا ادارہ چنیں، وہاں روپیہ خود اپنی مرضی سے لگائیں اور بینک ایک ملازم کی طرح وہاں ان کے روپے کی دیکھ بھال کرے اور اس کی تنخواہ وصول کرے۔ لیکن ایسا نہ سرمایہ دار ہونے دے گا اور نہ حکومت کیونکہ اس میں سب کے مزے ہی مزے ہیں۔ پیسہ کسی اور کا، لوٹ کر کھائے کوئی اور، اور سود بینک والوں کی عیاشیوں کا باعث بنے۔ میرے اللہ نے سود کے توڑ کیلئے صرف ایک ہی راستہ بیان کیا ہے قرضِ حسن۔ جس ملک میں ایک اکیلا شخص ڈاکٹر امجد ثاقب اخوت کے نام پر کئی برسوں سے قرضِ حسن کی سکیم چلا رہا ہو، اور غریب لوگ اسے رقم واپس بھی کریں اور چھوٹے موٹے کاروبار سے اپنے پاؤں پر کھڑے بھی ہو جائیں، وہاں اگر حکومت یہ سوال کرے کہ اس نظام کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ اللہ کے نام پر حاصل کیے گئے ملک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کی دکانیں کھلی ہوں، ڈھول بجا کر میڈیا پر نقارۂ جنگ بج رہا ہو اور توقع یہ کہ ہم پر رحم ہو گا، ہم پر عذاب نہیں اترے گا، ہم امن اور چین سے زندگی گزار لیں گے''۔

اوریا مقبول کے اس کالم کے نیچے عامر خاکوانی کا کالم پڑا تھا۔ اوریا مقبول کی شعلہ نوائی میں بغاوت کا درس ہے لیکن عامر خاکوانی ''جوئے نغمہ خواں'' کی طرح اپنا پیغام دیتا ہے۔

5.33۔ کامیابی کی کہانیاں: عامر خاکوانی

''یہ پچھلے جولائی کی ایک آگ برساتی دوپہر تھی۔ نہر کنارے ایک نجی یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں اخوت کے بہترین انٹرپرینیورز کا انتخاب ہونا تھا۔ جن لوگوں نے اخوت کے بلاسود قرضوں سے اپنے کاروبار بہترین طریقے سے چلائے، ان میں سے چند لوگ ایوارڈ کے لیے منتخب کرنے تھے۔ یہ ایک عجب انداز کی تقریب تھی۔ باری باری لوگ آتے۔ شرماتے ہوئے، سادہ، تصنع سے عاری، دھلے ہوئے بے شکن لباس پہنے، مگر پہلی نظر میں اندازہ ہو جاتا کہ وہ اس طرح کے ''پرتکلف'' لباس کے عادی نہیں۔ جھجکتے ہوئے بولنا شروع کرتے، مگر جیسے ہی ان کی محنت اور اس سے حاصل ہونے والی کامیابیوں کا ذکر آتا، ان کے لہجے میں ایک خاص انداز کا تفاخر آ جاتا۔ فخر سے ذکر کرتے کہ ہم نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے اور اپنی محنت سے زندگی کا راستہ بنایا۔ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا۔ میں پہلی صف میں بیٹھا مبہوت انہیں تکتا رہا۔ ان میں خواتین تھیں، ضعیف بزرگ اور معذوری کے شکار افراد بھی۔ گرین ٹاؤن کا ایک نوجوان موٹر سائیکل مکینک آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک دکان پر بطور

مکینک کام کرتا رہا، سو روپے دہاڑی ملتی تھی۔ کسی نے اخوت کا بتایا، دس ہزار روپے قرضِ حسن لے کر ایک دکان لے لی، دن رات محنت کی، آمدنی تین گنا بڑھ گئی۔ دھوپ سڑی، سانده کے ایک امام مسجد نے بتایا کہ ان کی آمدنی کا دارومدار جمعہ کی نماز میں نمازیوں کی جانب سے دیئے گئے چندے پر تھا۔ مشکل سے گزراوقات ہوتی۔ کسی کے مشورے پر پانچ ہزار روپے قرضِ حسن لیا اور شاپنگ بیگ لے کر اعظم کلاتھ مارکیٹ میں فروخت کرنا شروع کیا۔ شروع میں سائیکل پر جاتا، پھر قسطوں پر موٹر سائیکل لیا، دو تین گھنٹے روزانہ جا کر ڈیڑھ سو روپے یافت ہو جاتی۔ یوں زندگی آسان ہو گئی بچوں کو بھی سکول میں داخل کرا دیا۔ ہر ایک کہانی دوسرے سے زیادہ پُرعزم اور چونکا دینے والی تھی۔ خواتین آئیں جنہوں نے معمولی رقم سے گھر میں سلائی کڑھائی اور دبکے کا کام شروع کیا۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے گھر کے دروازے ہی میں کریانہ کی چھوٹی سی دکان لگائی، اس آمدنی سے نہ صرف بچیوں کی شادیاں کیں، بلکہ اپنے دمہ کے مریض خاوند کے ساتھ عمرہ بھی کر لیا۔

ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص آیا۔ اس کی کہانی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بتانے لگا ''میں نے انٹرمیڈیٹ کیا ہوا ہے، ایک نجی کمپنی کے دفتر میں اچھی بھلی نوکری تھی، بچے درمیانے درجے کے پرائیویٹ سکول میں داخل تھے، سفید پوشی سے گزارا ہو رہا تھا۔ ایک دن کمپنی منیجر سے لڑائی ہو گئی، اس نے مالک کو شکایت لگا دی، جس نے دس بارہ سالہ ملازمت کا احساس کیے بغیر فوراً فارغ کر دیا۔ یہ دھچکا اس قدر شدید ثابت ہوا کہ پوری زندگی ہی بدل گئی۔ دوسری ملازمت حاصل کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ کئی مہینے گزر گئے۔ گھر میں موجود جمع پونجی لگ گئی۔ بیوی کے چھوٹے موٹے زیور بھی بک گئے۔ نوبت فاقوں تک آ گئی۔ محلے کے دکانداروں نے ادھار سامان دینا بند کر دیا۔ دوست، رشتہ دار ادھار دے کر تنگ آ گئے حتیٰ کہ انہوں نے فون اٹھانے چھوڑ دیے۔ ملنے جاتا تو اندر سے کہلوا دیتے کہ موجود نہیں۔ ایک روز جب بیوی بچے پر تیسرے وقت کا فاقہ آ گیا تو ارادہ کیا کہ اس ذلت کی زندگی سے مر جانا ہی بہتر ہو گا۔ زہر تک خریدنے کے پیسے نہیں تھے۔ اچانک خیال آیا کہ عرصہ پہلے چوہے مار زہریلی گولیاں خریدی تھیں۔ گولیوں کا وہ پیکٹ ڈھونڈا اور انہیں پیس کر سفوف بنا لیا۔ کچن میں جا کر عرصے سے رکھے پرانے گڑ کا شربت بنایا، اس میں وہ سفوف ملا کر حل کیا اور جگ لے کر بیوی بچوں کو بلایا۔ بیوی حیران ہوئی کہ روٹی تک کے پیسے نہیں ہیں تو یہ شربت کیوں بنا لیا۔ میں نے بیوی بچوں سے کہا کہ یہ شربت پی لو تو تم لوگوں کو ایک خوشخبری سناؤں گا۔ وہ خوش ہو گئے۔ گلاس میں

شربت انڈیل کر بڑی بیٹی کو دینے لگا تو میرے چار سالہ بیٹے نے جھپٹ کر گلاس لے لیا، فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا، کہنے لگا، ابو پہلے میں پیوں گا، تاکہ خوشخبری سب سے پہلے سن سکوں۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ میرے بچوں کو میرے اوپر کس قدر اعتماد ہے، وہ بھاگ بھاگ کر میرے ہاتھ سے زہر کا بھرا ہوا گلاس لے رہے ہیں، انہیں یقین ہے کہ ان کا باپ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس ایک لمحے نے مجھے لرزا دیا۔ میں نے گلاس واپس چھینا اور زہریلا شربت کچے صحن کے ایک گوشے میں انڈیل دیا۔ اگلی صبح میں نے اپنا سائیکل اٹھایا اور اپنے ایک واقف کار کباڑی کے پاس گیا، اسے جا کر کہا کہ میں پھیری لگا کر کباڑ کا سامان لے آتا ہوں۔ وہ حیران ہوا، کہنے لگا کہ تم یہ معمولی کام کر سکو گے؟ جواب دیا، اپنے گھر والوں کے لیے میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔ سائیکل پر محلوں کے چکر لگاتا رہا، کہیں سے ردی، کہیں سے پرانی بوتلیں، جوتے وغیرہ اکٹھے کرتا رہا۔ شام کو گھر واپس آیا تو اتنے پیسے تھے کہ کھانا پک سکے۔ رفتہ رفتہ کام کا سلیقہ آتا گیا، آمدنی بھی بڑھتی گئی۔ پھر کسی نے اخوت کا بتایا تو ان سے قرضِ حسن لے کر خود کباڑی بن گیا۔ آج کئی پھیری والے میرے پاس ملازم ہیں۔ بچے دوبارہ سکول میں داخل ہو چکے ہیں۔ بڑے بیٹے نے تو اس سال اپنی کلاس میں پوزیشن حاصل کی ہے۔ گھر میں فریج بھی لے لیا ہے، موٹر سائیکل قسطوں پر لے چکا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ لوگوں میں سے بعض کا تعلق اخبارات سے ہے۔ میرا صرف ایک پیغام لوگوں تک پہنچا دیں کہ محنت میں عظمت ہے اور کوئی کام بھی بُرا نہیں ہوتا۔ پڑھے لکھے شخص کو بھی وقت آنے پر مزدوری کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ان صاحب (نام دانستہ نہیں دیا) کی تقریر آج بھی میرے ذہن میں گونجتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر اس روز ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں شفقت پدری غالب نہ آ جاتی اور وہ اپنے ہاتھ سے محنت مزدوری کرنے کو عار سمجھتا تو ایک اور المیہ اخبارات اور چینلز کی زینت بن جاتا۔ البتہ اس کی روایت شکنی اور عظمت کی مثال قائم کرنے پر کسی نے دو سطر کی خبر بھی شائع نہیں کی۔ ہم لوگ بنیادی طور پر مایوسی کے پیامبر ہیں۔ منفی خبریں ہمیں بھاتی ہیں اور ہم مایوس کن تاریک مثالوں کو اپنی شعلہ بیاں تقریروں اور تحریروں کی زینت بناتے ہیں۔ ہم ان پُرعزم، محنتی اور غربت کو شکست دینے والے گمنام ہیروز کی کہانیاں نظرانداز کر دیتے ہیں کہ یونانی عہد سے لے کر آج تک المیہ اور ٹریجڈی ہی بکتی آئی ہے۔

کرنے والا اصل کام یہ ہے کہ ایسے پُرعزم، بلند حوصلہ لوگوں کی زندگیوں کو مشعل راہ بنایا جائے۔ اس کے

ساتھ جو لوگ زندہ رہنا، موت اور مایوسی کو شکست دینا چاہتے ہیں، انہیں ایک سہارا فراہم کرنا چاہیے۔ اخوت جیسی بلاسود قرضے دینے والی مزید تنظیموں کی شدید ضرورت ہے۔ یہ بھی افسوسناک امر ہے کہ اخوت آٹھ دس برسوں کی محنت، نیک نامی اور کریڈیبلٹی کے باوجود پچاس ساٹھ کروڑ روپے ہی تقسیم کر پائی ہے، اس کا ماہانہ سرکل بھی صرف چند کروڑ تک محدود ہے۔ ہمارے ہاں سود پر پیسے دینے والے لوگ بھی ہیں۔ یہ سود خور مافیا ریکوری کے لیے بدمعاشوں کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ لاہور جیسے شہر میں سڑکوں اور بازاروں پر عام بینر لکھے مل جاتے ہیں، جن میں زیورات اور جائیداد رہن رکھوا کر قرضہ دینے کی ''خوشخبری'' سنائی جاتی ہے۔ حیرت ہے کہ ان سود خوروں سے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں؟

سوال تو یہ ہے کہ آخر حکومت بلاسود یا برائے نام منافع پر قرضے دینے والی تنظیمیں کیوں نہیں بناتی؟ پنجاب حکومت بھی اخوت جیسی تنظیموں کو ایک دو ارب روپے آسانی سے دے سکتی ہے۔ اسی طرح مرکز میں بےنظیر سپورٹ پروگرام کے لیے پچاس ارب روپے رکھے گئے، یہ رقم ایک سال میں یوں اڑ جائے گی کہ اس کا نام و نشاں تک ڈھونڈ ناممکن نہیں رہے گا۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ اس رقم کا ایک حصہ نیک نام تنظیموں کو بطور عطیہ دے دیا جائے اور باقی رقم مائیکرو کریڈٹ میں لگائی جائے تاکہ لوگوں کو اپنے قدموں پر کھڑا کیا جائے۔ اسی طرح بیت المال کے فنڈز سے قرضوں کے بوجھ تلے دبے افراد کی گردنیں آزاد کرائی جائیں۔ یاد رکھیں کہ غربت سے زیادہ مایوسی آدمی کو شکست خوردہ بناتی ہے۔ انہیں امید دلانا، سانس لینے کی مہلت فراہم کرنا ریاست کا کام ہے۔ امدادی کام کرنے والی رفاہی تنظیمیں اپنا کام کر رہی ہیں، مگر اصلاً یہ ریاست کی ذمہ داری ہے''۔

عامر خاکوانی کی یہ تحریر جون 2010 کی ہے۔ پورے ایک سال بعد جون 2011 میں حکومتِ پنجاب نے ایک ارب روپے سے قرضِ حسن فنڈ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری اخوت کے سپرد کر دی۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ تھا۔ اس فیصلے کا اعلان حضرت داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں ہوا جو ہر خاص و عام کیلئے سرچشمۂ فیض ہے۔ شاید یہ بلاسود بنکاری کی طرف اگلا قدم بھی ہو۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی یاد جب بھی آتی ہے سر وفورِ عقیدت سے جھکنے لگتا ہے۔

5.34۔ ناقصاں راپیر کامل کاملاں را راہنما

سید علی ہجویری برِصغیر پاک و ہند کی محبوب شخصیت۔ صوفی ، درویش ، مردِ خدا پرست۔ وہ اس قافلے کے سالار تھے جس کی بدولت برصغیر کے ظلمت کدے میں روشنی پھیلنا شروع ہوئی۔ محبت اور مروت۔ اخوت اور ایثار۔ انسان دوستی اور رواداری۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''کشف المحجوب'' ایک ہزار سال پہلے لکھی گئی۔ حکمت ودانائی کا منبع۔ گنج گرانمایہ۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے کہا اگر کسی کو مرشد میسر نہ ہو تو اس کتاب کا مطالعہ اس کے لئے مرشدِ کامل کی طرح ہے۔ اخوت کی تیسری برانچ حضرت داتا گنج بخشؒ کی مسجد میں قائم ہوئی۔ وہ جگہ جہاں حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ جیسے بزرگوں نے قیام کیا۔ چلّے کاٹے۔ دعائیں مانگیں۔ یہاں اخوت کے کارواں کا تیسرا پڑاؤ۔ یہ 2005 کی بات ہے۔ مرقد کے نیچے سماع ہال کے ساتھ ایک بڑا سا کمرہ ہے۔ وہ کمرہ ملا تو یوں لگا ایک دنیا مل گئی ہو۔ بادشاہی اور کیا ہوتی ہے۔ سیکرٹری اوقاف جاوید اقبال اعوان نے اس کمرے کی چابی پیش کی تو آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اسی پہ کیا موقوف انہوں نے کچھ ہی عرصہ میں تین اور چابیاں بھی دے دیں۔ مسجد حضرت بابا شاہ جمالؒ، مسجد حضرت میاں میرؒ، مسجد مادھولال حسینؒ۔ میں نے ان سے پوچھا آپ نے اس قدر دریا دلی کا مظاہرہ کیوں کیا۔ ''مؤاخات کی نسبت ہی ایسی ہے۔'' ان کا جواب تھا۔ ''اس نام کی نسبت سے آپ جو بھی کہیں گے میں کرتا چلا جاؤں گا۔''

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

داتا گنج بخشؒ کے مسکن کو لوگ عقیدت سے دربار بھی کہتے ہیں۔ داتا دربار۔ لیکن دربار تو بادشاہوں کا ہوتا ہے۔ ہجویر کا سید بادشاہ نہیں، فقیر تھا۔ بادشاہ وہ ہوتا ہے جو جمع کرتا ہے۔ فقیر وہ ہے جو بانٹ دیتا ہے۔ کشف المحجوب میں درج ہے کہ ایک بادشاہ نے فقیر سے کہا، مانگ کیا مانگتا ہے۔ فقیر نے جواب دیا اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں؟ بادشاہ سیخ پا ہوا۔ غلاموں کا غلام۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ فقیر بولا ہاں میرے دو غلام ہیں۔ ایک ''حرص'' اور ایک ''آرزو''۔ یہ دونوں تیرے آقا ہیں اور تو ان کا غلام ہے۔ بھلا! تو مجھے کیا دے سکتا ہے۔ وہی سید علی ہجویریؒ جنہوں نے حرص اور آرزو دونوں کو اپنا غلام بنا کے رکھا۔ جن کے درِ نیاز سے ہزاروں لوگ فیض پاتے ہیں۔ وہی سید علی ہجویریؒ جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا:

سیدِ ہجویر مخدومِ امم　　خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم　　صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت

یہ اسی مقام کی برکت ہے کہ پانچ ہزار لوگوں کی موجودگی میں ایک روز ایک حکمران یہ کہنے کی سعادت حاصل کرتا ہے کہ وہ مؤاخات کے پیغام کو اپنائے گا۔ صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت۔ صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت۔ میری ہر صبح تیرے وجود کی کرنوں سے روشن رہتی ہے۔

5.35۔اپنے حصے کی شمع: عرفان صدیقی

عامر خاکوانی کے علاوہ بہت سے اور لوگوں نے بھی حکومت کی توجہ اس فنڈ کی طرف دلوائی۔ ان میں ایک آواز عرفان صدیقی کی بھی ہے۔ میرے اردگرد بکھرے ہوئے کاغذوں میں تیسرا کالم عرفان صدیقی کا تھا۔

''امتحان کی ہر گھڑی میں میرا یہ یقین واعتماد پختہ ہوتا رہا ہے کہ یہ مٹی واقعی بڑی زرخیز ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ کچھ لوگ تھوڑی سی قربانی دیتے ہوئے اپنا وقت نکالیں' اپنی انتظامی صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور دردمندی کی متاعِ بے بہا کو کسی ٹھوس کاوش میں ڈھال دیں۔ ظلمتِ شب کا شکوہ کرنے کی بجائے اپنے حصے کی کوئی شمع جلا دینے کا چلن عام ہو جائے تو انسانیت کے کتنے ہی زخم بھر سکتے ہیں۔ درد کو ایک پکار' ایک للکار' ایک پیکار میں ڈھالنا اور ایک شفاف' قابلِ عمل نظام میں ڈھالنا...... ''اخوت'' اس ضمن میں ایک شاندار تجربہ ہے۔ اتنا شاندار کہ بنگلہ دیش کے ''گرامین بینک'' کے تجربے سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ گرامین بینک سے جاری قرضوں پر عمومی شرح کا سود لیا جاتا ہے لیکن ''اخوت'' کا فلسفہ فکر ہجرت مدینہ کے وقت انصار و مہاجرین کے درمیان استوار ہونے والے رشتہ ''مؤاخات'' پر مبنی ہے۔ وہی بھائی چارے' ہمدردی اور دست گیری کا جذبہ' وہی باہمی تعاون اور وہی اپنائیت۔ رضا کارانہ جذبے سے سرشار درویشانہ مزاج رکھنے والے ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ افراد' ڈاکٹر امجد ثاقب کی رہنمائی میں معجزے رقم کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی' کسی نوع کا معاوضہ یا اعزازیہ نہیں لیتا۔ ''اخوت'' کے دفاتر میں کوئی فرنیچر نہیں۔ سب فرش پہ بیٹھتے ہیں۔ مسجد' اس تنظیم کا محوری نقطہ ہے جہاں اجلاس بھی ہوتے ہیں اور قرضوں کی تقسیم بھی...... اس مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ صاحبانِ خیر کو سامنے آنا ہوگا۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں اپنے بے وسیلہ بھائی کو

شریک کرنا ہوگا۔ اپنے صدقات وخیرات اور عطیات کوکسی بڑے نظم کی لڑی میں پرونا ہوگا۔ یہ معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ ایک عمومی اندازے کے مطابق آٹھ کروڑ افراد خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ سلیم احمد رانجھا کا خیال ہے کہ ایک سوارب روپے سے ان افراد کے لگ بھگ ایک کروڑ خاندانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ اگر پاکستان کا ایک متمول شخص ایک غریب فرد کی ذمہ داری سنبھال لے یعنی صرف ایک بار بیس ہزار روپے اس نیک کام کیلئے مختص کر دے تو ایک سوارب روپے جمع ہو سکتے ہیں۔

یہ ایک بڑا' شاید بہت ہی بڑا ہدف ہے۔ لیکن اہل عزم و ہمت کیلئے کچھ بھی حد امکان سے باہر نہیں۔ زرخیز ذہنوں کو نئی تجاویز اور قابل عمل پروگراموں کے ساتھ سامنے آنا چاہیے۔ ان کم نصیبوں کیلئے کوئی راہ بہر حال نکالی جانی چاہیئے' جو اچھے خاصے آسودہ حال ہوتے ہیں لیکن کوئی افتاد انہیں پل بھر میں بے سروسامان کر دیتی ہے۔ ان بچوں کے بارے میں سوچا جانا چاہیے جو کسی اعلیٰ اسکول میں پڑھ رہے ہوتے ہیں اور انہیں یک لخت کسی یتیم خانہ جانا پڑ جاتا ہے۔ رات کو سحر کرنا تو شاید مشکل ہو لیکن اپنے حصے کی ایک شمع' تاریکی کم تو کر سکتی ہے' روشنی کا حلقۂ نور بڑھا تو سکتی ہے''۔

5.36۔ تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

وزیر اعلیٰ روزگار سکیم' اخوت کی ایک اہم کامیابی ہے۔ اس کی بدولت ہزاروں لاکھوں نئی شمعیں روشن ہوئیں۔ اس روز مسجد داتا گنج بخشؒ کے سماع ہال میں پانچ ہزار افراد براجمان تھے۔ ہمہ تن' ہمہ گوش......سراپا عقیدت۔ تسبیح کے دانوں کی طرح۔ جیسے انہیں مواخات کی ڈور نے باندھ دیا ہو۔ اخوت کے دس سال مکمل ہوئے تو مختلف تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ یہ تقریب ان میں سب سے بڑی' سب سے پر اثر تھی۔ اس تقریب میں اڑھائی ہزار گھرانوں کو مؤاخات مدینہ کی روایت میں شامل ہونا تھا۔ اخوت کے تمام ساتھی' اہم ڈونرز' بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبران کمشنر لاہور ندیم حسن آصف' سیکرٹری اوقاف طارق پاشا اور نوجوان رضا کار۔ سماع ہال کی وسعت کم پڑنے لگی۔ محبت کی مہک اور ایثار کی روشنی۔ لوگوں کا نظم وضبط اور محویت۔ یہ سب غیر معمولی تھا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی شہباز شریف تھے۔ وہ اسی روز دوپہر کے وقت غیر ملکی دورے سے لوٹ کے آئے تھے۔ ان کے سٹاف کا خیال تھا کہ شاید وہ اس تقریب میں نہ آسکیں۔ لیکن مجھے علم تھا کہ ان کا آنا لازم ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی کو مواخات کے نام پر پکارا جائے اور وہ دامن چھڑا لے۔ وہ جو فیض نے کہا:

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

وزیراعلیٰ عین وقت پر پہنچے۔ یہ ایک انتہائی باوقار تقریب تھی۔ نہ نعرے لگے، نہ تالیاں بجیں۔ مہمان اور میزبان۔ محمود اور ایاز۔ سب زمین پر براجمان تھے۔ نہ تخت، نہ تخت نشین۔ نظم وضبط دیکھ کے وزیراعلیٰ کو بھی حیرت ہوئی۔ اخوت کی دس سال کی کہانی سنائی گئی۔ کچھ ہماری زبانی اور کچھ ان لوگوں کی زبانی جنہوں نے ان قرضوں سے کاروبار شروع کیا۔ وزیراعلیٰ نے اخوت کی خدمات کا اعتراف کیا......"آپ نے دس سال میں ایک ارب کے قرضے دیئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ اتنے قرضے ایک سال میں دیں"۔ یہ تعاون کی پیشکش تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد وزیراعلیٰ کے دفتر میں ایک میٹنگ ہوئی اور ایک ارب کے سرمائے سے وزیراعلیٰ خود روزگار سکیم کی بنیاد رکھ دی گئی۔ بلاسود قرضوں کی شاید یہ سب سے بڑی سکیم تھی۔ اس سکیم کا انتظام ایک شفاف طریقے سے اخوت کو سونپ دیا گیا۔ اکتوبر 2011 میں یہ رقم اخوت کو منتقل ہونا شروع ہوئی اور 3 نومبر 2011 میں قرضوں کی فراہمی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ حضرت بابا شاہ جمالؒ کی مسجد۔ سات سو افراد کا اجتماع۔ ایک بار پھر وزیراعلیٰ نے شمولیت کی سعادت حاصل کی۔ سود سے بغیر قرضے، مسجد سے تعلق اور مکمل شفافیت...... چھ ماہ بعد ہی اس کام کی اہمیت نمایاں ہونے لگی...... ہزاروں خاندانوں کو بلاسود قرضے ملے تو پنجاب حکومت نے قرضوں کے اس فنڈ میں مزید ایک ارب کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بلاسود قرضوں کیلئے دو ارب روپوں پر مشتمل شاید یہ دنیا کا سب سے بڑا فنڈ ہے۔ کبھی کبھی یہ بات ناقابلِ یقین نظر آتی ہے کہ چند ہزار سے شروع ہونے والے ایک ادارے کو حکومت دو ارب کی امین بنا دے۔ اخوت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں......لیکن یہ ادارہ ایک سیاستدان کا مشکور ہے جس نے مواخات کے اس تصور کو سمجھا، سراہا اور پھر اسے اپنانے اور مزید وسعت دینے کا فیصلہ کیا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے مطابق وزیراعلیٰ خود روزگار سکیم پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کی ایک منفرد مثال ہے اور دنیا بھر کو اس مثال کی پیروی کرنا چاہیے۔ مؤاخات کا پیغام، اللہ کا گھر اور ہزاروں افراد کی دعائیں۔ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں۔

5.37۔ اپنے حصے کی شمع

عرفان صدیقی نے جو بات کہی وہی بات احمد فراز نے بھی کہی تھی۔

اپنے حصے کی شمع جلانا بہت بڑا کام ہے۔ اگر ہم صرف یہی کام کر دیں تو تاریکی کم ہو سکتی ہے۔ جگہ جگہ چراغاں کرنا ممکن نہیں لیکن ہر شخص ایک شمع تو جلا سکتا ہے۔ شاید یہیں سے روشنی کی روایت جنم لے۔ میرے سامنے دو تصویریں ابھرنے لگیں۔ دو لوگ دو شمعیں۔ پہلے شخص کا کہنا ہے کہ اس کا نام ظاہر نہ ہو۔ پہلی بار جب وہ اخوت کے دفتر میں آیا تو اخوت کے فلسفہ اور کام سے اس قدر خوش ہوا کہ اگلی صبح دس لاکھ روپے کا عطیہ بھجوا دیا۔ ان دنوں اخوت کے قیام کو بہت عرصہ نہیں گذرا تھا۔ یہ رقم ہمارے لیے بہت بڑی تھی۔ کچھ دن گذر گئے۔ ان صاحب کا دوبارہ فون آیا۔ کہنے لگے جب سے عطیہ دیا ہے ایک عجب مسرت کی کیفیت ہے۔ میں دس لاکھ کا ایک اور چیک بھجوانا چاہتا ہوں۔ ہماری خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ماہ اور گذر گیا۔ انہوں نے پھر رابطہ کیا کہنے لگے ابھی جی نہیں بھرا دس لاکھ اور بھجوا رہا ہوں۔ پھر یہ سلسلہ مسلسل دراز ہونے لگا۔ اگلے دو سال تک تقریباً ہر ماہ دس لاکھ کا چیک وصول ہوتا رہا۔ اسی انکساری اور بے نیازی کے ساتھ۔ صرف ایک شرط تھی کہ نام بتانے کی اجازت نہیں۔ انہوں نے اخوت کی طرف کئی اور لوگوں کو مائل کیا اور یوں ان کے توسط سے اور عطیات بھی ملے۔ ان سب کو جمع کریں تو یہ رقم کئی کروڑ سے تجاوز کرتی ہے۔ ان صاحب سے پہلی ملاقات میرے نزدیک ایک اتفاق تھی۔ لیکن کبھی کبھی لگتا ہے جیسے یہ سب پہلے سے طے ہو۔ کسی عظیم منصوبے یا Grand Design کا حصہ۔ اتنا بڑا واقعہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔

دوسرا واقعہ دوسری شمع۔ یہ واقعہ اسلام آباد کے ایک ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ بہت عرصہ پہلے ان کا فون آیا کہ میں اخوت کو کچھ تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ ہم نے انہیں اخوت راولپنڈی سے منسلک کر دیا۔ کئی ماہ بعد راولپنڈی سٹیرنگ کمیٹی کے چیئرمین میجر امان اللہ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ہم اگلے جمعہ کے روز شام پانچ بجے ایف سیون تھری اسلام آباد میں ان کے گھر آئیں اور ہو سکے تو کسی وکیل کو بھی ہمراہ لائیں۔

میں، میجر امان اللہ اور ان کے وکیل دوست جب اسلام آباد کے انتہائی مہنگے علاقے میں ان کے گھر پہنچے تو یہ عصر کا وقت تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر ستر سال سے زیادہ ہوگی۔ وہ گیٹ پہ کھڑے ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں ایک عجب طرح کا حسن نظر آیا۔ گھر میں کوئی ملازم نہ تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گفتگو کرنے لگے۔ ان کی باتوں میں اس قدر انکسار تھا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ جو کسی بزرگ نے کہا...... میرا انکسار میری

سربلندی ہے اور میری سربلندی ہی میرا انکسار ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے کہا میں تجھے کہاں تلاش کروں۔ جواب ملا' انکسار سے بھرے دلوں میں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر بعد اٹھ کر اندر گئے اور اپنی ہمشیرہ کو آواز دی۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوگئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ کاغذات ہمارے سامنے رکھے اور کہنے لگے کہ یہ گھر میری بہن کا ہے جو اسے اخوت کو عطیہ کرنا چاہتی ہے۔ ہم یہ بات سن کر دنگ رہ گئے۔ گھر کی مالیت کئی کروڑ ہوگی لیکن وہ بہن بھائی اس عطیہ کا اس طرح ذکر کر رہے تھے جیسے یہ کوئی معمولی بات ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ گھر ان کیلئے اضطراب کا باعث ہے اور وہ اس اضطراب سے فوری نجات چاہتے ہیں۔ میں ایک سال سے اخوت کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہی ہوں۔ خاتون نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ آپ کاغذات تیار کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سارا کام جلد از جلد مکمل ہو جائے۔ وکیل صاحب نے کاغذ اٹھائے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور ہم شکریہ ادا کرنے کے بعد باہر نکلنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا جانے سے پہلے ہمارے لیے دعا کرتے جائیں۔ دعا ہوئی۔ کبھی کبھی آنسو بہنے کے باوجود نظر نہیں آتے۔ یہ بھی ایسی ہی دعا تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر باہر سڑک تک چھوڑنے آئے۔ جانے سے پہلے میں نے ہاتھ ملایا اور انہوں نے آگے بڑھ کر میرے ماتھے پہ بوسہ دیا۔ اس بوسے میں محبت تھی۔ مجھے لگا میری پیشانی پہ کوئی تمغہ سج گیا ہے۔

شام کے وقت اسلام آباد کنونشن سنٹر میں چیمبر آف کامرس کی ایک تقریب تھی۔ چیمبر نے اخوت کو اس کی خدمات کے حوالے سے Best Achievement Award کے لیے منتخب کیا تھا...... یہ ایوارڈ ایک اہم شخصیت کے ہاتھوں سے ملنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر جس طرح میرا ماتھا چوما مجھے لگا اس کے بعد کسی اور ایوارڈ کی ضرورت ہی نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ''اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا ہے''۔ لیکن جو لوگ اللہ کا مال واپس لوٹانے کی جلدی میں ہوں وہ کسی اور کیفیت میں ہوتے ہیں۔ ان کے گرد نور کا ایک ہالہ ہوتا ہے اور جو بھی اس ہالہ میں داخل ہو وہ منور ہو جاتا ہے۔ میں' میجر امان اور صدیقی صاحب اس ہالہ ٔنور سے اپنے اپنے حصے کی روشنی سمیٹے کنونشن سنٹر کی طرف روانہ ہونے لگے۔
دو لوگ' دو شمعیں۔ لیکن روشنی کا یہ سفر ابھی مکمل نہیں ہوا۔ ہمیں اس وقت کا انتظار ہے جب پاکستان کا ہر شخص اپنے حصے کی شمع روشن کرے گا۔ ہارورڈ کے پروفیسر مائیکل چُو اور بھارت کے سید نصیر الدین کا یہی چیلنج تھا۔ امجد اسلام امجد نے اخوت کیلئے جو نظم لکھی وہ بھی اسی امید کا علم لہراتی ہے:

آؤ قریب آؤ

ہاتھوں میں ہاتھ دے کر

زنجیر سی بناؤ

بے کس کی، بے زباں کی، طاقت کہیں جسے

انسانیت کا درد محبت کہیں جسے

پیمانِ دوستی ہے اخوت کہیں جسے

5.38۔الوداع۔الوداع

اوریا مقبول۔عامر خاکوانی۔عرفان صدیقی۔

میں کھڑکی کے پاس بیٹھا بڑی دیر تک ان تین کالموں کے سحر میں کھویا رہا۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی اور تحریریں……رحمت علی رازی، حمید اختر، سرفراز انور، عبدالقادر حسن، منو بھائی، توفیق بٹ، ناصر بشیر، سلمان عابد، طارق احمد، سید خالد علی بخاری، محمد اشرف شریف، شاہد بخاری، سید عارف نوناری، قیوم نظامی، شہزاد احمد شاد، محمد مصدق، محمد یٰسین وٹو، طارق حسین، حمید احمد سیٹھی، عمار چوہدری، صفدر محمود، ارشاد احمد عارف، امجد اسلام امجد، یوسف عالمگیرین، عطاء الرحمٰن، نواز خان میرانی، امجد علی کلیار، حسن اقبال، طیبہ ضیاء چیمہ، نجم ولی خان، کرامت بھٹی، حسن اقبال، ریاض الرحمٰن ساغر اور سعد اللہ شاہ……ان لوگوں کی بے پایاں محبت کہ انہوں نے اخوت کو اپنا موضوع بنایا اور نیکی کی ترویج کا باعث بنے۔لفظ، قلم اور مشورہ……یہ سب امانت ہیں۔

ظفر عین وقت پہ دفتر سے واپس پہنچا۔ سامان تیار تھا۔ گاڑی میں رکھا گیا اور ہم ایئرپورٹ کی طرف چل پڑے۔ سڑکوں پہ وہی ٹریفک، شور شرابہ اور ہنگامہ۔لیکن اس ہنگامے میں سلیقہ تھا۔ہم ایئرپورٹ پہنچے تو ریحان اور قیصر دونوں وہاں موجود تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں پہنچنے سے باز نہ آئے۔ان کی خواہش تھی کہ نیویارک سے رخصتی کے وقت میرے ساتھ ہوں۔ ہم چاروں ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ظفر کو دفتر سے بار بار فون آ رہے تھے۔اس نے بادلِ ناخواستہ اجازت چاہی۔ ریحان اور قیصر نے آخری وقت تک وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس اس محبت کا کیا جواب تھا۔ان دونوں کے ساتھ اخوت کے ابتدائی دنوں کی بات ہوتی رہی۔لوگوں نے اس تصور کی کس تپاک سے پذیرائی کی۔ جذبہ ٔ اخوت کے تحت بننے والا

قرضِ حسن فنڈ۔اسی فنڈ سے اخراجات بھی پورے ہوئے اسی سے قرضوں کا کام بھی ہوا۔رضا کاریت اور مساجد سے وابستگی۔ان اصولوں نے اخراجات کو کم کر دیا۔یوں بھی یہ سب کچھ ایثار ہے کاروبار نہیں۔ہم نے کچھ وقت کافی پینے میں صرف کیا۔یہ کل ہی کی بات ہے جب میں نیویارک پہنچا تھا۔میں کچھ دیر انہیں اس یادگار روزٹ کی کہانی سناتا رہا۔اسی میں ماضی کی کہانی بھی تھی۔ریحان کا خیال تھا کہ مجھے یہ کہانی ضبطِ تحریر میں لانی چاہیے۔اس میں ایک پیغام ہے۔یہ پیغام عام ہونا چاہیے۔بالآخر روانگی کا وقت ہوا۔فلائیٹ کا اعلان ہوتے ہی پاکستانی مسافر ہر جانب سے امڈ کر آنے لگے۔پی آئی اے کی فلائیٹ نیویارک سے سیدھی لاہور جاتی ہے اور پھر وہاں سے کراچی۔جو لوگ عزیز و اقارب کو چھوڑنے آئے وہ بھی آبدیدہ اور جو رخصت ہوئے وہ بھی آبدیدہ۔میں بچھڑنے والوں کو دیکھتا رہا اور کانوں میں دیر تک عابد علی عابد کا یہ شعر گونجتا رہا:

دمِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

اکیس دنوں کی خوبصورت اور خوشگوار یادیں لیے میں جہاز میں بیٹھ چکا تھا۔

6

بیٹھ جائیں سایہء دامانِ احمد میں منیر

نیویارک۔واپسی۔لاہور

باب ششم

6.1۔اور ہم سب کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے

جہاز کے اندر ایک الگ سی دنیا تھی۔ تین سو سے زائد مسافر' کسی کو رخصت ہونے کا غم اور کسی کو گھر پہنچنے کی خوشی۔ سیٹ کہاں ہے' درمیانی نشست پہ نہیں بیٹھنا' پشت پیچھے کرنی ہے' بیلٹ نہیں مل رہی' ہینڈ بیگ کہاں رکھوں۔ میز بانوں کے لئے یہ کوئی نیا منظر نہیں۔ انہیں علم ہے کہ کچھ عرصہ بعد ان مسافروں کو یاد بھی نہ ہوگا کہ وہ معمولی باتوں پہ تکرار کرتے رہے۔ یہ ساری کہانی یہیں رہ جائے گی۔ جہاز تقریباً بھرا ہوا تھا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ تھالی پھینکیں تو سر ہی سر جائے۔ اس رش کے باوجود پی آئی اے خسارے میں رہتی ہے۔ اس سوال کا جواب کبھی نہیں ملا۔ آدھ گھنٹہ اور لگ گیا۔ کچھ مسافروں کو بٹھانے میں اور کچھ کو سمجھانے میں۔ نشستیں سیدھی کرنے اور سیٹ بیلٹ باندھنے کا حکم جاری ہوا۔ اڑنے سے پہلے سفر کی دعا مانگی گئی۔ ہر سفر سے پہلے یہ دعا مانگی جاتی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ گھروں کو نہیں پہنچ پاتے۔ ہر دعا کا تعلق تو قبولیت سے نہیں ہوتا۔ دعا مانگنا انسان کا کام ہے' قبول کرنا کسی اور کا۔ یہ تو وہی جانتا ہے کہ ہمارے لئے کیا اچھا ہے' کیا نہیں۔ قبولیت کبھی دعا کے مطابق ہوتی ہے اور کبھی رضا کے مطابق۔ جو لوگ اپنی خواہشات کو اللہ کی رضا کے تابع رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک دونوں صورتیں برابر ہوتی ہیں۔ یہ بھی طے ہے کہ جو دعا قبول نہیں ہوتی' کہیں لکھ دی جاتی ہے اور پھر ایک دن مانی بھی جاتی ہے۔ کسی اور زمانے میں' کسی اور جگہ' کسی اور رنگ میں۔ کہتے ہیں مانگنے والوں میں ایک فقیر ایسا بھی ہوتا ہے جو بات منوائے بغیر نہیں جاتا۔

6.2۔یختص برحمتہ من یشاء

نیو یارک بہت پیچھے رہ گیا۔ وہ لمحے بھی جو ہم نے وہاں گذارے۔ سفر میں زمان و مکان دونوں بدلتے ہیں۔ اخوت کا سفر بھی ایسا ہی سفر ہے۔ اس سفر میں اخوت کے علاوہ بھی کئی سفر ہوئے۔ محبت کے' خدمت کے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اخوت اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے بعد کسی اور کام کی گنجائش نہ رہے گی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ خدمت کا افق وسیع ہوتا رہا۔ ایک کام' پھر دوسرا' پھر تیسرا۔ ہر نیا کام اطمینان کی نئی لہر کو جنم دیتا

رہا۔جس طرح بدی کا ایک دائرہ ہے جسے Vicious Cycle کہتے ہیں اسی طرح نیکی کا بھی ایک دائرہ ہے جسے Virtuous Cycle کہتے ہیں۔یہی نہی عن المنکر اور یہی امر بالمعروف کا فلسفہ ہے۔یہ اس کی عطا ہے کہ وہ جسے چاہے' جس Cycle کا حصہ بنا دے۔برداشت سے زیادہ ذمہ داری ڈالی ہی نہیں جاتی اور پھر نیکی کا ایک اپنا نشہ بھی تو ہے جس کا انسان عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔نیکی پہ کسی کا اجارہ نہیں۔توفیق پہ کسی کا استحقاق نہیں۔وہ اپنے تدبر اور مشیت کی رُو سے جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ ان الفضل بیداللہ یوتیہ من یشاء۔ایک بار ایرانی ہیڈ آف مشن کے ساتھ بڑی طویل ملاقات ہوئی۔کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب کسی کو اگر نیک کاموں کی توفیق ملتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ خدا اس پر مہربان ہے۔اس کی بخشش کا پروانہ جاری کرنا چاہتا ہے۔میں یہ سن کر پشیمان ہونے لگا۔ہمارے نامۂ اعمال میں تو کچھ بھی نہیں۔پھر بھی وہ نیکی کی استطاعت بخشتا ہے تو یہ واقعی اس کی عنایت ہے۔وہ جو غالب نے کہا:

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

میں نے ڈاکٹر عباس فاموری کو بتایا کہ اخوت' رزم گاہِ حیات میں پہلا انعام تھی۔پھر راستے کھلتے گئے۔سفر اور سفر در سفر۔کسی کی نظر کا فیض' کسی کی دعا کا حاصل۔بہت سے کام خود بخود نامہ اعمال میں لکھے جاتے رہے۔ پنجاب ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ' پنجاب ویلفیئر ٹرسٹ فار ڈس ایبلڈ اور فاؤنٹین ہاؤس تو اخوت ہی کا ایک حصہ لگتے ہیں۔ان کی کہانی اخوت کے ساتھ چلتی ہے۔جہاز فضاؤں کی بلندی چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔میزبان ناشتے کی تیاری میں مصروف تھے۔لوگ مائیکروفون کانوں سے لگا کے موسیقی سے محظوظ ہو رہے تھے۔میں ایک بار پھر ماضی کے ورق کھولنے لگا۔

6.3۔پنجاب ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ

پنجاب ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ بھی نئے زمانے کا خواب ہے۔

اس خواب میں چالیس ہزار گھرانوں کے خواب سوئے پڑے تھے۔سب سے پہلا خواب ایک دور دراز گاؤں میں رہنے والے بچے کا ہے جس کے سات بہن بھائی' ماں باپ اور کئی غریب رشتہ دار ہیں۔ایک کمرہ'

کچی دیواریں اور ٹوٹی ہوئی چھت ۔ نہ بجلی٬ نہ صاف پانی٬ نہ اچھی خوراک...... چند بکریاں اور کھیت میں مزدوری......اس خاندان میں کوئی بچہ پانچویں جماعت سے آگے نہیں گیا۔ وہ پاکستان بننے کے بعد بھی غلام ہیں۔ اسی خاندان میں ایک بچہ جنم لیتا ہے جسے کتاب سے محبت ہو جاتی ہے......وہ جہالت کی زنجیر توڑنا چاہتا ہے۔ آسمان کو چھونا چاہتا ہے۔ اس کے کچھ خواب ہیں۔ کچھ آرزوئیں ہیں......وہ دن بھر ماں باپ کے ساتھ مزدوری کرتا ہے اور رات کو دیئے کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دن یہ کوشش رنگ لاتی ہے............میٹرک کے امتحان میں وہ ضلع بھر میں نمایاں پوزیشن لیتا ہے......ماں باپ کو تو یہ بھی علم نہیں کہ امتحان کیا ہوتا ہے اور پوزیشن لینے کے کیا معنی ہیں......بچے کو جس استاد نے یہاں تک پہنچایا وہ کہتا ہے کہ ابھی یہ آغاز ہے ۔ تمہیں اور پڑھنا ہے۔ لیکن پڑھنے کے لیے وسائل درکار ہیں۔ نہ گھر۔ نہ چھت۔ نہ جائیداد۔ نہ کوئی سہارا۔ مکمل محرومی اور افلاس......جن ماؤں کے پاس زیور ہی نہ ہوں وہ کیا کریں۔ یہ بچہ بھی ایسا ہی تھا۔ لیکن نتیجہ نکلنے کے چند روز بعد استاد گھر کے ٹوٹے ہوئے دروازے پہ دستک دیتا ہے۔ وہ اکیلا نہیں اس کے ساتھ ڈاکیا ہے......اس گھر کا کوئی ایڈریس ہی نہیں تھا کہ ڈاکیا اکیلا وہاں پہنچ سکتا۔ نہ کوئی گلی٬ نہ کوئی محلّہ۔ استاد اس بچے کو بتاتا ہے کہ اب اسے فکر کی ضرورت نہیں۔ اس کی تعلیم کے تمام اخراجات کا بندوبست ہو گیا ہے۔ کالج کی فیس٬ ہوسٹل کا خرچہ٬ کتابوں کے اخراجات یہ سب ایک دوست نے ادا کر دیئے ہیں اور اس دوست کا نام پنجاب ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ ہے۔ خوشیاں٬ مسرت اور شادمانی۔ بہاولنگر کے ایک دور دراز گاؤں کا شکستہ گھر جس کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر کوئی پرندہ بھی نہیں بیٹھتا اس دن خوشیوں سے گونج رہا تھا۔ انڈومنٹ فنڈ کے پاس ایسی چالیس ہزار کہانیاں ہیں۔ پوٹھوہار سے لے کر چولستان اور سون سکیسر سے لے کر دریائے سندھ کے کناروں تک............ہر کہانی مایوسی سے شروع ہوتی ہے لیکن امید پہ جا کے دم لیتی ہے۔ شہباز شریف نے چار سال پہلے یہ خواب دیکھا۔ بہت کم لوگ ہیں جو خواب دیکھتے ہیں۔ اس سے بھی کم ہیں جو تعبیر تک پہنچتے ہیں۔ سیکشن 42 کی کمپنی٬ مکمل شفاف نظام٬ دس ارب کا فنڈ٬ ایک ارب کے سالانہ وظائف......چالیس ہزار طالب علم٬ میٹرک٬ انٹر٬ گریجوایشن٬ ماسٹرز تک تعلیم۔ گلگت بلتستان٬ آزاد کشمیر اور چاروں صوبے۔ اقلیتیں۔ سپیشل افراد۔ یتیم اور معذور بچے۔ وہ کام جو قیام پاکستان کے بعد ہونا تھا٬ ساٹھ سال بعد ہوتا ہے۔ طلباء و طالبات کو اپنی محنت کا پھل اور منزل کا نشان ملنے لگا۔ علی گڑھ نے پاکستان بنایا۔

انڈ ومنٹ فنڈ سے مستفید ہونے والے طلباء وطالبات اس کی تعمیر کریں گے۔

پنجاب ایجوکیشنل انڈ ومنٹ فنڈ شہباز شریف کا تصور تھا۔ وہ خود اس کے چیئر مین بنے اور جب انہوں نے مجھے وائس چیئر مین بننے کے لئے کہا تو مجھے کچھ حیرت ہوئی کیونکہ مجھ سے پہلے کئی ایک نامی گرامی افراد کو بورڈ آف ڈائریکٹر ز میں شمولیت کی دعوت دی جا چکی تھی۔ میرے لیے بہرحال یہ ایک اعزاز تھا۔ ڈاکٹر کامران شمس کا انتخاب بطور چیف ایگز یکٹو آفیسر ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر شمس نے بھی اس انتخاب کا حق ادا کر دیا۔ فنڈ کا آغاز 2008 کے اواخر میں ہوا۔ ابتدائی دن بہت مشکل تھے۔ انتہائی غریب اور انتہائی باصلاحیت بچوں کو ڈھونڈ نا بظاہر آسان نظر آتا ہے لیکن ایک فرسودہ انتظامی ڈھانچے میں یہ کام آسان نہیں۔ بہت طویل سوچ بچار اور محنتِ شاقہ۔ جسٹس (ر) عامر رضا خان کی مدبرانہ شخصیت بڑا سہارا بنی۔ ڈاکٹر محمد اجمل خان اور محترمہ انوشہ رحمان نے بھرپور ساتھ دیا۔ دفتر بنا' ٹیم بنی' اصول وضوابط بنے اور پھر ایک ادارے نے جنم لیا جو پاکستان کی تاریخ میں ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔

میں جب ایجوکیشنل فنڈ سے منسلک ہوا تو کچھ دوستوں نے مجھے اس امر سے باز رہنے کا مشورہ بھی دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ پر سیاست کا لیبل لگ جائے گا لیکن مجھے خود پر مکمل اعتماد تھا۔ مجھے علم تھا کہ سیاستدانوں سے دور رہ کے کام نہیں ہوسکتا لیکن سیاست سے دور رہ کے کام ہوسکتا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اللہ کا خصوصی فضل کہ پانچ سال تک یہ عظیم ذمہ داری ادا کی اور دامن پہ کوئی ایسا داغ نہ لگا جس میں ذاتی غرض کارفرما ہو۔ وزیراعلیٰ نے ان پانچ برسوں میں میری رائے کا مکمل احترام کیا۔ نہ ہی کوئی سفارش کی اور نہ کسی کو کرنے کی اجازت دی۔ میرٹ کی یہ پاسداری ناقابلِ یقین نظر آتی ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ جو چالیس ہزار سکا لرشپ دیئے گئے ان کی تفصیلات فنڈ کی ویب سائیٹ پہ آویزاں ہیں اور ان میں ایک بھی دانستہ غلطی نہیں۔ اس انتخاب کے خلاف تیس بار صوبائی محتسب کی عدالت میں پیش ہونا پڑا اور اللہ کے فضل سے ہر بار فیصلہ فنڈ کے حق میں ہوا۔ اس قدر شفاف کارکردگی بہترین قیادت اور ایماندار ٹیم کے بغیر ممکن نہ تھی۔

آئی ایس او سرٹیفکیشن' نقائص سے مبرا آڈٹ رپورٹس اور ایک مکمل شفاف نظام۔ فنڈ کی ساری ٹیم اور تمام بورڈ آف ڈائریکٹرز ہی اس قابل ہے کہ اسے داد دی جائے۔ ان کا نام تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے سکالرشپ کے علاوہ مختلف طرح کی تربیتیں بھی دی جاتی ہیں تا کہ ان کی قائدانہ صلاحیتیں نکھر کے سامنے

آئیں۔ان بچوں کوہمیں مستقبل کی قیادت کےطور پر تیار کرنا ہے تا کہ ان کےتوسط سے پاکستان اپنی منزل سے ہمکنار ہو۔ذرا نم ہوتو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ہم تو پاکستان نہیں بدل سکے لیکن یہ چالیس ہزار بچے جو کچھ عرصہ بعد چار لاکھ ہوں گے پاکستان ضرور بدلیں گے۔پنجاب ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ کے بعد پاکستان ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ۔مستقبل کے افق پر چراغوں کی ایک قطار سی نظر آتی ہے۔

6.4۔فاؤنٹین ہاؤس

فاؤنٹین ہاؤس چھوٹی سی دنیا ہے اور دنیا ایک بڑا سا فاؤنٹین ہاؤس۔

ذہنی مریضوں کے علاج کا یہ ادارہ پچاس برس پہلے ڈاکٹر رشید چوہدری نے چند احباب کے ساتھ مل کر شروع کیا۔ڈاکٹر رشید چوہدری ذہنی امراض کے ایک عظیم معالج تھے۔انہوں نے سائیکاٹری کے نام کو ایک نئ جہت عطا کی۔فاؤنٹین ہاؤس کے اولین معماروں میں علامہ علاءُ الدین صدیقی سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی' ڈاکٹر محمد اجمل مخدوم سابق وائس چانسلر اور پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور' ڈاکٹر رفعت رشید' عبدالعلی شیخ ' معروف صحافی مجید المکی اور حامد مجید شامل تھے......یہ لوگ اب ہم میں نہیں لیکن ان کی یاد فاؤنٹین ہاؤس کے در و دیوار پہ نقش ہے۔ڈاکٹر رشید چوہدری نے چالیس برس تک اس ادارے کی خدمت کی۔ایک معالج بن کر'ایک منتظم بن کر۔اسی پر موقوف نہیں وہ کشکول اٹھا کر اس کے لیے بھیک بھی مانگتے رہے۔ان کی لازوال خدمت کے نتیجہ میں اس عمارت کو ایک گھر کا درجہ ملا۔محبت سے بھرا ایک ایسا گھر جہاں اپنے آپ سے بے خبر لوگ رہتے ہیں۔جہاں ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور علاج کے بعد ان کی معاشرے میں واپسی کے عمل کا آغاز کیا جاتا ہے۔یہاں رہنے والے مریضوں کو ممبر کہا جاتا ہے۔کھیل کود' تفریح' پیشہ وارانہ تربیت' مصوری' باغبانی' چوبکاری' موسیقی اور سنگ تراشی۔یہ وہ مختلف طریقے ہیں جن کے ذریعے ممبران کا علاج ہوتا ہے۔ڈاکٹر رشید چوہدری جب 2006 میں اس دنیا سے رخصت ہوئے تو فاؤنٹین ہاؤس کا مستقبل غیر یقینی نظر آنے لگا لیکن ان کے فرزند پروفیسر ہارون رشید نے آگے بڑھ کر یہ ذمہ داری سنبھالی اور یہ ادارہ پھلتا پھولتا رہا۔اسی دوران اجل کا تیر دوبارہ چلا اور ہارون رشید بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ڈاکٹر ہارون رشید نے اس ادارے کے لئے بے حد محنت کی تھی۔اس کی وفات کے بعد فاؤنٹین ہاؤس کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔تاہم فاؤنٹین ہاؤس کی ایگزیکٹو کمیٹی نے تین افراد پہ مشتمل

ایک مینجمنٹ کمیٹی بنائی جس میں غیاث الدین اور ڈاکٹر عمیر رشید شامل تھے۔ مجھے اتفاقِ رائے سے اس کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا۔ یہ میرے لئے ایک اور اعزاز تھا۔ جب تیس سال پہلے فاؤنٹین ہاؤس کی بنیادیں رکھی جارہی تھیں تو میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ مجھے یہاں آنے کا موقعہ ملتا تو ہر طرف ڈاکٹر رشید چوہدری نظر آتے۔ کبھی معمار، کبھی مسیحا اور کبھی مہربان معالج۔ میں ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا تھا۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز ان کی اس عظیم میراث کی حفاظت بھی میری ذمہ داری ہوگی۔ مینجمنٹ کمیٹی کے سامنے ایک چیلنج مالی وسائل کی کمی تھی۔ فاؤنٹین ہاؤس کے اکاؤنٹ میں صرف تین ماہ کی تنخواہیں بچی تھیں۔ لیکن اس سے کہیں بڑا چیلنج مایوسی کی وہ کیفیت تھی جو فاؤنٹین ہاؤس کے در و دیوار میں سرایت کر چکی تھی۔ ادارے اور تحریکیں وسائل کی کمی سے نہیں، بے یقینی سے ناکام ہوتی ہیں۔ نئی انتظامیہ کو اللہ تعالیٰ نے جو سب سے بڑی کامیابی دی وہ یہی تھی کہ ہم نے اس مایوسی کو ایک مثبت سوچ میں بدل دیا اور چند مہینوں میں ڈونرز، ایگزیکٹیو کمیٹی اور عام لوگوں کا اعتماد لوٹ آیا۔ انہیں ایک بار پھر یقین ہونے لگا کہ یہ ''گھر'' ہمیشہ آباد رہے گا اور اس کے مکین یہاں سے خوشیاں سمیٹتے رہیں گے۔ ادارے کے معاشی استحکام کیلئے ایک انڈومنٹ فنڈ بنانے کی ضرورت تھی۔ فنڈ بنا اور پھر ایسی برکت پڑی کہ دو سال کے عرصہ میں اس میں دس کروڑ روپے جمع ہو گئے۔

فاؤنٹین ہاؤس دو بار یتیم ہوا۔ ایک بار جب ڈاکٹر رشید چوہدری نے وفات پائی اور دوسری بار جب ہارون رشید اس دنیا سے رخصت ہوا لیکن ہمارا عزم تھا کہ اب یہ اپنی زندگی میں ایک بار اور یتیم نہ ہو۔ اس گھر پہ اللہ کی رحمت ہے اور اس رحمت کی بدولت وجود میں آنے والا یہ انڈومنٹ فنڈ اس کو ہمیشہ کیلئے مالی استحکام فراہم کرے گا۔ فاؤنٹین ہاؤس کے انتظامی امور میں لاتعداد تبدیلیاں متعارف کرائی گئیں۔ انڈومنٹ فنڈ، ISO سرٹیفیکیشن، شفاف مالی نظام، بہترین ایکسٹرنل اور انٹرنل (بیرونی اور اندرونی) آڈٹ، ایک انتہائی مؤثر انتظامی مینول اور خدمت کے جذبہ سے معمور سٹاف۔ ڈاکٹر عمران مرتضیٰ، ڈاکٹر نومیس اور ان کے تمام ساتھی۔ عثمان رشید اور اس کے ہمراہ رضا کار۔ جس ادارے میں چار سو کے لگ بھگ ذہنی مریض رہتے ہوں اور بیسیوں افراد کا عملہ کام کرتا ہو اس کی مشکلات کا احاطہ مشکل نہیں۔ بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی محنت کی بدولت تعمیرِ نو کی اس کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ لیکن دو نام سب سے نمایاں ہیں۔ غیاث الدین

جنہیں لوگ محبت سے بابا جی کہتے ہیں اور ڈاکٹر کامران شمس ۔اس ادارے کو دو سال میں جتنا وقت انہوں نے دیا اتنا وقت بہت سے لوگوں نے مل کر بھی نہیں دیا ہوگا۔مکمل طور پر رضا کارانہ جذبے کے ساتھ اور نمائش کی کسی بھی تمنا کے بغیر۔کئی ایک فلاحی اداروں سے منسلک ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ فلاحی اداروں پہ خاندانوں کا لیبل نہیں لگنا چاہیئے ۔ بڑے ادارے معاشرے کی اجتماعی کاوشوں کا حاصل ہوتے ہیں ۔کسی مخصوص وقت میں چند لوگ ان کی پرورش کرتے ہیں اور پھر اپنا کردار ادا کر کے رخصت ہو جاتے ہیں ۔ فاؤنٹین ہاؤس بھی بہت سے دردمند افراد کا اجتماعی ورثہ ہے ۔اس کی تب و تاب اور زندگی اسی اجتماعی سوچ میں پوشیدہ ہے۔اب تک لاتعداد مخیّر افراد نے اس ادارے کی سرپرستی کی ۔ ملک معراج خالد' ڈاکٹر افضل جاوید' شیخ محمد نعیم' حاجی انعام الٰہی اثر' میاں عبدالوحید' بیگم ناصرہ جاوید اقبال' جناب ایم ایم خان' ایس ایم اشفاق' میڈم ثریا خانم' احسان اللہ وقاص ۔ فاؤنٹین ہاؤس سے ان تمام اصحاب کی رفاقت مہ و سال کی قید سے آزاد ہے ۔انہوں نے ان مریضوں کے دکھ کو ہمیشہ اپنا دکھ سمجھا۔ان تمام کے نزدیک فاؤنٹین ہاؤس ایک مشن تھا۔ایک مقدس ذمہ داری اور عبادت ۔ڈاکٹر ہارون رشید کے پاس ایک بار ایک شخص آیا اور عطیہ دے کر خاموشی سے پلٹ گیا۔کئی روز بعد وہی شخص ہارون کو کسی اور تقریب میں نظر آیا تو وہ اس کے پاس گئے اور کہنے لگے جناب آپ نے عطیہ تو دے دیا لیکن ایڈریس نہیں دیا کہ ہم آپ کو رسید بھیج سکتے ۔اس کا جواب تھا کہ پروفیسر صاحب رسید تو مجھے مل چکی ہے ۔ جب میں یہ عطیہ دے کر واپس گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری ماں جو قوتِ گویائی سے محروم ہو کر کئی ماہ سے بستر پر لیٹی تھی' اپنے پوتے' پوتیوں کے درمیان بیٹھی باتیں کر رہی ہے ۔ڈاکٹر صاحب ۔اس شخص نے شدتِ جذبات سے کہا ''اس سے بڑی رسید اور کیا ہوگی کہ میں نے اپنی بیمار ماں کے نام پر عطیہ دیا اور گھر پہنچنے سے پہلے ماں صحت یاب ہو چکی تھی''۔

یہ ہے فاؤنٹین ہاؤس اور یہ ہے اس کی برکت ۔ پاکستان میں ایسے ادارے بہت کم ہیں ۔ایسے ادارے یوں ہی نہیں بنتے ان کیلئے دردِ دل بھی چاہیے اور خونِ جگر بھی ۔اور یا مقبول جان نے ایک بار کہا کہ ہمارے ملک میں ایک Mcdonald کھلتا ہے اور پھر تین' چار سال کے اندر اندر گلی گلی مکڈونلڈ کھل جاتے ہیں لیکن فاؤنٹین ہاؤس کھلنے کے بعد سالہا سال گزر جاتے ہیں پر دوسرا فاؤنٹین ہاؤس نہیں بن پاتا۔کہیں ہم کم نظریا

کوتاہ بین تو نہیں۔ اور یا مقبول کا کہنا بہت مقدم لیکن ہم ان کے کہنے سے پہلے ہی ایک اور فاؤنٹین ہاؤس کی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ ایک اور گھنا پیڑ' ایک اور شجر سایہ دار۔

6.5۔ فاؤنٹین ہاؤس سرگودھا

توفیق عطا ہے اور عطا تقرب۔

فاؤنٹین ہاؤس لاہور کے بعد فاؤنٹین ہاؤس سرگودھا۔

فاؤنٹین ہاؤس جیسے اداروں کی ملک کے ہر حصے میں ضرورت ہے تاکہ ذہنی مریض دربدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ یہی وہ سوچ تھی جس کی وجہ سے ایک نیا فاؤنٹین ہاؤس بنانے کا خیال آیا۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبران نے جب میری یہ تجویز سنی تو اس کی توثیق میں ایک لمحہ بھی صرف نہ ہوا۔ بصد مسرت اور بیک زبان۔ ہماری یہ بھی تجویز تھی کہ اگلا فاؤنٹین ہاؤس سرگودھا میں بننا چاہیے کہ ہمارے پاس بنوں' ڈی آئی خان' میانوالی' بھکر' خوشاب' لیہ اور سرگودھا جیسے علاقوں سے جو مریض آتے ہیں ان کے لواحقین کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سرگودھا' لاہور سے بھی دور نہیں۔ اس پر بھی اتفاقِ رائے ہوا۔ سرگودھا کے ڈی سی او عظمت محمود سے سرکاری زمین کی درخواست کی گئی۔ عظمت تو شاید پہلے سے منتظر بیٹھا تھا۔ اس نے شہر کے قریب آٹھ ایکڑ پہ مشتمل ایک قطعہ زمین ڈھونڈ نکالا اور اپنی پرزور سفارش صوبائی حکومت کو ارسال کر دی۔ وہ کام جو مہینوں میں نہیں ہوتا چند ہفتوں میں ہو گیا۔ زمین کی الاٹمنٹ میں کچھ تاخیر ہونے لگی تو وزیرِ اعلیٰ نے اپنے ایک اور بہترین افسر شاہد اقبال کو یہ ذمہ داری سونپی اور اس نے حسبِ وعدہ یہ سارا کام صرف پندرہ روز میں کروا دیا۔ تعمیر کا مرحلہ قریب آیا تو قرعہ فال عبدالقیوم کے نام پڑا۔ عبدالقیوم ایک بہترین آرکیٹیکٹ ہے۔ پہلے وہ ڈاکٹر کامران اور اظہار ہاشمی کا دوست تھا اب ساری اخوت کا دوست ہے۔ اخوت کا ہیڈ آفس اسی کی تخلیقی کاوش کا شاہکار ہے۔ 24 ستمبر بروز بدھ فاؤنٹین ہاؤس سرگودھا کا ماسٹر پلان منظور ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ ایک سال کے اندر' اندر پچاس بیڈ کا یہ ہسپتال کام شروع کر دے گا......نہ وسائل کی کمی آڑے آئی' نہ کوئی اور مشکل۔ جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کیلئے کافی ہے۔ اخوت سرگودھا کے ساتھیوں نے جی بھر کے ساتھ دیا۔ خاص طور پر عرفان بٹ' جاوید چیمہ اور شاہ ریز۔ عمارت کا بیرونی عکس ہو بہو وہی ہوگا جو فاؤنٹین ہاؤس' لاہور کا ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ لاہور فاؤنٹین ہاؤس کا ہی پرتو نظر آئے۔ یہ کارنامہ ڈاکٹر رشید چوہدری اور ہارون رشید

کے علاوہ ان تمام مہربان لوگوں کے لئے تسکین کا باعث ہوگا جو فاؤنٹین ہاؤس کی مدد کرتے رہے۔ حاجی انعام الٰہی، شیخ محمد نعیم اور میاں عبدالوحید۔ اس موقعہ پر چند لوگوں کو خصوصی طور پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ سب سے پہلے وہ درویش صفت ملک معراج خالد جنہوں نے فاؤنٹین ہاؤس، لاہور کی پُرشکوہ عمارت ڈاکٹر رشید چوہدری کے حوالے کی۔ پھر جنرل ضیاء الحق اور جنرل سوار خان جنہوں نے فاؤنٹین ہاؤس، فاروق آباد کیلئے زمین فراہم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اور اب شہباز شریف جنہوں نے سرکار کی طرف سے زمین بھی دی اور شریف فاؤنڈیشن کی طرف سے عطیے کا اعلان بھی کیا۔ خدا کرے یہ توفیق سب کو ملے۔ قرآن کی ایک آیت کے مطابق اللہ کے ایک برگزیدہ نبی نے کہا ''میں تو اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک میرے امکان میں ہے اور مجھے جو بھی توفیق ملتی ہے صرف اللہ کی مدد سے ہے۔'' (۱۲.۸۸)۔ گویا ہمارے قبضہ اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ توفیق اسی کی عطا ہے اور عطا قرب کی پہلی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

6.6۔ پنجاب ویلفیئر ٹرسٹ فار ڈس ایبلڈ

خصوصی افراد اللہ کی طرف سے انعام بھی ہیں اور امتحان بھی۔ میرے دل میں ان کی محبت کے پھول اس وقت کھلے جب میں پنجاب ویلفیئر ٹرسٹ فار ڈس ایبلڈ سے منسلک ہوا۔ اس ادارے سے وابستگی ایک اور انعام ثابت ہوئی۔ اس ٹرسٹ کے قیام میں تین لوگوں کا کردار سب سے اہم تھا۔ ڈاکٹر محمد عارف، جسٹس (ر) عامر رضا اور ایم اے کے چوہدری۔ اسی کی دہائی میں جنرل ضیاء الحق کی تحریک پر وفاقی حکومت نے معذور افراد کے علاج اور بحالی کے لئے چاروں صوبوں کو دس، دس کروڑ روپے کی مالی مدد دی۔ تین صوبوں نے یہ رقم اپنے ہاں کام کرنے والی این جی اوز کو دے دی اور پنجاب نے اس رقم سے ایک انڈومنٹ فنڈ بنا دیا تاکہ اصل رقم خرچ نہ ہو بلکہ اس سے حاصل ہونے والے منافع سے کام ہوتا رہے۔ انڈومنٹ فنڈ بنانے کی تجویز سول سروس کے رکن ڈاکٹر محمد عارف اور جسٹس (ر) عامر رضا کی طرف سے پیش ہوئی۔ فنڈ بننے کے بعد ویلفیئر ٹرسٹ بنا جس کے ٹرسٹیز میں حکومت کے نمائندوں کے ساتھ، ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہوئے۔ ان تمام افراد نے رات، دن محنت کی اور ٹرسٹ کو ایک معتبر ادارہ بنا دیا۔ 2007 میں ٹرسٹ کے پہلے مینیجنگ ڈائریکٹر کا انتقال ہوا تو اس وقت کے سیکریٹری، سوشل ویلفیئر، شعیب بن عزیز نے مجھ سے رابطہ کیا اور یہ عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی۔ مجھے کچھ ہچکچاہٹ تھی۔ لیکن جب میں نے ٹرسٹ کے مقاصد کو

سمجھا تو یہ پیشکش بخوشی قبول کر لی۔ میری صرف ایک ہی شرط تھی کہ میں اس کام کیلئے کوئی مشاہرہ طلب نہ کروں گا۔ میرا یہ کام اعزازی حیثیت میں ہوگا۔ میری اس ''بے طلبی'' کی وجہ کیا تھی۔ شعیب بن عزیز سے بہتر یہ بات کون سمجھتا۔ ان ہی کا ایک شعر ہے:

اے بے طلبی، قدر ہماری کہ یہاں تک
ہم کون سی خواہش سے گذر کر نہیں آئے

کسی تامل کے بغیر انہوں نے یہ شرط تسلیم کر لی اور یوں میرا ٹرسٹ سے رشتہ قائم ہوا۔ چند ہی روز بعد مجھے جسٹس (ر) عامر رضا سے ملنے کا اعزاز حاصل ہوا اور ہم نے ٹرسٹ کو فعال بنانے کا فیصلہ کیا۔ آہستہ، آہستہ ایک بہترین حکمتِ عملی تیار کی گئی۔ انڈومنٹ فنڈ میں بیس کروڑ کی رقم موجود تھی۔ ہماری خواہش تھی کہ چند برسوں میں یہ رقم ایک ارب تک لے جائیں اور ان اداروں کی تعداد بھی بڑھائیں جو اس فنڈ سے مستفید ہوتے ہیں۔ انہی دنوں ہماری درخواست پر میرے ایک عزیز دوست اور کنگ ایڈورڈ کے ہم جماعت کرنل ڈاکٹر ظفر اقبال باجوہ بھی بطور ڈائریکٹر پروگرام، ٹرسٹ سے منسلک ہو گئے۔ کرنل باجوہ محنت، دیانت اور نظم وضبط میں بے مثال ہیں۔ ان کی موجودگی سے ٹرسٹ کو نیا جذبہ ملا اور بہت جلد ایک فعال ٹیم وجود میں آ گئی۔ نئی حکمتِ عملی، نئے اقدامات۔ سب سے پہلے ہم کرائے کے دفتر سے نکلے اور ٹرسٹ کا اپنا دفتر خریدا گیا۔ چار سال میں انڈومنٹ بیس کروڑ سے بڑھ کر پچاس کروڑ ہو گیا۔ سالانہ ایک سو سے زیادہ این جی اوز کو امداد مہیا ہونے لگی۔ Inclusive education کے علاوہ Outreach Programme کی بنیاد رکھی گئی۔ وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کو ٹرسٹ کی طرف سے پریزینٹیشن (Presentation) دی گئی تو انہوں نے اس کارکردگی کو دیکھتے ہوئے سالانہ چار کروڑ کی گرانٹ بھی منظور کر دی۔ یہ ایک اور اہم قدم تھا۔ اس قدم نے یاد دلایا کہ شرط تو صرف سفر کی ہے۔ مسافر نواز اور سایہ دار درخت راہ تکتے ہیں۔ پنجاب ویلفیئر ٹرسٹ چار طرح کے لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ نابینا، گونگے بہرے، ذہنی معذور اور جسمانی معذور۔ پاکستان میں اس نوعیت کا اور کوئی ٹرسٹ نہیں۔ اب تک یہ ٹرسٹ تین ملین افراد کی مدد کر چکا ہے۔ اس کے انتظامی اخراجات انتہائی معمولی ہیں۔ خصوصی افراد کیلئے مصروفِ عمل کئی نامور ادارے اس ٹرسٹ سے مستفید ہوتے ہیں۔ ایل آر بی ٹی، امین مکتب، رائزنگ سن، انجمن بحالی معذوراں، فاؤنٹین ہاؤس، راولپنڈی آئی

ڈونرز آرگنائزیشن، عزیز جہاں ٹرسٹ، روشنی، النور ٹرسٹ ۔ ان تمام اداروں کی خصوصی افراد کیلئے بے پناہ خدمات ہیں تاہم ٹرسٹ کے تعاون سے ان خدمات کا دائرہ اور وسیع ہونے لگا۔ میں شعیب بن عزیز کے لئے دعا گو ہوں کہ ان کی دعوت پر مجھے ٹرسٹ سے وابستگی کا موقعہ ملا اور میں ان لوگوں کے قریب ہوا جو اللہ کے قریب ہیں۔

یہیں رہ کے اندازہ ہوا کہ ذہنی وجسمانی معذوری غربت کی بدترین شکل ہے۔ خصوصی افراد رحم کے نہیں محبت کے مستحق ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ انہیں ماں باپ کی توجہ بھی نہیں ملتی۔ نہ تعلیم، نہ پیار اور نہ ہی وراثت میں کوئی حصہ۔ اکثر اوقات انہیں گناہوں کی سزا سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ تو وہ پھول ہیں جنہیں ہماری آزمائش کیلئے بھیجا گیا۔ ان کی آواز نوائے سروش سے کم نہیں۔ جس گھر میں معذور بچے سے محبت کی جائے اس پر اللہ کی رحمت ہمیشہ کیلئے سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ ٹرسٹ اور اس کے ساتھ منسلک اداروں کے ہزاروں کارکن اسی جذبہ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ محترمہ خاور سلطانہ، صلاح الدین جدی اور ڈاکٹر سلمٰے مقبول جیسے لوگوں نے خصوصی افراد کیلئے زندگی وقف کر دی اور دکھ کے گہرے سمندر میں عافیت کے جزیرے بنانے لگے۔ ٹرسٹ نے خصوصی افراد کی بہبود کے کچھ کام اخوت کے ساتھ مل کے کیے جن میں تین ہزار خصوصی افراد کو بلاسود قرضوں کی فراہمی بھی شامل ہے۔ کیا یہ بات حیرت اور مسرت کا باعث نہیں کہ ان قرضوں کی واپسی کی شرح بھی 99 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ اس وقت ٹرسٹ کا انحصار صرف حکومت کے وسائل پر ہے۔ اگر ان وسائل میں اضافہ ہونے لگے تو خصوصی افراد کی بہبود کیلئے بہت کام ہو سکتا ہے۔ ایک دردمند معاشرے کا پہلا امتحان ہی یہ ہے کہ وہاں خصوصی افراد سے کتنی محبت کی جاتی ہے۔

6.7۔ اخوت ہیلتھ سروسز

اخوت کے قرضے غربت سے نجات کا صرف ایک راستہ ہیں۔ اخوت نے قرضوں کے علاوہ بہت سے اور کام بھی کئے۔ اخوت ہیلتھ سروسز ایسا ہی ایک اہم قدم ہے۔ بہترین علاج، بہترین ادویات مفت یا معمولی قیمت پر۔ اخوت ہیلتھ سروسز کے تحت جو پہلا کلینک قائم ہوا اس نے بہت سے لوگوں کی زندگی بھی بچائی۔ ایک بار کسی مریض سے ڈاکٹر نے کہا ''تمہارا واحد علاج پاؤں کاٹنے میں ہے۔ ورنہ زخم کا زہر سارے جسم میں سرائیت کر جائے گا۔''

یہ سن کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ جس پاؤں پہ اس نے کھڑا ہونا سیکھا۔ جو پاؤں چالیس سال تک اس کا بوجھ اٹھا کر چلتا رہا۔ کیا وہ اس سے محروم ہو جائے گا۔ معذوری' بیساکھی' دھکے۔ کسی نے اسے اخوت کلینک کا بتایا۔ وہ یہاں پہنچا۔ ڈاکٹر اظہار الحق نے اس کے پاؤں پہ اپنا ہاتھ رکھ کے کہا نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔ اور پھر ایسا نہیں ہوا۔ اس کے پاؤں پر اس مہارت سے مرہم رکھا گیا کہ پاؤں کاٹنے کی نوبت نہ آئی۔ ڈاکٹر اظہار الحق کی یہ ٹیم چار لوگوں پہ مشتمل ہے اور یہ سب مل کے ایک یا دو نہیں ایسے بہت سے افراد کے پاؤں کٹنے سے بچا چکے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ایسا مرہم ہے جسے نازک رگوں پہ رکھتے ہی خون رسنا بند ہو جاتا ہے۔ پیپ خشک ہو جاتی ہے۔ زخم خود بخود بھرنے لگتے ہیں۔

کچھ لوگ اسے جادو کہتے ہیں کچھ مسیحائی۔ ڈاکٹر اظہار اور ڈاکٹر طاہر رسول کے نزدیک یہ صرف خدمت ہے۔ اس خدمت میں روبی دانیال اور شاہد سلیم سب سے آگے ہیں۔ سادہ لوح اور خوش مزاج۔ انہوں نے گینگرین کے علاج کی خصوصی تربیت لی ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ علاج کا دارومدار صرف تربیت پہ نہیں ہوتا۔ اس کیلئے عجز اور اخلاص بھی چاہیے۔ وہ معاوضہ نہیں لیتے کہ معاوضہ تو مسیحائی کی ضد ہے۔ کسی کا پاؤں اور کسی کی ٹانگ بچ گئی۔ اس سے بڑا معاوضہ اور کیا ہوگا۔ غریب' امیر کی بھی کوئی قید نہیں۔ بس اتنا سا وعدہ لیتے ہیں کہ اب یہ پاؤں نیکی کا قدم بن جائے گا۔ اخوت ہیلتھ سروس ایک چھوٹا سا کلینک ہے۔ لیکن اب تک اس کلینک میں ذیابیطس' بلڈ پریشر اور ہیپاٹائیٹس کے ہزاروں مریضوں کا علاج ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس کام کو بہت خلوص سے آگے بڑھایا۔ یہاں کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ بس ایک غلہ پڑا ہے اس میں جو جی چاہے ڈال دیں۔ حسبِ توفیق۔ حسبِ منشاء۔ یہ رقم گھوم کر مریضوں کے لئے ہی استعمال ہوتی ہے۔ اخوت کا عزم ہے کہ یہ جگہ ذیابیطس کے علاج اور تحقیق کے ایک بڑے مرکز میں ڈھل جائے۔ کوئی گہرا زخم ناسور نہ بنے۔ خون نہ رِسے۔ پیپ نہ بہے۔ پاؤں نہ کاٹنا پڑے۔ اخوت ہیلتھ سروسز کے تحت اخوت کلینک ابھی صرف لاہور میں قائم ہوا ہے۔ ایسے بہت سے کلینک ابھی اور بننا ہیں۔ امید کی نئی کرنیں' ایثار اور دردمندی کے نئے راستے۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے۔

6.8۔ راولپنڈی

اخوت صرف چند شہروں کیلئے نہیں۔

بہت سے لوگوں نے یہ سوال کیا کہ آپ لاہور تک محدود کیوں ہیں۔ لاہور سے باہر اخوت کا آغاز کب ہوگا۔ ظاہر

ہے اس کا انحصار وسائل کی دستیابی پہ تھا اور پھر کچھ ایسے لوگ بھی درکار تھے جو اس فلسفہ پہ یقین رکھتے ہوں۔ جب یہ وسائل ملے، جب دردمند لوگوں نے لبیک کہا تو پھر دیر نہ ہوئی۔ اخوت کا علم بستی بستی لہرانے لگا۔ اب تک ہم ایک سو دس شہروں میں پہنچ چکے ہیں۔ بقول جالب ''آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں''۔ ان سب شہروں کی کہانی سنانے کیلئے ایک زمانہ درکار ہے..... صرف ابتدائی سنگِ میل۔ چند اولین شہر۔

راولپنڈی میں ہم میجر (ر) امان اللہ کے توسط سے پہنچے۔ میجر امان اللہ راولپنڈی کی ایک معروف سماجی شخصیت ہیں۔ چیمبر آف کامرس کے سابق صدر اور کئی رفاہی اداروں سے منسلک۔ ان کی بےلوث خدمات کا احاطہ چند الفاظ میں نہیں ہوسکتا۔ انہیں اخوت کی خبر سلیم رانجھا نے دی۔ امان اللہ صاحب ایک روز خصوصی طور پر لاہور پہنچے اور ہماری پہلی ملاقات میں ہی اخوت راولپنڈی کے قیام کا فیصلہ ہوگیا۔ یہ اپریل 2006 کی بات ہے۔ وسائل کی کمی، نیا شہر، نئے لوگ۔ لیکن میجر امان کے لہجے میں یقین کی قوت تھی۔ انتظامات کی ذمہ داری اخوت کے ایک ذہین اور بااعتماد ساتھی آفتاب کو سونپی گئی جو اپنی زندگی اخوت کے نام کر چکا ہے۔ اس نے سب سے پہلے خواجہ زاہد کو تلاش کیا جو پنڈی کا پہلا لون افسر اور پہلا برانچ منیجر بنا۔ زاہد نے یہ ذمہ داری بہت جذبے سے قبول کی اور آفتاب کے ساتھ اس کام کیلئے وقف ہوگیا۔ لیاقت باغ کے نواح میں آریا نامی محلّہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں قرضوں کی پہلی تقسیم ہوئی۔ اس علاقے میں ہمارا پہلا رضا کار خالد تھا جس کا اس محلے میں ایک چھوٹا سا سٹور ہے۔ آٹھ قرضے۔ اسّی ہزار کی رقم۔ افتتاح کے موقعہ پر میجر امان اور ان کے ساتھی بھی موجود تھے۔ وہی پیغامِ اخوت، وہی پذیرائی۔ ہمیں یقین تھا کہ کامیابی قدم چومے گی۔ یقین بھی تو فتح سے کم نہیں۔ کچھ عرصہ بعد پنڈی کی ذمہ داری زاہد کی جگہ مہتاب نے سنبھال لی۔ بہترین صلاحیتوں کا حامل، آفتاب کی طرح بلند ہمت، بلند حوصلہ۔ دن ہو یا رات، صبح ہو یا شام کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کی محنت میں کمی آئی ہو۔ ہمہ وقت مستعد۔ راولپنڈی میں اخوت کی کامیابی میجر امان اللہ کی سرپرستی اور پھر آفتاب، زاہد اور مہتاب کی شب و روز محنت کا حاصل ہے۔ آریا محلّہ کی مسجد سے یہ خوشبو مسلسل پھیلتی رہی۔ اس وقت اس شہر میں اخوت کے سات دفاتر قائم ہیں۔ پچاس سے زیادہ ملازم، پچیس کروڑ کے قرضے، بیس ہزار مستفید گھرانے اور سو فیصد شرح واپسی۔ یہاں کے سٹاف کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ امانت، دیانت اور محنت۔ آج ان گنت لوگ ان کی محبت کے دعویدار ہیں۔ پنڈی میں اخوت کی ایک اور

کامیابی الاصلاح فاؤنڈیشن ہے۔اصلاح فاؤنڈیشن جن لوگوں نے بنائی وہ بھی اللہ کے محبوب بندے ہیں۔ ندیم خالد ملک، بریگیڈیر محمد سرفراز، فرخ کمال۔اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے۔انہوں نے اخوت کے ماڈل کو اپنانے کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر قربانی کے نئے معیار قائم کر دیئے۔شوق اور ایثار میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔

مقامی چیمبر آف کامرس نے اخوت کی بہت سرپرستی کی۔ایک گھنے پیڑ کی طرح۔یہ سب میجر امان کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔چیمبر کا ہر منتخب صدر اخوت کو اپنے مقاصد کی ہی ایک کڑی شمار کرتا ہے۔اخوت کی ماہانہ میٹنگ بھی چیمبر کے ہال میں منعقد ہوتی ہے۔راولپنڈی چیمبر نے اخوت کے فلسفہ کو جس طرح اپنایا وہ دوسرے شہروں کیلئے بھی مثال ہے۔اخوت پنڈی کے ساتھیوں اور رضا کاروں میں فضل الرحمان اور بدر ہارون جیسے انمول لوگ شامل ہیں۔محترمہ زاہدہ امین اور ان کی بیٹی آمنہ کی اخوت سے وابستگی مثالی حیثیت رکھتی ہے۔عطیات میں سب سے بڑا عطیہ وقت کا ہے۔اخوت کی ہر تقریب میں شمولیت ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اخوت پنڈی کی ایک اور خوبی سالانہ تقریب ہے۔یہ تقریب ہر سال بہت توجہ اور اہتمام سے منعقد ہوتی ہے۔اخوت سے وابستہ سیکڑوں خاندان اور پنڈی کی معتبر شخصیات اس تقریب میں شرکت کرتی ہیں۔لیاقت ہال میں ہونے والی دو تقاریب میں اٹلی کے سفیر مہمانِ خصوصی تھے۔جب وہ تقریب میں پہنچے تو لوگوں نے اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر جس والہانہ پن سے ان کا استقبال کیا اس کا نقش ان کے دل پہ ہمیشہ قائم رہے گا۔سابق کمشنر زاہد سعید اور سابق ڈپٹی کمشنر امداد اللہ بوسال کا تعاون بھی ہمیشہ دستیاب رہا۔یہ تعاون انتظامی بھی تھا اور ذاتی بھی۔2011 میں جب یہ تقریب منعقد ہوئی تو میں کمر کے درد کی وجہ سے چلنے پھرنے سے قاصر تھا لیکن ڈاکٹر کامران شمس اور اظہار الحق ہاشمی نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور ہم لاہور سے پنڈی پہنچ گئے۔سفر کی وجہ سے میری حالت خاصی غیر تھی۔مجھے گاڑی سے اٹھا کر لیاقت ہال کے اندر پہنچایا گیا۔یہ منظر دیکھ کر میجر امان بے حد آزردہ ہوئے۔لیکن اس آزردگی میں بھی مسرت تھی۔انہوں نے جس طرح مجھے خوش آمدید کہا وہ منظر آج بھی میرے دل میں محفوظ ہے۔پنڈی کی ایک سالانہ تقریب میں حنیف عباسی اور راجہ انور بھی شریک ہوئے۔اخوت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان دونوں صاحبان کا سیاست سے گہرا تعلق ہے۔حنیف عباسی تو اپنے بھرپور سیاسی کردار کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن

سابق طالب علم رہنما راجہ انور کا شمار بھی سیاست کے پرانے کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔کبھی وہ انقلاب کا پرچم بردار تھا اور بغاوت کی بات کیا کرتا تھا لیکن اب بغاوت پہ تدبر کا رنگ حاوی ہو چکا ہے۔ذوالفقار علی بھٹو سے مرتضیٰ بھٹو تک' اس نے قربانی کی بہت سی منزلیں طے کیں۔سات سال کی جلاوطنی بھی اسی قربانی کا حصہ ہے۔جھوٹے روپ کے درشن جیسی نازک تحریر کا مصنف راجہ انور اخوت کے فلسفہ میں ڈوب گیا۔جھوٹے روپ کے درشن۔یہ کتاب اس نے پنجاب یونیورسٹی کی نہر پہ بیٹھ کے لکھی۔یہ ایک ناکام محبت کی کہانی ہے۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ محبت کبھی ناکام نہیں ہوتی۔محبت تو بس محبت ہوتی ہے۔جیسے روشنی روشنی ہے' خوشبو خوشبو ہے۔محبت کا آغاز ہی ناکامی جیسے لفظ پہ لکیر کھینچ دیتا ہے۔ہارورڈ یونیورسٹی کے وزٹ کے بعد راجہ انور نے بھی ایک اخبار میں بہت خوبصورت کالم لکھا۔راجہ انور نے کہا:

''امجد ثاقب نے اپنے کیریئر کا آغاز بحیثیت ڈی ایم جی آفیسر کیا۔ڈی ایم جی میں شامل افراد کو افسروں کا افسر سمجھا جاتا ہے۔چیف منسٹر اور پرائم منسٹر سیکرٹیریٹ کی ساری اہم پوسٹیں انہی کے نام ہوتی ہیں۔سیاستدانوں کا تو صرف نام چلتا ہے، ان کے پسِ پشت اصل فرماں روائی انہی ڈی ایم جی افسروں کی ہوتی ہے۔آج سے چودہ پندرہ سال قبل ڈاکٹر امجد ثاقب، چیف منسٹر سیکرٹیریٹ میں ایک اہم پوسٹ پر متعین تھا۔اگر وہ اس ڈگر پر چلتا رہتا تو آج یقیناً کسی محکمے کا سیکرٹری ہوتا مگر اس نے جاگتے میں ایک ایسا خواب دیکھ لیا جس نے پھر اسے سونے نہیں دیا۔اس طرح کا خواب کسی بھی معاشرے یا کسی بھی مذہب کے پیروکار نے شاید دیکھا تو ہوگا مگر ان میں سے کوئی میدانِ عمل میں اترنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ان کے خواب صرف قصے کہانیاں سنانے تک محدود رہے......خواب یہ تھا کہ کیا بلاسود قرضہ کو آج کی دنیا میں رواج دینا ممکن ہے؟ کیا اس قرضے کی واپسی ایسے سماج میں ممکن ہے، جہاں لوگ پورے کے پورے بنک ڈکار جاتے ہوں؟ پھر اس قرضے کو دینے کے لیے بنیادی فنڈ کہاں سے فراہم ہوگا؟ قرضے کے لین دین کا کیا طریقہ کار ہوگا؟ ضمانت کیا ہوگی؟ اپنی ساری باتیں اللہ کے در پر چھوڑ دینے والا یہ شخص اندر سے بڑا ولی ہے۔جب اس کے دل کے ہر کونے سے ''ہاں، ہاں'' کی آواز ابھری تو اس نے اپنے ہمراہ کچھ دوست جمع کیے، اخوت نامی تنظیم کی بنیاد رکھی اور دس ہزار روپے سے ایک محلے میں اپنے کام کا آغاز کیا۔آہستہ آہستہ معاملہ چل نکلا۔قرضوں کا دائرہ کار بڑھتا گیا۔بہت سے حضرات نے جو غریبوں کی مدد کرنا چاہتے تھے اپنے صدقات اور عطیات کے ساتھ اس کی

جانب رخ کیا۔ جو کوئی ایک بار اس دائرے میں داخل ہوا، پھر وہ اس مقناطیس سے چپک کر رہ گیا۔ جو قرضہ لینے والوں کی قطار میں کھڑا تھا وہ اپنا قرض اتارنے کے بعد حسب استطاعت قرضہ دینے والوں میں شامل ہو گیا۔ ہر فرد نے اپنے طور پر لوگوں کو تحریک دے کر اپنے اپنے شہروں اور محلوں میں اس پروگرام کو پھیلانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 11-2010 میں 'اخوت' نامی تنظیم نے ایک ارب روپے کے بلا سود قرضے بانٹے۔ 12-2011 میں یہ حجم دو چند ہو کر دو ارب روپے تک پہنچ گیا۔ امجد ثاقب اور 'اخوت' کی کہانی ہمیں ایک نئے پاکستان کا نیا چہرہ دکھاتی ہے اور وہ چہرہ یوں ہے کہ ہمارے امراء میں بکثرت ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو لاکھوں کروڑوں کے قرضے ہڑپ کر گئے۔ لیکن اس ملک کا ایک غریب ترین چھابڑی فروش قرضہ صد فیصد لوٹاتا ہے یعنی غریب عوام نہ چور ہیں اور نہ ڈاکو...... ڈاکٹر امجد ثاقب کا خدا بھلا کرے جس نے جا کر انھیں جگایا، قرضے دیے اور کام پر لگایا۔ قوم پر اتنا بڑا احسان نہ کوئی سیاستدان کر سکا جو اپنے لیے ووٹ مانگتے مانگتے قبر کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے اور نہ ملائیت کر پائی جو چندہ دینے والوں کو جنت کی بشارتیں سناتے سناتے تہ خاک ہو جاتی ہے۔ گزشتہ ماہ ڈاکٹر امجد ثاقب کو امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں میں اس ماڈل پر لیکچر دینے کے لیے بلایا گیا۔

اس سے صدہا سوالات پوچھے گئے کہ یہ نظام پورے پاکستان میں کتنے عرصے میں پھیل سکتا ہے؟ اسے دوسرے ممالک میں رائج کرنے میں کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں؟ مغربی معیشت دانوں کو مکمل طور پر مطمئن کرنا تو شاید اس وقت ممکن نہ ہو لیکن امجد ثاقب کا یہ کمال کیا کچھ کم ہے کہ اس نے پوری دنیا کے معاشی فلسفے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر امجد ثاقب کو یقین رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں وہ اکیلا نہیں:

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے''

مجھے راجہ انور کی اس پیشین گوئی سے مکمل اتفاق ہے......اور نکلیں گے عشاق کے قافلے۔ فیض صاحب کا یہ شعر ایک لازوال فتح کی نوید ہے۔ زندگی کبھی ہتھیار نہیں ڈالتی۔ زندگی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔ زندگی تو ہماری طلب اور آرزو میں زندہ رہتی ہے۔ یہی بات ول ڈوراں نے کہی تھی...... ''لوگ مر جاتے ہیں لیکن زندگی ان

کے خوابوں کو مرنے نہیں دیتی اور بالآخر ایک روز ان کی تعبیر تک پہنچ جاتی ہے'' ......اور نکلیں گے عشاق کے قافلے۔اور نکلیں گے عشاق کے قافلے۔

6.9۔ فیصل آباد

فیصل آباد حبیب جالب' حسن نثار اور ریاض مجید جیسے لوگوں کا شہر ہے۔ یہاں اخوت کا دیپ روشن کیوں نہ ہوتا۔فیصل آباد سے میری ایک ذاتی نسبت بھی ہے۔ یہاں سے اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ڈجکوٹ نامی ایک قصبہ کے پاس میرا آبائی گاؤں ہے جہاں میرے بہت سے بزرگ گہری نیند سو رہے ہیں۔ پڑدادا' دادا اور والد۔ یہ تینوں بزرگ چھیاسٹھ سال پہلے لاکھوں لوگوں کی طرح ہجرت کر کے پاکستان پہنچے۔ پڑدادا کی عمر اس وقت پینسٹھ سال' دادا پینتالیس سال اور والد بیس سال کے تھے۔ایک دوسرے کا بازو پکڑ کر انہوں نے سرحد پار کی اور پاکستان میں داخل ہو گئے۔گھر بار، کاروبار، زمین سب پیچھے رہ گیا اور ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہونے لگا۔والد نے ساری زندگی ملازمت میں گذار دی۔ان کی دیانت داری ضرب المثل کی طرح مشہور تھی۔محدود وسائل کے باوجود ہمیں ہر سہولت میسر رہی۔ وہ عام طور پر اپنی بات پر اڑ جاتے تھے لیکن میری کوئی بات انہوں نے کبھی رد نہ کی۔ بے لوث خدمت کا جذبہ ان پر غالب رہتا۔ ہماری پرورش انہوں نے انتہائی شفیق باپ کی طرح کی۔محنت اور دیانت ان کا اصل اثاثہ تھا۔یہی اثاثہ مجھے اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر افضل جاوید کو ملا۔میری والدہ کا خاندان بھی بھارتی پنجاب کے ایک ضلع ہشیار پور سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔گویا ہجرت کی اداسی ماں اور باپ سے وراثت میں ملی۔شاید یہی وجہ ہے کہ مؤاخات کا درس اچھا لگتا ہے۔اخوت فیصل آباد کا آغاز ڈجکوٹ نامی اسی قصبہ سے 14 اگست 2006 میں ہوا۔قرضوں کی پہلی تقسیم میرے والد کی موجودگی میں ہوئی۔انہوں نے زندگی میں بہت کم اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مجھے کوئی کامیابی ملتی تو میں یہ سوچ کے گھر پہنچتا کہ آج تو والد صاحب بہت خوش ہوں گے۔آج تو وہ آگے بڑھ کے داد دیں گے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ ایک عملی انسان تھے۔جذبات سے ان کا رشتہ بہت معمولی تھا۔ لیکن اس روز میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔تشکر کا احساس آنکھیں بھگو دیتا ہے۔

ڈجکوٹ سے اخوت کا کارواں فیصل آباد پہنچا۔ جہاں پہلی تقریب اکتوبر 2006 کو ہوئی۔فیصل آباد میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی عمارت کے سامنے ایک پرانی مسجد ہے۔اس مسجد اور بنک کا فاصلہ چند قدم

سے زیادہ نہیں۔لیکن چند قدم کا یہ فاصلہ بہت طویل لگتا ہے۔ میں جب بھی اس مسجد سے اسٹیٹ بنک کی عمارت کو دیکھتا ہوں تو مجھے قائداعظم کے وہ تاریخی کلمات یاد آتے ہیں جو انہوں نے یکم جولائی 1948 کو اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقعہ پر کہے:

The economic system of the West has failed to do justice. The adoption of Western economic theory will not help us in achieving our goal of creating a happy and contended people. We must work our destiny in our own way and present to the world an economic system based on concept of social justice.............. May the Sate Bank of Pakistan prosper and fulfil the high ideals which have been set as its goal.

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ قائد کا یہ خواب تعبیر کو پہنچے۔ ہم مغرب کے معاشی نظام کو کب خیر باد کہیں گے۔قائداعظم کی اور باتوں کی طرح ہم نے یہ بات بھی بھلا دی۔اتحاد،یقین اور نظم وضبط۔ یہ بھی تو انہی کا پیغام تھا۔جارج واشنگٹن، ابراہام لنکن، روز ویلٹ۔وہ تمام لوگ جن کا ذکر نکسن نے اپنی کتاب میں کیا......انہی پہ کیا موقوف بیسیویں صدی کے بہت سے اور لیڈر۔قائداعظم ان میں کسی سے پیچھے نہیں۔نہ فکر میں، نہ عمل میں۔ایک بڑے لیڈر کی کون سی خوبی ہے جو ان میں نہیں......استعمار سے آزادی، ایک خطۂ زمین کا حصول اور ایک مملکت کی بنیاد۔ یہ تینوں کام ناقابلِ یقین ہیں اور قائد نے یہ تینوں کام صرف سات سال میں کر دیئے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو عشق کو کام اور کام کو عاشقی بنا دیتے ہیں۔وہ جو سٹینلے والپرٹ نے کہا:

“Few individuals significantly alter the course of history. Fewer still modify the map of the world. Hardly anyone can be credited with creating a nation-state. Mohammad Ali Jinnah did all three.”

(Stanley Wolpert)

اس شخص کے دامن پہ ایسا کوئی داغ نہیں جس پر تاریخ کو ندامت کے آنسو بہانا پڑیں۔جس قوم کے پاس لا الہ الا اللہ جیسا نظریہ اور محمد علی جناح جیسا رول ماڈل ہو وہ بھی ترقی کے سفر میں اقوامِ عالم سے پیچھے رہ جائے۔پلکوں پہ حیرت کے دیئے روشن کرکے یہ سوال میں ہر روز پوچھتا ہوں۔

فیصل آباد میں اخوت کے تین بڑے دوست معظم بن ظہور، شاہد پرویز اور رانا محمد سعید ہیں۔ مقامی سٹیرنگ کمیٹی کے روح رواں۔ معظم تو ایک فرشتہ صفت انسان ہے۔ لازوال جذبوں کا مظہر۔ دردمندی اور خلوص کا پیکر۔ فیصل آباد میں اخوت کو عام کرنے کا فریضہ اسی کی سرگردگی میں انجام پایا۔ وہ ابتدائی قرضے جو اس روز تقسیم ہوئے آج ایک بہت بڑے پروگرام میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ نہ صرف فیصل آباد شہر بلکہ بہت سے قصبوں میں یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ اس کام میں شاہد پرویز کی محنت، محمد علی بلوچ اور میاں کمال الدین کی بھرپور توجہ بھی شامل ہے۔ شاہد پرویز اخوت کا عزیز دوست کچھ ماہ پہلے خالقِ حقیقی سے جا ملا لیکن اپنی محبت کا نقش پیچھے چھوڑ گیا۔ اس کے بھائی پرویز خالد نے اس کی روایت کو زندہ رکھا اور ایک نئے عزم کے ساتھ اخوت کا علم اٹھا لیا۔ اس شہر میں اخوت کے دیگر دوستوں میں میاں محمد حنیف بھی ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ میں ''محمدی دستر خوان'' بچھا رکھا ہے اور ستارہ کیمیکل کے میاں محمد ادریس بھی جنہوں نے بیس سال پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے کاروبار میں سود کی آمیزش نہ ہو گی۔ کسی بڑے کاروباری گروپ کی جانب سے سود کے خلاف یہ پہلی معتبر آواز تھی۔ ان بڑے لوگوں میں اخوت کے دو کارکن شاید سب سے آگے ہیں۔ ممتاز احمد اور محمد ذوالفقار۔ ممتاز جب فیصل آباد پہنچا تو اس شہر کے گلی کوچوں سے ناآشنا تھا۔ اب چھ سال بعد وہ چالیس ہزار گھرانوں کو نصف ارب سے زیادہ رقم پیش کر چکا ہے۔ وہ اس شہر میں اخوت کا مجاہد اول ہے۔ وہ ایک بہت بڑے ادارے میں کام کرتا تھا۔ جب اخوت میں آیا تو اس کی تنخواہ بڑھنے کی بجائے نصف رہ گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ نصف نہیں کئی گنا ہو گئی ہے۔ ممتاز کی اس دلیل کو بھلا کون مانے گا۔ لیکن یہی دلیل اسے مجاہد اول بھی تو بناتی ہے۔ ذوالفقار بھی اسی کی طرح دیوانہ ہے لیکن اس کی دیوانگی بھی ہشیاری سے بڑھ کر ہے۔ آفتاب، شاہد، فاروق، ثقلین، ماہتاب، خالد اور سعید...... چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی ایسے لوگ نہیں ملتے۔ فیصل آباد کے دوا داروں نے بھی اخوت کو اپنایا اور اپنے طور پر یہ پروگرام شروع کیا۔ پہلا ادارہ SAY ٹرسٹ ہے اور دوسرے ادارے کا نام زادِ راہ ہے۔ زادِ راہ کے روحِ رواں ملک عارف ہیں۔ ان کے عزیز، جاوید اور دیگر ساتھیوں نے کچھ ہی عرصہ میں جو فاصلہ طے کیا وہ ان کے بے پایاں اخلاص کا مظہر ہے۔ زندگی کی قبا میں نیکی کے پیوند لگاتے ہوئے یہ لوگ:

کشیدہ کارِ ازل تجھ کو اعتراض کوئی
کہیں کہیں سے اگر زندگی رفو کر لوں

6.11۔نوشہرہ

جولائی 2010 نوشہرہ کیلئے قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ دریائے اٹک کی منہ زور لہروں نے سارے شہر کو زیر کرلیا۔ دس دس فٹ اونچا پانی۔ نہ زندگی بچی نہ مال واسباب۔ لوگوں کے ہاتھ سے امید کا دامن بھی چھوٹنے لگا۔ اہلِ وطن نے مصیبت کی اس گھڑی میں سیلاب زدگان کی جس طرح مدد کی وہ بھی ایثار کا ایک یادگار باب ہے۔ سارا پاکستان اُمڈ پڑا۔ مصیبت میں گھرے، پانی میں ڈوبے لوگوں کو ایک نیا حوصلہ ملا۔ مشکل کے ابتدائی دن تو گذر گئے لیکن مستقل بحالی کون کرے گا۔ جن غریبوں کے گھر بہہ گئے اور جن کے کاروبار اور دکانیں تباہ ہوئیں وہ کدھر جائیں گے۔ ہاتھ پھیلائے رکھنا ان بہادر لوگوں کا شیوہ نہیں۔ اخوت نے فیصلہ کیا کہ اہلِ نوشہرہ کو بھی دل میں جگہ دینی ہے۔ دو طرح کے قرضے دینے کی منصوبہ بندی ہوئی۔ گھروں کی تعمیر اور کاروبار کا دوبارہ اجراء۔ اخوت کے دیرینہ ساتھی مردان کے بلال طارق نے دستِ تعاون بڑھایا۔ عمر صادق اور بختیار تربیت کیلئے راولپنڈی پہنچے۔ یہ سارا کام اکتوبر میں مکمل ہوگیا۔ یکم نومبر کو دفتر کا افتتاح ہوا۔ سیلاب کی سڑاند اور تباہی کے آثار۔ یہ سب ابھی تک موجود تھا۔ لوگوں کو یقین دلانا مشکل تھا کہ انہیں کھڑا ہونے کیلئے بلاسود قرضے دیئے جائیں گے۔ نوشہرہ کیلئے وسائل عمران خان فاؤنڈیشن اور میر خلیل الرحمان فاؤنڈیشن نے مہیا کیے۔ عید کے اگلے روز ستر افراد کو پہلی بار قرضے پیش کیے گئے۔ اخوت کے دوست اور معروف کالم نگار ہارون الرشید بھی اس موقعہ پر موجود تھے۔ اخوت کے اس لازوال مظاہرے پر ان کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔ رورل سپورٹ پروگرام کی جانب سے بیگم منور ہمایوں اور ملک فتح خان بھی پہنچ گئے۔ عمران خان فاؤنڈیشن کی نمائندگی ان کے عہدیداروں نے کی۔ بلال طارق اور ان کے ساتھی جو مقامی سٹیرنگ کمیٹی کے رکن ہیں استقبال کیلئے بچھے جاتے تھے۔

اگلا ایک سال لازوال جذبوں کا سال تھا۔ جو گھرانہ بھی قرض لیتا دعاؤں کا ڈھیر دفتر میں چھوڑ جاتا۔ یہ دعائیں اخوت کے ملازمین کو رات دن کام کرنے پہ آمادہ کرتیں۔ آفتاب، مہتاب اور خواجہ زاہد۔ اخوت کے دیرینہ کارکن، ایک نئے عزم سے آگے بڑھے۔ نومبر 2011 میں نوشہرہ میں اخوت کی دوسری برانچ کا افتتاح ہوا۔ محبت کا کارواں بھی کبھی رکتا ہے۔ اس برانچ کیلئے وسائل بھی عمران خان فاؤنڈیشن نے دیئے۔ اس وقت پانچ ہزار گھرانوں کے پاس چھ کروڑ سے زائد کی رقم پہنچ چکی ہے۔ سیلاب نے بہت کچھ چھینا لیکن

کردار نہ چھین سکا۔سوفیصد شرح ریکوری اسی کردار کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔قرضہ لینے والوں میں سو سے زائد معذور افراد بھی تھے جو معذوری کے باوجود کشکول اٹھانے کیلئے راضی نہ ہوئے۔ایک بڑی تعداد مسیحی برادری کی ہے۔یہ لوگ سودخوروں کے چنگل سے نکلنے کیلئے اخوت کے پاس پہنچے۔نوشہرہ کا تجربہ ترقی سے منسلک اداروں کیلئے ایک زریں مثال ہے۔لوگوں کو بھیک نہیں چاہیے۔انہیں تو دوستی اور رفاقت درکار ہے۔یاسمین بی بی' سخی محمد' نادیہ خان............یہ فرضی کردار نہیں۔انہوں نے اپنے ہاتھوں سے زندگی کو ازسرِنو تعمیر کیا۔خودداری کیا ہے۔کوئی سیکھنا چاہے تو ان سے آ کے سیکھے۔مالاکنڈ کے سید ابرار کا کہنا ہے کہ اخوت نے ہمیں ایک نیا درس دیا ہے۔ہمیں تو زندگی کے معنی ہی اب سمجھ آئے ہیں۔قاسم نیاز' غلام قادر' شیراز محمود شیرازی' میجر (ر) سجاد احمد۔کیسے کیسے لوگ ملنے لگے۔پشاور' مانسرہ' اکوڑہ خٹک' مردان' مالاکنڈ۔اسی دوران فاطمہ میموریل ہسپتال کی مہتمم شاہیمہ رحمان ہمیں نتھیا گلی لے گئیں۔بلند پہاڑ' بلند درخت اور ان سے بھی بلند جذبہ ہائے دل۔ہارون الرشید نے کیا غلط کہا تھا............''حیرت ہوتی ہے اور ناقابلِ بیان حیرت کہ جب اللہ کا ایک بندہ ارادہ کر لیتا ہے' مصمم ارادہ تو کیسا معجزہ سا رونما ہوتا ہے۔فرد سے جماعت' جماعت سے قافلہ اور قافلے سے کارواں۔معلوم نہیں کون ہے جو راستوں میں سے کانٹے چن دیتا ہے۔منزلِ مقصود کی طرف اس طرح چلے جاتے ہیں جیسے پانی ڈھلوان پہ اترتا ہے اور اترتا ہی چلا جاتا ہے۔''

نوشہرہ میں اخوت کا آغاز ایسا ہی معجزہ تھا۔

6.12۔کوئٹہ: رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

کوئٹہ کی کہانی شاید سب سے دلگداز ہے۔کبھی یہ شہر خوبصورتی کا گہوارہ تھا۔اب تو بس ایک سناٹا ہے۔محبت کی جگہ خون کے چھینٹے اور درد کے پیوند۔اس شہر نے جو کچھ دیکھا وہ چشم فلک نے کہاں دیکھا ہوگا۔قطار در قطار میتیں۔کوچہ در کوچہ جنازے۔کیسی بے بسی ہے۔کچھ معصوم لوگ کئی دن آسودۂ خاک بھی نہ ہو سکے۔حجاج بن یوسف نے ایک بہادر کو کئی روز صلیب پہ لٹکائے رکھا۔ان کی عظیم ماں نے دیکھا تو کہا' کیا ابھی شہسوار کے اترنے کا وقت نہیں ہوا۔کوئٹہ میں گڑی صلیبیں بھی یہی سوال کرتی ہیں۔اس شہر میں اخوت کا کام اسلامک ریلیف کی معاونت سے شروع ہوا۔کچھ دیر یہ رفاقت قائم رہی لیکن پھر یہ بھاری پتھر اخوت کو اکیلے ہی اٹھانا پڑا۔اب تک کئی سو قرضے دیئے جا چکے ہیں۔خواجہ زاہد اور مفتی محمد طاہر نے کمال کام کیا۔جس شہر میں

لوگ سرِشام گھروں میں دبک کے بیٹھے رہیں وہاں ان قرضوں سے کیا کاروبار ہوگا۔ ایک عورت نے محلے کے بیچوں بیچ گھر کا دروازہ کھول کر دکان بنالی۔ چھوٹا سا جنرل سٹور۔ عزت سے روٹی ملنے لگی۔ لیکن یہ کام کہاں تک چلتا۔ شہر کی رونق اجڑی تو محلے کی رونق بھی اجڑ گئی۔ قرض کی قسط لینے گئے تو اس کا آنچل آنسوؤں سے بھر گیا۔ دہشت کے متوالوں نے بظاہر سب کچھ چھین لیا لیکن بھرم ابھی باقی تھا۔ کہنے لگی ''وعدے سے انکار نہیں۔ ذرا اس دیوانگی کو دم لینے دو ایک ایک پائی ادا کروں گی''۔ خدایا یہ دیوانگی کب دم لے گی۔ یہ شہسوار صلیب سے کب اتریں گے۔ حنا جھیل سے ایک پرانے نغمے کی آواز آتی ہے............

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

یہ لہو

یہ شفق رنگ لہو

جس کے ہر قطرے میں خورشید' کئی

جس کی ہر بوند میں اک صبح' نئی

دور جس صبح درخشاں سے اندھیرا ہوگا

رات کٹ جائے گی گل رنگ سویرا ہوگا

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

یہ شفق رنگ لہو۔ یہ شفق رنگ لہو

فقیر محمد روڈ اور اردگرد محلوں کے مکین اخوت کا حصہ ہیں۔ پورا کوئٹہ اخوت کا حصہ ہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ شہر پھر سے خوبصورتی کا گہوارہ ہوگا۔ شاید ابھی کچھ اور قربانی درکار ہے۔ وہ جو کسی نے کہا "Freedom is not free"......آزادی اتنی بھی سہل نہیں۔

6.13۔ کراچی

کراچی آباد ہوگا تو پاکستان آباد ہوگا۔

کراچی میں اخوت کا قیام' ایک پرانی خواہش تھی۔ اس خواہش کی تکمیل کا پہلا قدم اس وقت طے ہوا جب

ہماری ملاقات سید قیصر علی سے ہوئی۔ چودہ سال لندن میں ایک بنک سے وابستہ رہنے کے بعد سید قیصر علی وطن واپس پہنچے تو کسی ایسے کاروبار کی تلاش میں تھے جو سود سے پاک ہو...... بڑی مشکل سے بالآخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے کام کے ساتھ لوگوں کی خدمت بھی کریں۔ یہی خواہش انہیں ایک روز اخوت کے پاس لاہور لے آئی۔

سید صاحب پچاس برس بعد ایک بار پھر طالب علم بن کر اخوت کا سبق پڑھنے لگے۔ یہ سبق اور طرح کا تھا۔ ایک مشاق بنکار پہ کھلنے لگا کہ معیشت کی کامیابی سود میں نہیں اور یہ بھی کہ کاروبار صرف نفع کیلئے نہیں ہوتا۔ زانوئے تلمذ تہہ ہوا۔ ذہن پر لکھی پرانی تحریریں دھلنے لگیں۔ ایک نئی تحریر لکھی جانے لگی۔ اس تحریر کا عنوان تھا مؤاخات......سید قیصر علی نے کراچی کے ایک انتہائی پسماندہ علاقے لانڈھی' کورنگی سے اخوت کے کام کا آغاز کیا۔ فیروز خان ان کے دستِ راست بنے اور کچھ ہی دیر میں لاتعداد گھرانے اخوت سندھ سے منسلک ہو گئے۔ پہلے پہل سید قیصر علی اور فیروز خان اکیلے تھے۔ آہستہ آہستہ کچھ اور لوگ بھی آ ملے۔ کسی نے ان کی توجہ کورنگی میں ساحل سمندر کے ساتھ سندھی اور بلوچ ماہی گیر بستیوں کی طرف دلائی۔ رمٹیر ھی گوٹھ' خاص خیلی گوٹھ' علی گوٹھ' لعل گوٹھ' شیر پاؤ کالونی......تعلیم اور ہنر کے ساتھ سرمایہ کی رسائی۔

سید قیصر علی اور ان کے ساتھیوں نے ساحل سمندر پہ ڈیرے ڈال لیے۔ گوہر مقصود بحرِ ذخار میں ہی نہیں ساحل کی بھیگی ریت پہ بھی ملتا ہے۔ سید قیصر علی اور ان کے ساتھی اب تک تین ہزار گھرانوں میں تین کروڑ سے زائد رقم بطور قرضِ حسن تقسیم کر چکے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ کیپٹن حامد' ریحان اللہ والا' جمعیت پنجابی سوداگران دہلی۔ لیکن کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ ایک سے ایک اہلِ خیر۔ اس شہر کی پہچان بارود نہیں انفاق ہے۔ ایثار' سخاوت' دریا دلی۔ ہماری خواہش ہے کہ اخوت کورنگی سے نکل کر شہر کے ہر کونے میں پہنچے۔ سول سروس کے دیرینہ رفیق' دردمندی اور اخلاص کے پیکر نذیر تونیو اور ڈاکٹر ذکی الدین مائل ہو چکے ہیں۔ ان کا مائل ہونا ہی کامیابی کی نوید ہے۔ اندھیرے ان کے مقابل ٹھہریں گے نہیں۔ ادھر ایس ایم نصیر اور ملک بوستان کا بھی وعدہ ہے۔ کیا عجب یہ شہر بھی شہرِ اخوت بن جائے۔ یوں بھی اس شہر میں اکثریت انہیں کی ہے جو ہجرت کی روایت دہرا کے یہاں پہنچے ہیں۔ کوئی دلی اور لکھنؤ سے آیا تو کوئی پشاور سے' کوئی لاہور سے تو

کوئی کوئٹہ گلگت اور اندرون سندھ سے......شاید ہی پاکستان کا کوئی علاقہ ہو جو یہاں آباد نہ ہو۔کراچی کے ایک اور فرزند سید ابو عاکف کا کہنا ہے کہ دیارِ نبیؐ پہ بیٹھ کے مانگی ہوئی کوئی دعا رائیگاں نہیں جاتی۔وہ بھی وہاں بیٹھا ہر روز یہی دعا مانگتا ہے۔نذیر تونیوا اور ابو عاکف کے علاوہ نجم الثاقب' نوید کامران بلوچ اور یونس ڈاگہ بھی تو ہیں۔سول سروس کے پرانے ساتھی! سندھ کے ایک اور شہر سکھر میں تو اخوت کا کام بہت آگے بڑھ چکا۔ وہاں یعقوب شیخ اور ان کے ساتھی اخوت کی رہنمائی کرتے ہیں۔کیڈٹ کالج پٹارو کے پرنسپل ایس۔ایم۔ یوسف اور آئی بی اے سکھر کے ڈائریکٹر نثار احمد صدیقی سے بھی خیر کی بہت توقع ہے۔یہ سب درست لیکن دل سے آواز بلند ہوتی ہے کہ کراچی آباد ہوگا تو پاکستان آباد ہوگا۔کوئی ہے جو مؤاخات کی یہ آواز سنے۔

6.14۔ راجن پور

اخوت راجن پور ایک روحانی تجربہ تھا۔

2010 کے تباہ کن سیلاب کے بعد اخوت نے فیصلہ کیا کہ ہم سیلاب سے متاثرہ دو اضلاع یعنی نوشہرہ اور راجن پور کو اپنائیں گے۔لاہور کے دس ہزار خاندان اور راجن پور کے دس ہزار خاندان مواخاتِ مدینہ کی پیروی کریں گے۔ یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔سیلاب میں ڈوبے دس ہزار خاندانوں کو منتخب کرنا انہیں قرضِ حسن دینا اور پھر واپسی کے عمل کو یقینی بنانا......اس کام کے لیے درکار وسائل کا بندوبست اور پھر ایک شفاف نظام کی تشکیل......راجن پور پنجاب کا سب سے جنوبی ضلع ہے جس کی سرحدیں بلوچستان اور سندھ سے ملتی ہیں۔پسماندگی' جہالت' بے روزگاری اور پھر جاگیردارانہ اور قبائلی نظام کی آہنی گرفت۔ان دور افتادہ گلی کوچوں میں اخوت کا پیغام عام کرنا آسان نہ تھا۔لیکن یہ منزل مشکل ثابت نہ ہوئی۔دوستوں نے بڑھ کر ہاتھ تھاما اور اکتوبر 2010 میں جام پور میں قرضوں کے پہلے چیک پیش کیے گئے۔ یہ چیک بھی نوشہرہ کی طرح دو مقاصد کیلئے تھے۔سیلاب کے ہاتھوں تباہ ہونے والے کاروبار کا احیاء اور پانی میں بہہ جانے والے گھروں کی تعمیر......کل کا شعلہ بیاں طالبِ علم رہنما اور آج کا سیاستدان خواجہ سعد رفیق بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھا۔سعد رفیق' ان کی بیگم اور ان کے ساتھیوں نے اپنے دوستوں سے ایک خطیر رقم اکٹھی کی اور راجن پور پہنچ گئے۔میاں نصیر احمد' شہزاد احمد۔ یہ سب سیاست کو بھول کے خدمت کی راہ پہ چل نکلے۔راجن

پور کے باسی خواجہ رفیق شہید فاؤنڈیشن کے اس عطیہ اور بے پایاں محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جام پور برانچ کا نام ''اخوت خواجہ رفیق شہید'' برانچ رکھ دیا گیا۔

''آگے بڑھو اخوت کے ساتھ'' کا نعرہ اتنا مقبول ہوا کہ ملک بھر سے عطیات کی بارش ہونے لگی۔ دنیا ٹی وی نے اس ضمن میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ لاہور کے سابق ناظم میاں عامر محمود کا کہنا تھا کہ اخوت کیلئے ان کے تمام وسائل حاضر ہیں اور پھر انہوں نے دل کھول کر ہماری مدد کی۔ عطیات کی صورت میں بھی اور ''دنیا ٹی وی'' کے ذریعے بھی۔ یہ اخوت کا بے مثال مظاہرہ تھا۔ میاں محمد منشاء اور شیخ عابد حسین کی طرح میاں عامر محمود اخوت کے بڑے ڈونرز میں سے ہیں۔ دس ہزار خاندانوں کو اپنانے کا یہ عمل بے حد صبر آزما بھی تھا۔ وسائل کا سلسلہ کئی بار ٹوٹا لیکن امید کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ مجیب الرحمان شامی' ہارون الرشید' اجمل نیازی' اوریا مقبول جان' عامر خاکوانی' ہمایوں احسان۔ یہ سب لوگ آگے آگے تھے اور پھر ان میں پنجاب کے چیف سیکرٹری' ناصر محمود کھوسہ کی مدد بھی شامل ہوگئی۔ ان کا اصرار تھا کہ چرچا نہ ہو کہ چرچا ہونے لگے تو برکت اٹھ جاتی ہے۔ خدمت کا شور دنیا میں نہیں آخرت میں مچنا چاہیے۔ الحمد للہ کہ جو ہدف ہم نے طے کیا تھا وہ دو سال سے کم عرصہ میں مکمل ہو گیا۔ کامیابی کا یہ مرحلہ 16 جولائی 2012 کو مکمل ہوا۔ اظہارِ تشکر کے لئے شاہد حسن شیخ اور ندیم ملک کے ہمراہ ہم کوٹ مٹھن کی اسی دیدہ زیب مسجد پہنچے' جہاں سے اس مہم کا آغاز ہوا تھا۔ خواجہ کلیم کوریجہ' کمال فرید' حاجی عبدالغنی گوپانگ اور اخوت کے کارکن بھی اس موقعہ پر موجود تھے۔ جب اخوت کے ایریا منیجر محمد عتیق نے بتایا کہ آج راجن پور ضلع میں قرضوں کی تعداد دس ہزار نوسو سے بڑھ گئی ہے یعنی دس ہزار سے زائد گھرانے اخوت کا حصہ بن چکے ہیں تو مہمانوں کو یقین نہ آیا۔ کانوں میں خواجہ غلام فریدؒ کی سرمدی آواز گونجنے لگی۔ ''پیلو پکیاں نی وے............آچنوں رل یار۔

6.15۔ میرے اشکوں کا مداوا' نہ بدخشاں نہ حجاز

ملتان' لودھراں اور بہاولپور۔ یہ بھی تو اخوت کے مسکن ہیں۔

ملتان۔ اولیاء کا شہر' درویشوں کا بسیرا۔ حضرت بہاء الدین ذکریاؒ' شاہ رکن عالمؒ' شاہ شمس تبریزؒ' حضرت موج دریاؒ' حضرت شاہ گردیزؒ۔ یہ زمین کیسی کیسی ہستیوں کی قدم گاہ بنی۔ بخارا' گیلان' گردیز' کرخ' بسطام' نیشاپور۔ نجانے کہاں کہاں سے نابغۂ روزگار یہاں پہنچتے رہے۔

اس شہر میں اخوت کا قافلہ ستمبر 2007 میں پہنچا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ اور ڈاکٹر افتخار احمد اولین ساتھی بنے۔ پھر سید اعجاز شاہ، فیصل سعید، افضل سپرا۔ قافلہ بڑھتا رہا۔ ہائی کورٹ کے سایہ میں گیلانی محلّہ ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ یہیں رہتے ہیں۔ اس کی ایک نکڑ سے کام شروع ہوا۔ اول اول یہ سفر سست روی کا شکار تھا۔ محنت میں کمی تھی یا وسائل اکٹھے نہ ہوئے۔ کچھ نامہربان لوگ بھی آڑے آتے رہے لیکن جیت تو ہمیشہ استقامت کی ہوتی ہے۔ اخوت کا ایک بہترین ساتھی ثقلین رضا اپنے تحمل اور بردباری سے حالات کو درست نہج پہ لے آیا۔ اس وقت اس شہر میں سات دفاتر ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ اور اعجاز شاہ درد مند، درد دل۔ ان کا کہنا ہے کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ سچ ہی کہتے ہیں نیکی کے سفر میں واپسی کا راستہ نہیں ہوتا۔ ملتان صدق و صفا کا مرکز بھی ہے اور سیاست کا بھی۔ لیکن اخوت سیاست سے بلند ہی رہی۔ جاوید ہاشمی نے ایک بار مسجد میں آ کر کام دیکھا اور دعا دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ شاہ محمود قریشی نے ہمیشہ کی طرح سرپرستی کا وعدہ کیا۔ ان کی مدد کسی سرمایہ سے کم نہیں۔ انہیں دیکھ کے مخدوم سجاد حسین قریشی کی یاد آتی ہے۔ سجادہ نشین درگاہ بہاءالدین زکریاؒ۔ سابق گورنر پنجاب۔ جنہوں نے نجانے کتنی بار گلے لگا کے دعاؤں کی خلعت پہنائی۔ 2010 کے سیلاب کے دوران دریائے سندھ کی موجوں نے بہت ستم ڈھائے۔ یہی سیلاب راجن پور اور نوشہرہ کی طرح ہمیں مظفر گڑھ لے گیا۔ اب تو مظفر گڑھ بھی اخوت کا ایک اہم مرکز ہے۔

لودھراں ہم بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ جہانگیر ترین کو علم ہوا تو انہوں نے بھی رفاقت میں تاخیر نہ کی۔ لودھراں پائیلٹ پراجیکٹ کے نام سے وہ اس علاقے میں ایک عرصہ سے کام کر رہے ہیں۔ برکت ریاض، نعیم حیدر اور خالد وڑائچ جہانگیر ترین کے ساتھی بھی ہیں اور اخوت کے بھی...... شعیب سلطان نے یہ سب سنا تو کہنے لگے...... ترقی کے کام چھوٹے چھوٹے جزیرے آباد کرنے کی کوشش ہے۔ جب یہ جزیرے ایک دوسرے سے ملیں گے تو غربت کا سمندر خشک ہوگا۔ ساحل مراد یونہی تو قریب نہیں آتا۔ ہمالیہ اور ہندوکش کے دامن سے تھر کے صحراؤں تک۔ خود شعیب صاحب نے بھی تو ان گنت جزیرے آباد کئے ہیں۔ رورل سپورٹ پروگرام ان ہی کی محنت کا صِلہ ہیں۔

بہاولپور میں اخوت کا آغاز اگست 2010 میں ہوا۔ صحرا کی گود میں آباد، یہ بھی کیا شہر ہے۔ جیسے بادِ نسیم مشامِ جاں کو معطر کرنے چلی آئے۔ چوہدری محمد علی، راؤ طارق، سمیع اللہ چوہدری، محمد اظہر اور بلیغ الرحمٰن۔

ہمہ صفت، ہمہ جہت۔ یہی افراد تھے جن کے ساتھ ہم حمایتیاں نامی ایک کچی بستی میں داخل ہوئے۔اب تو یہ کام دس ہزار گھرانوں تک جا پہنچا ہے۔ میں جب پہلی بار بہاولپور پہنچا تو ایک عجب سی دنیا آشکار ہونے لگی......محبت لوگوں سے ہی نہیں شہروں سے بھی ہوجاتی ہے۔گلی کوچے، درودیوار بھی دل میں اتر جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی ایسا ہی شہر تھا۔خود بین وخود آراء۔اس شہر کی کہانی سب سے پہلے میں نے اپنے سسر سردار منظور احمد لغاری سے سنی جو یہاں دوسال ڈپٹی کمشنر رہے۔دوسرے راوی کا نام احمد غزالی تھا۔ان سے بڑا خوش زبان اور کون ہوگا۔احمد غزالی بولتے نہیں جادو کرتے ہیں۔انہوں نے ان گلی کوچوں کو اوراقِ مصور بنادیا۔ بہاولپور کے بعد اگلی منزل رحیم یارخان اور پھر سندھ کی عظیم دھرتی۔میرے اشکوں کا مداوا، نہ بدخشاں نہ حجاز۔وہ سفینہ جو داتا کی نگری سے چلا شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سرزمین تک پہنچنے میں بہت دیر نہیں لگائے گا۔

6.16 ۔چنیوٹ

دریائے چناب محبت کا استعارہ ہے۔

یہی کیفیت دریائے چناب کے کنارے آباد چنیوٹ نامی شہر کی بھی ہے۔ یہاں کے چنیوٹی شیخ اپنی مثال آپ ہیں۔کمانے میں بھی اور بانٹنے میں بھی۔ پرندے کیلئے اڑنا اور مچھلی کیلئے تیرنا شاید مشکل ہولیکن چنیوٹی شیخ کیلئے کاروبار کرنا مشکل نہیں۔کلکتہ، بمبئی، دہلی، لاہور، کراچی۔انیسویں اور بیسویں صدی میں وہ برصغیر کے بڑے بڑے شہروں تک جا پہنچے۔کسی نے کہا کاروبار کے اصول سیکھنے کے لیے ہارورڈ بزنس سکول جانے کی ضرورت نہیں چند روز چنیوٹ میں گذارنا ہی کافی ہے۔اس وقت لاہور، فیصل آباد اور کراچی میں وہ کاروبار کے عروج پہ ہیں۔چنیوٹ صرف کاروباری لوگوں کا شہر نہیں یہاں علم وادب کے رسیا اور فقیر بھی رہتے ہیں۔پندرھویں صدی کا مشہور شخص سعداللہ خان جو ہندوستان کا وزیراعظم بنا یہیں کا رہائشی تھی۔مغلیہ عہد میں لاہور کا گورنر نواب وزیر خان بھی چنیوٹ کی مٹی سے اٹھا۔جعفر قاسمی، خضر تمیمی، نذیر مجیدی اور یادِ خدا کے ایڈیٹر ڈاکٹر عزیز علی۔''شہر لب دریا'' کے نام سے میری پہلی کتاب جسے حکومتِ پنجاب نے خوشحال خان خٹک ادبی انعام سے نوازا اسی شہر کے بارے میں ہے۔میں اس شہر میں پہلی بار 1990 میں آیا۔بطور اسسٹنٹ کمشنر۔اس کے بعد میں اس شہر سے رشتہ نہ توڑ سکا۔میں یہاں جس گھر میں رہتا تھا وہاں برگد کا ایک بہت قدیم درخت تھا۔اس درخت کے نیچے بیٹھ کے مجھے بہت کچھ ملا۔

برگد کی چھاؤں بڑی سخی ہوتی ہے۔اس چھاؤں میں مولانا جعفر قاسمی سے ہونے والی طویل ملاقاتیں دل پر مرتسم ہیں۔اسی درخت کے نیچے موجودہ وزیراعظم نواز شریف سے پہلی ملاقات ہوئی۔

اخوت کا کارواں جب چنیوٹ پہنچا تو یہاں کی تین سو سالہ پرانی بادشاہی مسجد میں دفتر کھولنے کا موقعہ ملا۔ یہ رحمتِ خداوندی کا ایک اور مظہر تھا۔اب تک اس شہر میں دس ہزار افراد کو قرضے مل چکے ہیں۔ان میں اکثر لوگ فرنیچر کا کاروبار کرتے ہیں۔ چنیوٹ ہنر وفن کا مرکز بھی ہے۔ جسے اس شہر کے کاریگروں کی صناعی دیکھنا ہو اسے یہاں کا عمر حیات محل یا چنیوٹ کے مشہور عالم سات تعزیئے دیکھنے چاہئیں۔ معجزۂ فن اور خونِ جگر کی قدیم روایت پوری شان کے ساتھ جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اطہر طاہر ان دنوں یہاں ڈپٹی کمشنر تھے۔ان کی سرکردگی میں اہلِ شہر کے ساتھ مل کے بہت سے کام کرنے کا موقعہ ملا۔ان میں عمر حیات محل لائبریری کا قیام سرفہرست ہے۔ایک خوبصورت حویلی میں بنی یہ لائبریری کسی شاہکار سے کم نہیں۔ لیکن جو شے کبھی نہ بھولی وہ ان چند گھرانوں کی مدد تھی جو سود ادا کرتے کرتے بربادی کے قریب جا پہنچے تھے۔شاید انہی کی دعا ہمیں اخوت کی طرف لے آئی۔عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا بھی کئی زمانے ہیں۔ چنیوٹ کی بیوہ' لاہور کے نابینا حافظ صاحب' گڑھی شاہو کے معذور بچے۔اخوت تو بس ایسی ہی کسی نیکی کا صلہ ہے یا پھر اس گریۂ نیم شب کا حاصل جسے شانِ کریمی نے موتی سمجھ کر چن لیا۔

6.17۔ حیات لے کے چلو' کائنات لے کے چلو

ابتدائی شہر ختم ہوئے۔

مجھے وہ لوگ یاد آنے لگے جو اخوت کے بہترین رفیق ہیں۔جن کا ایثار اس خواب کو تعبیر بخشتا رہا۔ ڈاکٹر کامران شمس' ڈاکٹر اظہار الحق' ہمایوں احسان' سلیم رانجھا' خاور رفیق اور سید حسین حیدر۔

ڈاکٹر کامران شمس' روزِ اول سے اخوت کے ساتھی۔ بہترین انتظامی صلاحیتوں کے حامل۔دیانت اور شرافت کا پیکر۔ بنک کی نوکری اس لیے چھوڑ دی کہ سود اچھا نہیں لگا۔ پنجاب ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سہرا انہی کے سر پر ہے۔فاؤنٹین ہاؤس میں جس طرح انہوں نے کام کیا اس کا

صلہ صرف اللہ کے پاس ہے۔ ڈاکٹر اظہارالحق تو ایک صوفی ہے۔ اس کا قرب ایک عجب آسودگی بخشتا ہے۔ تحمل، برداشت اور قربانی کسی ایک شخص میں دیکھنی ہو تو وہ ڈاکٹر اظہار ہے۔ اس کا دامن، حسد اور رشک جیسے ہر داغ سے پاک ہے۔ ہمایوں احسان ہم سب کی محبتوں کا محور ہیں۔ فہم و فراست میں یکتا۔ انکسار اور ایثار کا سرچشمہ۔ کم گو لیکن راست گو۔ علم اور انکسار کا پیکر۔ خوش خلق، نرم خو۔ یہ ساری خوبیاں انہیں دنیاداری سے بہت دور لے گئیں۔ سلیم رانجھا انتہائی خوبصورت اور دردمند دل کا مالک ہے۔ سراپا محبت، سراپا اخوت۔ دین سے پیار، پاکستان سے پیار اور سود سے نفرت۔ یہ سب اس کی گھٹی میں ہیں۔ اخوت کا پیغام پھیلانے کے لئے وہ ہر دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے تیار ہے۔ ایک عام آدمی سے لے کر وزیرِاعظم تک۔ ملک سے لے کر بیرونِ ملک۔ اخوت کے معاملہ میں اس سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ خاور رفیق، خوش جمال، خوش مزاج۔ ذہانت اور کاروباری سمجھ بوجھ میں سب سے آگے۔ دوراندیش اور معاملہ فہم۔ ان کی متوازن آراء ہمیشہ اخوت کے کام آئیں۔ سید حسین حیدر۔ حسنِ طلب اور اخلاص کا پیکر۔ نوجوانوں کیلئے بہترین رول ماڈل اور قابلِ اعتماد رفیق۔ مشکل سے مشکل کام اس کے سامنے آسان ہو جاتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہے جو کسی بھی ادارے کو عروج پہ لے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ اخوت کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

زاہد کھوکھر، فضل یزدانی، انور صادق، ڈاکٹر عبدالرزاق ہر لحہ ہمارے ہم قدم رہے۔ میجر امان اللہ، راؤ سعادت، معظم بن ظہور کی خدمات کسی سے کم نہیں۔ ہمہ وقت شوق اور جستجو۔ اور پھر دینے والے جن کا اپنا مقام ہے۔ جس نے ایک روپیہ دیا وہ بھی اور جس نے ایک کروڑ دیا وہ بھی۔ ان کا نام لے کے ان کے صلہ میں کمی کیوں لائی جائے۔ اخوت نے جب حکومت کے ساتھ مل کے کام کیا تو بے حد مشکلات سامنے تھیں۔ کچھ لوگوں کی بدولت ہمارے راستے آسان ہوتے چلے گئے۔ طارق باجوہ، ڈاکٹر شجاعت علی، فرحان عزیز خواجہ، ڈاکٹر نائلہ ظفر اور غلام نبی۔ جب اللہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو لوگوں کے دل میں اس کی محبت کے بیج اگنے لگتے ہیں۔

میاں عامر محمود اور جنرل (ر) خالد مقبول۔ اخوت کو ہمیشہ ان کی سرپرستی، مدد اور اعانت حاصل رہی۔ انہوں نے اس وقت ہاتھ تھاما جب اخوت کو بہت کم لوگ جانتے تھے۔ عمران خان فاؤنڈیشن اور میر خلیل الرحمان فاؤنڈیشن کی جانب سے نوشہرہ کے سیلاب زدگان کے لئے دو کروڑ کی خطیر رقم پیش کی گئی۔

یہ عطیہ اخوت کی غیر سیاسی حیثیت پہ مہر تصدیق ہے۔عمران خان صاحب نے اخوت کی خدمات کو ہمیشہ سراہا۔شاید اس لیے کہ وہ خود ان منزلوں سے گذرے ہیں۔

عمران خان کے رفقائے کار نے بھی اخوت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ یہی ہمارا اعزاز ہے کہ لوگ ہمارے کام کو صرف خدمت سمجھتے ہیں۔ ہماری دعا بھی یہی ہے کہ اخوت تعصب کے خارزار سے دور رہے۔

خدمت کا ہر کام اللہ کی رضا کیلئے ہونا چاہیے۔ کاش ہمارا کام ایسا ہی ہو۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے عہد میں اخوت پر گفتگو کے لئے ہمیں دو بار وزیرِ اعظم سیکرٹیریٹ میں بھی دعوت دی گئی۔ جماعتِ اسلامی کے ادارہ الخدمت نے ہم سے کئی بار سیکھنے کی کوشش کی۔نعمت اللہ خان اور احسان اللہ وقاص نے اخوت کو ہمیشہ اپنے دل کے قریب رکھا۔تعاون بھی کیا اور سر پرستی بھی۔ سائرہ افضل تارڑ' خواجہ سعد رفیق' ایاز صادق' پرویز ملک اور ان کی بیگم شائستہ پرویز یہ سب تو ذاتی حیثیت میں اخوت کے رفیق ہیں...... چوہدری نثار علی خان اور خواجہ محمد آصف مدد کرتے ہیں لیکن گم نام رہنے کی شرط پر۔ ہماری دعا ہے کہ دیگر سیاسی جماعتیں بھی اس ماڈل کو اپنائیں تا کہ مؤاخات کا یہ تصور عام ہو اور غربت کے خاتمہ کی یہ حکمتِ عملی ہر سیاسی جماعت کے منشور کا حصہ بن سکے۔ یہ سارا کام نہ ذاتی تشہیر ہے' نہ کوئی غرور' نہ زعم۔ یہ سب تو عجز و انکسار کی داستان ہے۔ یہ سب اللہ کی دین ہے۔ وہ جو حزن و ملال سے نجات دیتا ہے۔ وہ جو ذروں کو آفتاب کی تابانی عطا کرتا ہے۔ وہ جو پتھر کو موم کرتا ہے۔ پرویز مشرف اور ان کی والدہ کو اخوت کا ڈونر بننے کا اعزاز ملا۔ سابق چیف جسٹس' لاہور ہائی کورٹ' خواجہ محمد شریف خود ہمارے دفتر تشریف لائے' عطیہ پیش کیا۔

سابق صدر جسٹس (ر) رفیق تارڑ' جسٹس محبوب احمد' جسٹس اعجاز نثار' جسٹس خلیل الرحمان' جو اخوت کے شریعہ ایڈوائزر بھی ہیں' جسٹس وجیہہ الدین' جسٹس ناصرہ جاوید اقبال' جسٹس عائشہ ملک۔ لوحِ دل پہ کس کس کی مہر محبت ثبت نہ ہوئی۔ سید بابر علی' رزاق داؤد' میاں محمد منشاء اور ایس ایم منیر۔ ایک بار گورنر ہاؤس' لاہور کی ایک تقریب میں گورنر خالد مقبول نے جناب شوکت عزیز سے اخوت کا تعارف کروایا۔ وہ اس وقت وزیرِ اعظم تھے۔ ''کیا قرضے' بلا سود بھی ہوتے ہیں۔'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''اگر یہ بلا سود ہیں تو آپ اس کام میں خود کیا کماتے ہیں؟'' ابھی میں نے پہلے سوال کا جواب ہی نہیں دیا تھا کہ انہوں نے دوسرا سوال کر دیا۔ مجھے لگا وہ ابھی تک کسی غیر ملکی بنک کے ملازم ہیں جنہیں یہ بھی علم نہیں کہ قرض تو ہوتا ہی وہ ہے جس پہ سود نہ لیا

جائے۔جس پہ سود لیا جائے وہ قرض نہیں کاروبار ہوتا ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جسے سمجھنے میں شہباز شریف نے ایک لمحہ نہ لگایا اور پنجاب میں قرضِ حسن کا سب سے بڑا فنڈ بنا دیا۔شاید یہ اعزاز اور توفیق کی بات ہے۔دو ارب معمولی رقم نہیں۔لیکن ابھی اسے اور بڑھنا ہے۔مجھے یقین ہے یہ کاوش ایک روز بلاسود بنکاری یا ''صدقات بنک'' کی بنیاد بنے گی......زندگی ہتھیار نہیں ڈالتی۔زندگی ناکام نہیں ہوتی۔زندگی ہماری طلب اور آرزو میں زندہ رہتی ہے۔ہمارا کام تو خواب دیکھنا ہے۔تعبیر دینا کسی اور کا اختیار ہے۔

سابق وفاقی سیکرٹری ظفر محمود میرے مہربان اور بہترین خیر خواہ۔میری ہر کامیابی کو وہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔اخوت کی وضاحت انہوں نے ایک بار اس شعر کی صورت میں کی:

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں حالی نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ

رورل سپورٹ پروگرام کے بانی شعیب سلطان تو میرے استاد ہیں۔میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔عملی حقائق کا ادراک، صلحِ کل اور مستقل مزاجی۔ایک کامیاب سماجی ورکر کو اَنا کی گرفت سے آزاد ہونا پڑتا ہے۔کامیابی کیلئے بڑے دماغ سے زیادہ بڑے دل کی ضرورت ہوتی ہے۔جو آدمی ہمیشہ جیتتا ہے اس کے دوستوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے۔نیکی اچھی چیز ہے لیکن اصل نیکی یہ ہے کہ لوگوں کو نیکی کرنا سکھا دیا جائے۔یہ باتیں میں نے انہی سے سیکھیں۔جسٹس عامر رضا کی رفاقت کسی بڑے انعام سے کم نہیں۔ان جیسے جرأت مند اور حق گو ہمارے عہد میں بہت کم ہیں۔سپیشل بچوں کیلئے ان کی خدمات ہم سب کیلئے مشعل راہ ہیں۔نورالحسن ہمارا دوست بھی ہے، بھائی بھی۔اخوت کی تقریبات میں جب وہ کمپیئرنگ کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اس فلسفہ میں ڈوب گیا ہو۔ابوبکر صدیق نے ہمیشہ بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔خوش مزاج، خوش گفتار اور صلح جو۔مجیب الرحمٰن شامی سے ذاتی تعلق اور احترام کا رشتہ ایک مدت سے قائم ہے۔اخوت کو ایک معتبر ادارہ بنانے میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔لاکھوں مستفید گھرانے، ہزاروں رضا کار، سیکڑوں کارکن، بیسیوں ڈونرز اور پھر انتظامی کمیٹیاں، سٹیئرنگ کمیٹیاں اور بورڈ آف ڈائریکٹرز۔دانشور، صحافی، کالم نگار،

استادؔ طالبِ علم۔شعر گھسا پٹا ہے لیکن مکمل تصویر ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اخوت کے ملازمین کا شکریہ کیسے ادا ہوسکتا ہے۔ان سب کا مزاج اور کردار اخوت کے فلسفہ میں ڈھل چکا ہے۔آفتاب احمد' ریحان خاور' شاہد صفدر' ثقلین رضا' مہتاب علی' ممتاز احمد' منیر احمد' وسیم اصغر' خالد خان' فاروق احمد' عدیل خالد' سعید احمد' خواجہ زاہد' حافظ اظہر اسلام اور پھر شہزاد' سجاد اور انور مسیح۔یہ سب سرِ فہرست ہیں۔یہ لوگ ملازم نہیں اخوت کے ساتھی اور رفیق ہیں۔میرے نزدیک سب سے اہم لوگ۔انہوں نے اپنی شب و روز محنت سے اس تصور کو ایک حقیقت کی شکل دے دی۔اولین دنوں میں میرے ساتھ ریحانہ نامی ایک خاتون فیلڈ ورک کرتی تھیں۔نجانے ہماری کتنی شامیں رسول پارک کے گرد آلود گلی کوچوں میں گذر گئیں۔موتی چنتے' موتی بکھیرتے۔ریحانہ کے بعد تبسم پھر شازیہ اور آہستہ آہستہ دیگر لوگ۔اب ان ساتھیوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔اخوت کی تسبیح میں پروئے ہوئے یہ انمول موتی۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اخوت مائیکرو فنانس میں اجتہاد کا نام ہے۔

ایک نئی رسم' ایک نئی وضع' ایک انوکھا چلن۔خاک ہو جانے کی آرزو۔مر مٹنے کا سودا۔ضد' دیوانگی' جنون یا پاگل پن۔اخوت صحرا نوردی اور آشفتہ سری کا نام ہے۔یہ استثناء ہے۔یہ استقامت ہے۔یہ استقلال ہے۔وہ جو کسی نے کہا کہ اگر لہو ہے تو پھر آنکھ سے کیوں نہیں ٹپکتا۔اگر تیشہ ہے تو سر کیوں نہیں پھوڑتا۔اگر سودا ہے تو سولی پہ کیوں نہیں چڑھتا۔کوئی تو ہو جو کہے کہ میں آزمودہ راستوں سے ہٹ کے چلوں گا۔ٹھوکریں کھاؤں گا۔سر پھوڑوں گا۔زندگی کے اجڑتے ہوئے گلستاں میں رنگ بھروں گا۔سرِ بازارمی رقصم' سرِ بازارمی رقصم۔تندو تیز ہوا میں مواخات کا چراغ لے کے کھڑے یہ لوگ۔اخوت کی تسبیح میں پروئے ہوئے یہ انمول موتی :

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

6.18۔ بڑا ہے درد کا رشتہ

سفر ختم ہوا۔لیکن کہانی باقی ہے۔کچھ مسافر۔کچھ مسافر نواز۔ان کا تذکرہ بھی سفر کی روئیداد کا حصہ ہے۔ان

میں سے کچھ کا ذکر ہو چکا کچھ کا رہتا ہے۔ سید ابو احمد عاکف' پروفیسر اطہر عظیم' عمار ترین' اخلاق الرحمان' قاضی محمد اشرف' چوہدری محمد علی' محمد عرفان بٹ' عامر علی خان' سعود محبوب' عائشہ آفندی' شیخ علاءُ الدین' محترمہ شاہیمہ رحمان' شیراز محمود شیرازی' بلال طارق' نعیم شیخ' ایس ایم اشفاق' خلیل میاں' حاجی محمد نواز' حمیرا شیخ' فیاض باقر' حامد زمان' شیخ قمرالحق۔ مولانا طارق جمیل پاکستان کی ایک محبوب دینی شخصیت۔ ان کی ذات دین سے وابستگی کی علامت ہے۔ اخوت کے حوالے سے ہم تین باران کے مہمان بنے۔ تلمبہ میں اخوت کے آغاز پہ مولانا کا خطاب ایک یادگار موقعہ تھا۔ تقریر کے اختتام پر اشکبار آنکھوں کے ساتھ انہوں نے دعا فرمائی۔ ایسی ہی ایک دعا انہوں نے لاہور کے الحمرا ہال میں بھی کی۔ اخوت کی سالانہ تقریب تھی اور گفتگو کا عنوان تھا ''دورِ حاضر میں مُواخات''۔ یہ تقریر کتابی صورت میں چھپ کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک دعا انہوں نے بیت اللہ میں بھی کی......اے خدا اخوت کو عام کر دے۔ اے خدا سود سے نجات دے دے۔ مولانا کی بدولت ارادوں کی شکستگی عزمِ نو میں ڈھلنے لگتی ہے۔

جامعہ اشرفیہ کے مہتمم مولانا فضل الرحیم ایک انتہائی قابلِ احترام اور بزرگ شخصیت۔ سراپا محبت اور شفقت۔ ان کی قربت دیدہ و دل کو منور رکھتی ہے۔ انہوں نے کئی بار جامعہ اشرفیہ بلایا اور اخوت کے لئے دعا گو ہوئے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر اور سید سرفراز شاہ۔ صدق وصفا اور علم کے پیکر۔ صوفی' درویش اور مردانِ حق۔ پروفیسر صاحب جیسے روشن ضمیر اور باخبر کتنے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اخوت کے پھلنے پھولنے کا سماں قریب ہے۔ صدقات بنک کی بشارت بھی وہی دیتے ہیں۔ تیری آواز مکے اور مدینے۔

بہت سے طالب علم اخوت کے ساتھ بطور رضا کار شامل ہوئے۔ جواں سال' جواں فکر' جواں عزم۔ اخوت نے ان بچوں کے سینوں میں ایسی شمعیں روشن کیں جو کبھی نہیں بجھیں گی۔ اخوت نے انہیں ایک سوچ اور احساس کے طور پر متاثر کیا۔ ان میں سے کئی ایک نے غربت کو اپنی تمام تر بدصورتی کے ساتھ پہلی بار دیکھا۔ فاطمہ رشید اور اس کے ساتھیوں نے جس طرح اخوت میں ڈوب کے کام کیا کہ اس کی بہت کم مثال ملتی ہے۔

مسافر اور مسافر نواز۔ ہمیں یقین ہے یہ بڑھتے رہیں گے۔ روشنی پھیلتی رہے گی۔ اخوت کا پیغام ہی ایسا ہے۔

6.19۔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

کیا ہم سب لوگوں کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔

بہت سے نام بھول گئے۔ بہت سے لوگ خود منع کر گئے۔فرخ کا بھی یہی کہنا ہے کہ ذکر نہ ہو تو بہتر ہے۔لیکن اس کا ذکر کیے بغیر یہ سرگزشت ادھوری رہے گی۔اخوت کیلئے جتنے سجدے اس نے کیے وہ کسی اور کے مقدر میں نہیں۔میں نے اس کے حصے کا بہت سا وقت اس دیوانگی کی نذر کر دیا۔پھر بھی اسے کوئی شکایت' کوئی گلہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں خود سے انصاف نہیں کرتا۔صحت کا خیال نہیں رکھتا۔گھر دیر سے آتا ہوں۔وہی چھوٹی چھوٹی شکایتیں جو زندگی کا حسن ہیں۔کیا کھانا ہے۔کیا پینا ہے۔ڈاکٹر کے پاس کب جانا ہے۔دوا کتنی بار لینی ہے۔فرخ کے سوا ان باتوں کی کسے خبر ہے۔مجھے تو اپنی دواؤں کا نام بھی یاد نہیں۔ہر سال دو سال بعد چند دن پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں گذارنا پڑتے ہیں۔اب تک پانچ عدد سٹنٹ پڑ چکے ہیں۔بیماری کے لمحے نگاہوں کے سامنے آتے ہیں تو اس کی بے بسی یاد آتی ہے۔دل کے حملہ کے بعد یوں لگتا ہے جیسے منوں بوجھ سینے پہ آ پڑا ہو۔ٹوٹتی ہوئی رگیں اور درد کی شدت۔ایک شدید ٹیس سی اٹھتی ہے۔ایمرجنسی' بھاگ دوڑ' ہیپارین' اینجیوگرافی۔موت اور زندگی کی گہری کشمکش۔ایک بار میں آئی سی یو میں داخل تھا۔ایک عورت اپنے بچوں کے ساتھ ساری رات ہسپتال کے لان میں بیٹھی رہی.....صبح ہونے پر وہ فرخ کے پاس آئی اور کہنے لگی ......''اصل طاقت دوا میں نہیں دعا میں ہے۔'' مجھے یقین ہے اس رات اسی عورت کی دعا قبول ہوئی تھی۔مجھے تو اس جانکنی کی عادت ہو چلی ہے لیکن فرخ کے لئے یہ لمحے انتہائی صبر آزما ہوتے ہیں۔وہ بھی ایک کڑا سا دن تھا جب میں نے اس سے کہا ''میں سول سروس سے استعفیٰ دینا چاہتا ہوں''۔اس نے جواب میں کوئی ایسی بات نہ کی جو مجھے کمزور کرتی۔لوگوں کیلئے یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا لیکن اس کیلئے یہ ایک عام سی بات ٹھہری۔اس کا کہنا ہے کہ ذکر نہ ہو تو بہتر ہے لیکن اس کے ذکر کے بغیر یہ کہانی مکمل نہ ہو گی۔اخوت کی اس جدوجہد میں اس کا بہت حصہ ہے۔اس کا شمار اخوت کے گمنام سپاہیوں میں ہوتا ہے۔سراپا ایثار' سراپا توجہ' سراپا محبت۔

6.20۔ یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

جہاز میں گہما گہمی بڑھنے لگی۔میں نے گھڑی پہ نظر دوڑائی تو اندازہ ہوا کہ منزل قریب ہے۔اٹھارہ گھنٹوں کا طویل سفر۔راہ میں پھیلے ہوئے کئی سمندر اور صحرا۔ان میں جھلملاتے ہوئے یادوں کے دیئے۔اخوت کی پرانی منزلیں:

مہکتے میٹھے' مستانے' زمانے
تری نظروں کے نذرانے زمانے

شروع میں بہت کم لوگوں نے اعتبار کیا۔شاید شروع میں کم ہی ہوتے ہیں۔ پھر تو جل تھل ہوگیا۔اس سفر کا حاصل دل پر نقش ہے۔ جو زیاں ہے اسے ہم دیکھتے ہی نہیں۔عشق کے گوشوارے میں دو اور دو چار نہیں ہوتے۔زیادہ بھی ہوسکتے ہیں اور کم بھی۔اس کا انحصار نیت پر ہے۔نیت اچھی ہو تو ایک آدھ اضافی صفر بھی لگ جاتا ہے۔اخوت کا اگلا سفر نجانے کب ہوگا۔ہم ہوں گے بھی یا نہیں۔ پھر سے منیر کا وہ دعائیہ شعر:

بیٹھ جائیں سایہء دامانِ احمد میں منیر
اور پھر سوچیں وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

پی آئی اے' میں سفر کا آغاز دعا سے ہوا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ سفر کا اختتام بھی دعا پہ ہونا چاہیے۔مسافروں کی تو وہ ضرور سنتا ہے۔ مجھے اس وقت کیا مانگنا چاہیے۔دنیا اور آخرت کی بھلائی یا پھر وہی سورۂ فاتحہ جو ہر مسلمان کی پسندیدہ دعا ہے۔جو ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ مجھے یاد آیا ایک مشہور دعا سیدالشہداء حضرت امام حسینؓ سے بھی منسوب ہے۔ بہت جامع اور پراثر۔ یہ دعا بھی ایک سفر کا آغاز تھی۔وہ کربلا کا سفر تھا یا کوئی اور۔امام الشہداء نے سر جھکایا اور خدا سے یوں گویا ہوئے......''اے خدائے ذوالجلال!اے میرے سچے رب!

سب سے پہلے تو میں تیرا شکر ادا کرنا چاہوں گا' گو میں جانتا ہوں کہ تیرا شکر ادا نہیں ہوسکتا......میرے ایمان کی سچائی' میری عبادت کا اخلاص' میرے ضمیر کی گہرائی' میری نگاہوں کی روشنی' میری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو' میرے ہونٹوں سے نکلے ہوئے لفظ' میرے دل کی تمام لرزشیں' میرا جسم' میرا خون' میرا چہرہ' میرے اعصاب' میری ہڈیاں' میری رَگ و پے' میری نیند' میری بیداری' میری حرکت' میرا سکون' میرا رکوع' میرے سجدے ...... میں ان سب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیرا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ میں تیری کسی ایک بھی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہوں تو نہیں کرسکوں گا۔اے میرے پروردگار تو نے مجھے احکام دیئے اور میں نے ان کی تعمیل میں کوتاہی کی۔ تو نے مجھے راستہ دکھایا لیکن میں اس پہ چل نہ سکا۔تو نے مجھے ہدایت دی لیکن میں اس پہ پورا نہ اترا۔ ہر طرف سے مایوس' آج میں تیری بارگاہ میں پیش ہوگیا ہوں! آج' خود میرے بدن کے اعضا گواہی دینے والے

ہیں۔ یہ آنکھیں' یہ ہاتھ' یہ زبان۔ تو نے اگر مجھے عذاب دیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے ہوگا اور اگر تو نے مجھے معاف کر دیا تو محض تیرے کرم' تیرے احسان اور تیری شفقت کا کرشمہ ہوگا۔

یا اللہ تو پریشان حال کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ دردمند کی فریاد رسی کرتا ہے' بیمار کو تندرست کرتا ہے' محتاج کو غنی بناتا ہے۔ یہ تو ہی ہے جو ٹوٹے ہوؤں کو جوڑتا ہے' چھوٹوں پر رحم کرتا ہے' بڑوں کی مدد کرتا ہے۔ تیرے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔ تو بڑی بلندیوں کا مالک' تو بڑی شان والا ہے۔ اے پابند کو آزاد کرنے والے' اے بھوکے کو روزی دینے والے' اے پناہ مانگنے والے کو امان دینے والے' اے وہ جس کا کوئی شریک ہے' نہ معاون کار۔

اے پروردگار! آج میں تجھ سے بہت کچھ مانگتا ہوں۔ اے پروردگار! میرے مزاج میں بے نیازی عطا کر۔ میرے دل کو یقین سے مالا مال کر۔ میرے عمل کو اخلاص کی آراستگی بخش۔ میری آنکھ کو روشنی دے۔ میری نگاہ کو تابِ سحر عطا فرما۔ مجھ پر زیادتی کرنے والے کے مقابل' میری مدد فرما۔ میرے دشمن کو میرا دوست بنا اور میرے دوستوں کو خوشیوں سے نواز۔ اے میرے اللہ! میری پردہ داری رکھ۔ میری خطا معاف کر دے۔ اے اللہ! میں جس شے سے ڈرتا ہوں' اس سے امن میں رکھ۔ جس سے بچنا چاہتا ہوں' اس سے بچائے رکھ۔ میرے ضمیر اور میرے دین کی رکھوالی کر۔ میرے سفر کو محفوظ بنا۔ میرے اہل وعیال کی حفاظت کر۔ میرے مال کی نگہبانی کر۔ جو کچھ تو نے مجھے عطا کیا اس میں برکتیں دے۔ مجھے اپنے حضور عاجز رکھ اور لوگوں کی نگاہوں میں عزت دے۔ مجھے عمل کی آزمائش میں نہ ڈال۔ جو نعمتیں مجھے دی ہیں وہ واپس نہ لے۔ یا الٰہی مجھے غیر کے سپرد نہ کر۔ مجھے غضب کی نگاہ سے نہ دیکھ۔ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ تو اس وقت میری پناہ بن' جب راستے مجھے گزرنے نہ دیں اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ ہو جائے۔ تو اس وقت میرا سایہ بن جب کڑی دھوپ ہو اور پرندے گھونسلوں میں دبک جائیں۔

یا اللہ! مجھ سے کوئی ایسا کام لے لے' جو مجھے تیرے قریب کر دے۔ اے میرے پروردگار! مجھے محمد مصطفیٰ ﷺ کی غلامی عطا فرما۔ میری نگاہ کو بینا کر۔ مجھے حریمِ قرب سے آشنا کر۔ مجھے صدقِ بندگی سے نواز۔ مجھے حقیقتوں کا شناور بنا۔ میرے ساتھ محبت کا سلوک کر۔ مجھے میری تدبیر سے بے نیاز کر دے۔ میرے اختیار کے بدلے اپنا اختیار وارد فرما۔ میری التجا کو قبول کر۔ میری التجا کو قبول کر۔ میری التجا کو قبول کر......''
سید الشہداء کی اس دعا نے امید کے بہت سے دیئے روشن کر دیئے۔ زندگی کی کربلا میں اس سے اچھی دعا اور

کیا ہوگی۔ مجھے لگا پوری کائنات میری ہمنوا ہے ...... ہماری التجا قبول کر، ہماری التجا قبول کر، اے ربِ ذوالجلال ہماری التجا قبول کر۔

لاہور کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جہاز کے قدم زمین کو چھو رہے تھے۔اخوت کے سفر کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے۔اگلا سفر نجانے کب ہوگا؟

تصویریں

حوالہ جات:

1۔ آوازِ دوست، مختار مسعود، فیروز سنز لاہور

2۔ رحیق المختوم، سیف الرحمان مبارکپوری، دارالسلام لاہور

3۔ سید الشہداء کی دعائیں، سید وجیہہ السیما عرفانی

4۔ گوتم کے دیس میں، امجد ثاقب

5۔ ہوئے تم دوست جس کے، حقی حق، شفیق پبلی کیشنز لاہور

6۔ مقالاتِ جاوید، جاوید اقبال، اقبال اکادمی پاکستان

7۔ Leaders by Richard Nixon, Warner Books, Inc. USA

8۔ Giving by Bill Clinton, Random House, Inc. New York

9۔ Exploring New Horizons in Microfinance (Akhuwat)

10۔ www.wikipedia.org

11۔ Suspended Somewhere Between by Akbar S. Ahmed

12۔ The Autobiography of Malcolm X, Grove Press, Inc. USA

13۔ Alphonse de LaMartaine in "Historie de la Turquie", Paris, 1854 (''ہم سخن فہم ہیں'')

اشعار:

کتاب میں دیئے گئے اشعار مندرجہ ذیل شعراء کرام کے ہیں:

میر تقی میر، غالب، اقبال، انشاء اللہ خان انشاء، الطاف حسین حالی، مرزا ہادی رسوا، فیض احمد فیض، منیر نیازی، حفیظ جالندھری، مصطفےٰ زیدی، ناصر کاظمی، احمد فراز، احسان دانش، عابد علی عابد، امجد اسلام امجد، شکیب جلالی، ظفر علی خان، شعیب بن عزیز، جاں نثار اختر، شاد عظیم آبادی، غلام محمد قاصر، افتخار نسیم، میاں محمد بخش، حضرت خواجہ غلام فریدؒ اور کچھ نامعلوم۔

ڈاکٹر محمد امجد ثاقب پنجاب کے ایک دور افتادہ شہر کمالیہ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ 1985 میں سول سروس کے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ کیلئے منتخب ہوئے۔ امریکہ سے پبلک ایڈمنسٹریشن اور انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ میں ماسٹرز کی ڈگری۔ اہم سرکاری عہدے۔ ملازمت سے استعفیٰ۔ ایشین ڈویلپمنٹ بنک' انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن' کینیڈین انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ ایجنسی' یو ایس ایڈ' ڈی ایف آئی ڈی' یو این ڈی پی اور ورلڈ بنک جیسے بین الاقوامی اداروں کو مشاورت۔ پنجاب ایجوکیشنل انڈومنٹ فنڈ' پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن' ہیلتھ کیئر کمیشن' ویلفیئر ٹرسٹ فار ڈس ایبلڈ' ہلال احمر اور فاؤنٹین ہاؤس جیسے اداروں سے رضا کارانہ وابستگی۔ وہ انٹرنیشنل اسلامک مائیکروفنانس نیٹ ورک کے چیئرمین بھی ہیں۔ لیکن ان کا اصل اعزاز اخوت کا قیام ہے۔ دنیا میں قرضِ حسن کا سب سے بڑا پروگرام۔ اخوت نے پاکستان کی ایک خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔ ایثار' قربانی اور بھائی چارے کی یہ تصویر' جسے ''Muakhat Paradigm'' کا نام دیا گیا' ایک نئے افق کی نشاندہی کرتی ہے۔ سماجی ترقی کیلئے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدرِ پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز پیش کیا گیا۔ وہ مندرجہ ذیل کتب کے مصنف بھی ہیں: شہرِ لبِ دریا (خوشحال خان خٹک انعام یافتہ)' گوتم کے دیس میں (نیپال کا سفر نامہ)' ایک یادگار مشاعرہ' اخوت اور دشتِ ظلمت' غربت اور مائیکروکریڈٹ اور لاہور یونیورسٹی فار مینجمنٹ سائنسز کیلئے مرتب کی گئی ایک کتاب:

Devolution and Governance-Reforms in Pakistan (Oxford University Press)

(www.akhuwat.org.pk, amjadsaqib1@gmail.com)

امامِ امجد ثاقب کے پیچھے

اللہ تعالیٰ نے بنگلہ دیش کے نصیب میں ڈاکٹر پروفیسر محمد یونس کو لکھا تو پاکستان کو ڈاکٹر امجد ثاقب سے نواز دیا۔ اول الذکر نے 1976ء میں گرامین بنک (گاؤں کا بنک) کی بنیاد ڈالی تو ثانی الذکر نے 2001ء میں ''اخوت'' کی پہلی اینٹ رکھی۔ گرامین بنک اپنے وطن میں خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے دیہاتیوں کو چھوٹے قرضے فراہم کر کے، ان کی زندگی بدلنے کے لئے کوشاں ہے، تو ''اخوت'' اپنے ہم وطنوں کی غربت دور کرنے کی سعی کر رہی ہے۔ دنیا بھر میں گرامین اور اس کے بانی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ان کو متعدد عالمی اعزازات پیش کئے جا چکے ہیں۔ 2006ء میں انہیں نوبل امن پرائز کا مستحق گردانا گیا کہ غربت کے خاتمے کی کوشش کسی بھی معاشرے میں امن قائم کرنے کی شرط اول ہے۔ ''اخوت'' اور اس کے بانی عالمی نقشے میں ابھر کر اب سامنے آ رہے ہیں۔ گرامین کا سفر 37 سال پر محیط ہے جبکہ اخوت نے ابھی بارہویں سال میں قدم رکھا ہے۔

گرامین، اخوت اور ان کے بانی ایک ہی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ دونوں کا ہدف غربت کا خاتمہ ہے لیکن بظاہر ایک ہونے کے باوجود دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ دونوں کی سوچ الگ اور دونوں کا راستہ الگ ہے۔ گرامین کا خمیر مغربی معیشت کے مروجہ اصولوں سے اٹھا ہے۔ ''اخوت'' کا شجرۂ نسب پندرہ سو سال پہلے آباد کی جانے والی بستی مدینہ اور اُس کے والیٔ مکرم و معظم سے جُڑا ہوا ہے۔ گرامین بھاری شرحِ سود پر قرض دیتا ہے۔ ''اخوت'' کا ایمان ہے کہ قرض بہرصورت ''قرضِ حسنہ'' ہونا چاہئے۔ جتنی رقم ادا کی جائے اتنی ہی وصول کی جائے کہ اس میں کسی بھی طرح کا اضافہ، اس کی دانست میں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ گرامین کی جدوجہد کو اگر غربت کے خلاف جنگ کا نام دیا جائے تو اخوت کی کاوش جہاد کہلائے گی۔ فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ۔

''اخوت'' کا پروگرام جن کے دن بدلتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کرم ان کے دل بدل دیتا ہے۔ وہ ہنسی خوشی ''اخوت'' کی طاقت بن جاتے ہیں اور چراغ سے چراغ جل اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر امجد ثاقب اسی جذبہ اخوت کو بیدار

کر رہے ہیں جو پندرہ سوسال سے مسلمانوں کے خون میں تو موجود ہے لیکن غفلت کی لپیٹ میں ہے۔ان کا دائرہ مسلمانوں تک محدود نہیں۔وہ اس نبی ءرحمت کے پیروکار ہیں، جو رحمۃ اللعالمین ہیں۔سو''اخوت'' کی بانہیں ہر مذہب' رنگ' نسل اور علاقے کے پاکستانیوں کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔مسجدوں، مندروں' گرجا گھروں کے لئے ہوااور سورج کی کرنوں کی طرح اخوت کی روشنی بھی یکساں ہے۔شہر در شہر' بستی در بستی شاخیں کھلتی جارہی ہیں۔فرض شناس پاکستانی آگے بڑھ رہے ہیں۔عطیات دے رہے ہیں' جائیدادیں وقف کر رہے ہیں۔اہل اقتدار کو بھی تعاون کی سعادت نصیب ہو رہی ہے اور حزب اختلاف کی رونق بننے والے بھی اس طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔خالد مقبول،شہباز شریف اور عمران خان ایک ہی قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں......تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

ڈاکٹر امجد ثاقب اور''اخوت'' کی جسارت پر کچھ عالمی ادارے بھی چونک رہے ہیں۔یہ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے۔بلاسود قرض کا پروگرام۔چند ہزار روپے سے شروع ہو کر اس کا پھیلاؤ کئی ارب تک جا پہنچا ہے۔اس کا مطالعہ کرنے اور اسے سمجھنے کی جستجو کی جارہی ہے۔اسی تجسس نے کہ سود کے بغیر زر کا پھیلاؤ کس طرح ممکن ہے،ڈاکٹر امجد ثاقب کو دنیا کی بہترین یونیورسٹی ہارورڈ میں مدعو کیا۔یہ یونیورسٹی' ایک درس گاہ نہیں' ایک ریاست ہے۔اس کا بجٹ دنیا کے کئی درجن ممالک کے بجٹ سے زیادہ ہے۔اس کے وسائل اور سرمایے سے پاکستان جیسے کئی ممالک کی معیشتوں میں توانائی کی لہر دوڑائی جا سکتی ہے۔اس یونیورسٹی کی صورت گری میں مسیحی''مولویوں''(پادریوں) نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔اس نے امریکہ کو کئی صدر' مدبر' سیاستدان' سائنس دان اور قائدین عطا کئے اور آج بھی اس سے نسبت پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ہمارے''مولوی صاحبان'' کے قائم کردہ مدرسے اور دارالعلوم دیکھئے اور پھر ہارورڈ اور اُس جیسی دوسری یونیورسٹیوں کو دیکھئے' ایک لمحے میں راز کھل جائے گا کہ ہم یہاں کیوں ہیں اور اغیار وہاں کیوں ہیں؟

ڈاکٹر امجد ثاقب کو ہارورڈ یونیورسٹی کے لاء سکول اور بزنس سکول میں الگ الگ خطاب کی دعوت ملی تھی۔ایک جگہ موضوع اسلامی فنانس تھا تو دوسری جگہ مائیکروفنانس کے ادارے۔دونوں تقریبات کے درمیان دو ہفتوں کا فاصلہ تھا۔ڈاکٹر صاحب نے اس دوران ایک ہزار امریکی پاکستانیوں سے رابطے کا پروگرام بنالیا۔وہ کئی شہروں میں پہنچے،کئی تقریبات سے خطاب کیا اور''اخوت'' کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس سفر کی

کہانی انہوں نے خوب صورت نثر میں لکھی ہے یہ ایک منفرد سفر نامہ ہے، ایک سفر میں کئی سفر۔ ایک رنگ میں کئی رنگ۔

''اخوت کا سفر'' میں سب کچھ سمٹ آیا ہے' ماضی' حال اور مستقبل......گزشتہ بارہ سال نہیں' پندرہ سو سال کی کہانی اور آنے والے کئی سالوں کا منظر بھی۔ مدینہ سے لاہور' امریکہ اور پھر واپس لاہور سے مدینہ......مدینہ نقطہء آغاز بھی ہے اور نقطہء اختتام بھی......یہ سفر جہاں سے شروع ہوا، اسے بالآخر وہیں ختم ہونا ہے ہر گاؤں' ہر بستی، ہر شہر میں مدینتہ النبیؐ کا جذبہ اخوت بیدار ہوگا تو سود سے چھٹکارا ممکن ہو سکے گا۔ غربت ختم ہو سکے گی۔ ڈاکٹر امجد ثاقب کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں' ہم سب کو مقدور بھر ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ اس سفر کے وہ امام ہیں۔ آیئے ہم سب ان کے مقتدی بن جائیں......آیئے' بآواز بلند کہیں' پیچھے اس امام کے اللہ اکبر!!

مجیب الرحمٰن شامی